یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
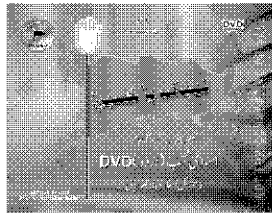
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

جلد نمبر ۳

تفسیر

انوار النجف فی اسرار المصحف

علامہ حسین بخش جاڑا

مکتبہ انوار النجف دریاخان ضلع بھکر

جلد سوم ۵

فہرست

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پارہ ۲ رکوع ۸	۷	سوال و جواب	۴۴	عورت کی ضرررسانی سے باز رہنے کا حکم	۷۳
آل محمد الواب اللہ ہیں	۸	رکوع ۱۱	۴۵	رکوع ۱۴	۷۵
حکمِ جہاد	۹	مرتد کی قسمیں اور احکام	۴۶	ناجائز رواج	۷۶
ہلاکت سے بچنے کا حکم	۱۱	شراب و جوئے کی حرمت کا بیان	۴۷	مطلقہ کا حق رضاع اور نان نفقہ	۷۷
حج کا بیان	۱۲	یتیموں کی اصلاح کا حکم	۵۰	عدّت وفات کا بیان	۸۲
کیفیت حج اور اس کے بعض مسائل	۱۴	یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم	۵۰	عدّت کے اندر پیغام نکاح کی ممانعت	۸۳
تمام اور کمال میں فرق	۲۳	مومن کا کافر سے رشتہ ناجائز ہے	۵۱	غیر مدخولہ عورت کی طلاق	۸۴
رکوع ۹ نکاتِ علمیہ	۲۴	رکوع ۱۲	۵۳	نماز وسطیٰ کی تاکید	۸۶
آیت مَنۡ یَشۡرِیۡ	۳۰	حیض کا بیان	〃	نماز وسطیٰ کی تاویل	۸۷
رجعت کا بیان	۳۱	ازدواجی زندگی کا حقیقی مفاد	۵۶	دعائے قنوت کا بیان	۹۰
رکوع ۱۰	۳۲	ایلاء کا بیان	۵۹	نماز خوف کا بیان	۹۱
بنی آدم کے اختلاف پر اصولی و عقلی بحث	۳۴	مطلقہ کی عدّت کا بیان	۶۰	طلاق شدہ عورتوں کے بعض احکام	۹۲
حقیقت انسان	۳۵	مرد و عورت کے حقوق	۶۱	نسوانی زندگی پر اسلام کے احسان	۹۳
وجوہِ اختلاف	۳۶	دورِ حاضر میں عورت کی آزادی کا تصوّر	۶۲	مسئلہ مساوات کی توضیح	۹۴
اختلاف کا علاج	۳۷	رکوع ۱۳	۶۵	سلسلہ نکاح	۹۷
وجہ اشتباہ	۳۷	طلاقِ عدّت و طلاق سنّت کا طریقہ	〃	تعدّد نکاح	۹۸
ضرورت دین	۳۸	طلاق کی شرائط	۶۶	مسئلہ عدل اسلامی	۹۹
مصلحتِ جہاد	۳۹	طلاق عقل کی روشنی میں	۶۸	عدّت کی مصلحت	۱۰۱
دینی اختلاف	۴۰	خلع و مبارات	۶۹	خلاصہ بحث	۱۰۲
ضرورتِ نبی	〃	خلع و مبارات کے صیغے	۷۰	اشتراکیت کا پس منظر	〃
آزمائش کی پیش کش	۴۲	نکتۂ لطیفہ (تین طلاقیں)	۷۱	موت کے بعد زندگی اور پھر موت	۱۰۸
دعوتِ جہاد	۴۳	طلاق بائن	۷۲	راہِ خدا میں خرچ	۱۱۰

مضمون	صفحہ
طالوت کا قصہ اور معیار انتخاب خداوندی	۱۱۲
تابوت بنی اسرائیل	۱۲۰
طالوت اور جالوت کی لڑائی	۱۲۲
حضرت داؤد کی شجاعت	۱۲۴
فلسفہ جذب و دفع	۱۲۶
پارہ ۳	
رکوع نمبر ۱	۱۳۲
رکوع نمبر ۲	
تفسیر آیت الکرسی	۱۳۵
آیت الکرسی کے خواص	۱۳۶
علمی نکتہ	۱۳۸
العروۃ الوثقیٰ کی تاویل	۱۳۹
رکوع ۳	۱۴۲
نمرود کا حضرت ابراہیم سے مناظرہ	
موت کے بعد زندگی	۱۴۵
بخت نصر کا قصہ	۱۴۶
انجام بخت نصر	۱۴۷
حضرت ارمیاء کی موت	۱۴۸
حضرت ابراہیمؑ کا پرندوں کو زندہ ہوتے دیکھنا	۱۵۱
ربط آیات و علمی نکات	۱۵۲
رکوع نمبر ۴	
خدا کی راہ میں خرچ کرنا	۱۵۴
رکوع نمبر ۵ پاکیزہ رزق	۱۶۰
اسلام اور سرمایہ داری	۱۶۵
رکوع ۶ ۔ سود کھانے کا گناہ اور	
چند مسائل	۱۶۹

مضمون	صفحہ
سود کھانے والے کا عذاب	۱۷۱
مقروض تنگدست کو مہلت دینا	۱۷۵
نقدی کی مصلحت	〃
رکوع نمبر	
قرضے کا بیان	۱۷۷
شب معراج کی باتیں	۱۸۲
سورۂ آل عمران	۱۸۷
اسم اعظم	۱۸۸
انوار علمیہ	۱۹۰
محکمات و متشابہات کا بیان	۱۹۱
راسخون فی العلم	
تاویل قرآن کا مطلب	
رکوع ۱۰	
جنگ بدر کی طرف اشارہ	
مقام توحید	
فضیلت اہل علم	
دین اسلام	
رکوع ۱۱	
انوار علمیہ	
جواز تکیہ	
رکوع ۱۲	
آیت اصطفاء	
حضرت مریمؑ کی ولادت	
نکات علمیہ	
حضرت ذکریاؑ کو حضرت یحییٰ کی بشارت	

مضمون	صفحہ
حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ سے مشابہت	
کلام ملکوتی اور وسوسۂ شیطانی میں فرق	
حضرت یحییٰ کا شکم مادر میں بولنا	
انتخاب مریمؑ	
جناب بتول معظمہ کی سیادت	
سوال و جواب	
بشارت عیسیٰ	
مسیح کی وجہ تسمیہ	
نبی اور رسول میں فرق	
حیات مسیح	
موت اور وفات میں فرق	
نصاریٰ نجران کے قول کی تردید	
تفسیر آیت مباہلہ	
واقعہ مباہلہ کے متعلق روایات	
رکوع ۱۵	
رکوع ۱۶	
عباد و عبید میں فرق	
کتاب و اہل کتاب	
تورات اور یہودیت	
نصرانیت اور انجیل	
میثاق انبیاء	

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

اور آپ سے دریافت کرتے ہیں پہلی رات کے چاندوں کے متعلق فرما دیجئے کہ یہ تعیین اوقات کا ذریعہ ہیں لوگوں کے لئے

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ

اور حج کے لئے اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں آؤ پیچھے سے لیکن نیکی اس

الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ

کی ہے جو تقویٰ کرے اور آؤ گھروں میں دروازوں سے اور اللہ سے ڈرو

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾

تاکہ فلاح پاؤ

تفسیر رکوع ۸

يَسْئَلُونَكَ :۔ اس کے شان نزول کے متعلق وارد ہے کہ معاذ بن جبل نے عرض کی۔ یارسول اللہ! یہودی لوگ ہم سے چاند کی بابت دریافت کرتے ہیں کہ یہ چھوٹا بڑا کیوں ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ یکساں حالت سے کیوں نہیں رہتا۔ تب یہ آیت اتری۔

قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ :۔ خداوند کریم نے چاند کی کمی اور زیادتی کی مصلحت کو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ اسی کمی وبیشی کی وجہ سے لوگوں کے وقتوں کی تعیین ہوتی ہے۔ روزوں کا زمانہ، افطار کا زمانہ، حج کا وقت، عورتوں کی عدت، حمل کا زمانہ اور دودھ پلانے کی میعاد وغیرہ۔ یہ سب باتیں اسی سے معلوم ہوتی ہے۔ اگر چاند ہمیشہ ایک حالت میں رہتا تو اس سے اوقات کی تعیین نہ کی جاسکتی۔ یعنی تمہارے سامنے علم ہیئت کی باریکیاں اور علم الافلاک کی گتھیاں سلجھانے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ تمہیں چاند کی زیادتی کے واقعی علل و اسباب پر اطلاع حاصل کرنا چنداں مفید ہے۔ البتہ اس کی مصلحتوں کا علم تمہارے لئے کسی حد تک فائدہ مند ہے اور وہ ہم بتائے دیتے ہیں۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ :۔ اس کے معنی میں کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) عرب لوگ احرام کے زمانے میں اپنے گھروں کے اندر دروازوں کے بجائے پیچھے کی طرف سے دیواروں میں نقب لگاکر آمد و رفت کرتے تھے بعض کہتے ہیں کہ قریش کا یہی دستور تھا۔ پس یہ آیت اتری کہ نیکی کا معیار یہ نہیں جسے تم نے سمجھا ہوا ہے بلکہ نیکی تقویٰ کا نام ہے۔

(۲) بیوت سے مراد امور ہیں اور معنی یہ ہے کہ ہر کام کو اُلٹے طریقے سے کرنا خوبی کی بات نہیں۔ بلکہ خوبی و اچھائی اس میں ہے کہ تمام امور کی بجا آوری صحیح طریقہ سے ہو۔

(۳) مراد یہ ہے کہ نا اہل سے اچھائی کی اُمید رکھنا اچھا نہیں۔ بلکہ معروف کی امید اہل معروف سے ہی ہونی چاہیئے۔

آلِ محمدؐ ابواب اللہ ہیں

وَآتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا : مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آلِ محمدؐ اللہ کے ابواب وسیلۂ جنت کی طرف بلانے والے اور قیامت تک رہبری کرنے والے ہیں۔

اور جناب رسالت مآب نے فرمایا۔ أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ وَلَا تُؤْتَى الْمَدِينَةُ إِلَّا مِنْ بَابِهَا۔ (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے اور شہر میں دروازہ ہی سے داخل ہوا جاتا ہے۔ اور بروایت ابوبصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اوصیاء ہی اللہ کے وہ دروازے ہیں۔ جن سے آنے کا حکم ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو اللہ کی معرفت نہ حاصل کی جاسکتی اور انہی کے ذریعہ سے خدا نے مخلوق پر حجّت تمام فرمائی ہے۔

اسود بن سعید سے مروی ہے کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس حاضر تھا میرے پوچھے بغیر آپ نے ارشادات عالیہ کو یوں زبان سے جاری فرمایا کہ نَحْنُ حُجَّةُ اللهِ وَبَابُ اللهِ وَنَحْنُ لِسَانُ اللهِ۔ وَنَحْنُ وَجْهُ اللهِ وَنَحْنُ عَيْنُ اللهِ وَنَحْنُ وُلَاةُ أَمْرِ اللهِ فِي عِبَادِهِ (ہم حجت اللہ، باب اللہ، لسان اللہ، وجہ اللہ اور عین اللہ ہیں اور ہم اللہ کے بندوں میں اولی الامر ہیں۔

احتجاج طبرسی سے منقول ہے۔ اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ابن کوا آیا۔ اور اس نے آنجناب سے اسی آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ وہ گھر ہم ہیں جن کے دروازوں سے آنے کا حکم ہے۔ ہم اللہ کا دروازہ ہیں اور وہ گھر ہیں جن میں آنے کا حکم ہے۔ پس جس نے ہماری بیعت کی اور ہماری ولایت کا اقرار کیا۔ پس وہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہوا۔ اور جس نے ہماری مخالفت کی اور غیر کو ہم پر ترجیح دی تو وہ گویا گھروں میں پشتوں سے داخل ہوا۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو آلِ محمدؐ کے پاس آیا۔ گویا وہ صاف چشمے پر وارد ہوا۔ جو اللہ کے علم کے ساتھ جاری ہے اور خداوند کریم نے آلِ محمدؐ کو اپنے دروازے قرار دیا اور انہی سے اس کی بارگاہ میں پہنچا جاسکتا ہے اور اس قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں۔ لیکن اختصار کے پیش نظر انہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تنبیہ :۔ آیت مجیدہ کے پہلے معانی اور اس معنی میں منافات نہیں سمجھنی چاہیئے کیونکہ وہ معانی تفسیر ظاہری کے لحاظ سے تھے اور یہ معنی تفسیر باطنی کے طور پر ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑیں اور تجاوز نہ کرو

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ

تحقیق اللہ کو پسند نہیں جو تجاوز کریں اور ان کو قتل کرو۔ جہاں ان کو پاؤ

وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ

اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا۔ اور فتنہ زیادہ سنگین جرم ہے

مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى

قتل سے اور نہ لڑو ان سے۔ مسجد الحرام کے پاس۔ یہاں تک

يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ

کہ وہ لڑیں تم سے اس میں۔ پس اگر وہ تم سے لڑیں تو تم ان کو قتل کرو۔ اسی

جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

طرح جزا ہے۔ کافروں کی

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : شانِ نزول کے متعلق تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب آنحضرتؐ بمعہ اپنے چودہ سو صحابہ کے عمرہ ادا کرنے کے لئے مقام حدیبیہ پر فروکش ہوئے تو مشرکین نے مکہ کے داخلے سے روک دیا۔ چنانچہ آپ نے قربانیوں کو وہاں نحر کر دیا اور مشرکین سے اس شرط پہ صلح ہوئی کہ اس سال واپس پلٹ جائیں اور اگلے سال تشریف لائیں اور یہ طے ہوا کہ مشرکین تین روز کے لئے وہاں سے نکل جائیں گے اور آنحضرت اپنے مناسک حسبِ منشاء ادا فرمائیں گے پس حضورؐ واپس مدینہ تشریف لائے اور اگلے سال عمرہ قضاء کے لئے بمعہ صحابہ تیار ہو کر روانہ ہوئے لیکن یہ ڈر تھا کہ کہیں مشرکین اپنے عہد کو توڑ کر رکاوٹ پیدا کر کے لڑائی نہ چھیڑ دیں۔ اور مہینہ کی حرمت کا خیال بھی ساتھ تھا۔ پس یہ آیتیں اتریں کہ جو لوگ تم سے لڑائی کی ابتداء کریں۔ ان سے بے شک لڑائی کرو۔ اور اس سے تجاوز نہ کرو۔ صلح حدیبیہ کی تفصیل تفسیر کی جلد ۱۳ ص ۶۱ تا ص ۶۶ اور ص ۷۲ تا ص ۷۶ ملاحظہ فرمائیں۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى

پس اگر باز آجائیں۔ تو تحقیق اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور ان سے لڑو یہاں تک

لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ

کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین (عام) ہو جائے پس اگر باز آجائیں تو نہیں جائز ہے

اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ

کوئی زیادتی بسگر ظالموں پر حُرمت والا مہینہ بدلے حرمت والے مہینے کے ہے اور حرمتیں ایک

قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى

دوسری کا بدلہ ہیں۔ پس جو زیادتی کرے تم پر، تو تم بھی زیادتی کر سکتے ہو اس پر جس قدر اس نے زیادتی کی ہو

عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

تم پر اور اللہ سے ڈرو اور یقین جانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا :- یعنی اگر وہ تائب ہو جائیں تو خدا ان کی سابقہ لغزشوں کو معاف فرما دے گا۔ اور اُن کی توبہ مقبول ہوگی۔

فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا :- اس آیت میں ظالمین کی باطنی تاویل حضرت امام حسینؑ کے قاتلین اور ان کی اولاد سے کی گئی ہے۔ چنانچہ تفسیر برہان میں اس مضمون کی متعدد روایات منقول ہیں۔

عبدالسلام بن صالح ہروی کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السّلام کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت قائم آلِ محمد علیہ السلام تشریف لائیں گے تو حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلین کی اولاد سے قصاص لیں گے اور ان کو قتل کریں گے۔ کیا یہ درست ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! دُرست ہے میں نے عرض کیا کہ خدا فرماتا ہے :-

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ کا پھر کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ خدا نے سچ فرمایا ہے۔ لیکن امام حسینؑ علیہ السلام کے قاتلوں کی اولاد اپنے باپ دادا کے فعل پر راضی ہے اور ان کے فعل پر فخر کرتے ہیں اور جو شخص کسی کے فعل پر راضی ہو۔ تو وہ بھی اسی جیسا مجرم ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص مشرق میں کسی کو قتل کرے اور مغرب میں رہنے والا شخص اس پر راضی ہو تو وہ بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ پس حضرت قائم آلِ محمدؑ اُن کو اس

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ بڑھاؤ اپنے ہاتھ طرف ہلاکت کے اور نیکی کرو

وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

تحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لئے قتل کریں گے کہ وہ اپنے باپ دادا کے فعل پر راضی ہوں گے۔

وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ :۔ اس کے معنی میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) قریش نے اس بات پر فخر کیا تھا کہ ہم نے رسول اللہؐ کو ماہ ذلیقعدہ میں بحالت احرام واپس کر دیا ہے۔ اور اُن کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ خداوند کریم نے اسی ماہ میں باذن قتال مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ یہ پہلے سال کا عوض اور حرمت والے مہینہ میں واپسی کا بدلہ حرمت والے مہینہ ہی کا داخلہ ہو جائے۔

(۲) حرمت حرمت کا بدلہ ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی حرمت والے مہینہ کا احترام نہ کرتے ہوئے خواہ مخواہ تمہیں چھیڑے تو تم بھی اس سے بے شک لڑو اور کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کو جیسے کا بدلہ تیسا اسی ماہ میں دے سکتے ہو۔

ہلاکت سے بچنے کا حکم

وَلَا تُلْقُوْا :۔ اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں :۔

(۱) بخل کرکے ہلاکت میں اپنے ہاتھ نہ ڈالو　(۲) حد سے زیادہ خرچ کرکے اپنے ہاتھ ہلاکت (بھوک) میں نہ ڈالو۔
(۳) گناہوں کے ارتکاب سے اپنے ہاتھ ہلاکت میں نہ ڈالو　(۴) بلا وجہ لڑائی چھیڑ کر ہلاکت میں نہ پڑو۔ بہرکیف تمام معانی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

سوال :۔ اس آیت کی رُو سے جس طرح جناب رسالتمآب نے حدیبیہ میں اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے صفین میں اور حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کر لی تھی تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے صلح کیوں نہ کر لی؟

جواب :۔ اسباب ظاہریہ اور حالات حاضرہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کو یقین تھا کہ عبید اللہ بن زیاد میرے قتل سے باز نہ آئے گا جس طرح کہ اُس نے حضرت امیر مسلم کو قتل کرا دیا تھا۔ پس ان حالات میں صلح کرنا ذلت کی موت خریدنے کے مترادف تھا اور صلح نہ کرنا عزت کی موت کو پسند کرنے کا نام تھا۔ پس آپؑ نے ذلت کی موت سے عزت کی موت کو ترجیح دی۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ

اور تمام کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پس اگر تم روک دیئے جاؤ (بوجہ بیماری یا دشمن کے) تو جو میسّر ہو قربانی کر دو

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا

اور نہ منڈواؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی اپنے مقام پر پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا

اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۟

اس کے سر میں تکلیف ہو (تو سر منڈوالے) اور فدیہ دے روزے یا صدقہ یا قربانی پس جب تم با امن ہو

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

تو جو شخص تمتع کرے ساتھ عمرہ کے طرف حج کے تو جو کچھ میسر آئے قربانی (کرے) لیکن جس کو نہ مل سکے

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ

تو روزے رکھے تین دن دوران حج میں اور سات روزے جب واپس آؤ یہ ہیں دس پورے یہ اس

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ

شخص کے لئے ہے جس کے اہل خانہ مسجد الحرام کے قریب نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو تحقیق اللہ

اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع

سخت سزا دینے والا ہے۔

حج کا بیان

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ :۔ یعنی اگر تم روک دیئے جاؤ تو قربانی کر لو۔ رکاوٹ دو قسم کی ہوا کرتی ہے۔

(۱) بیماری کی وجہ سے (۲) دشمن یا درندہ یا کسی ظالم و جابر کی وجہ سے

اصطلاح فقہا میں پہلی قسم کی رکاوٹ کو حصر کہتے ہیں اور دوسری قسم کو صد کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے اُحصِرتم جس کا معنی ہے کہ تم حصر کی وجہ سے رک جاؤ تو ایسا کرو لیکن یہاں پر مراد عام ہے یعنی رکاوٹ خواہ حصر (مرض کی وجہ) سے ہو یا

صد (خوف دشمن) کی وجہ سے ہو۔ ہر دو صورت میں قربانی کر کے احرام سے باہر آؤ۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ :- قربانی کے جانور تین ہیں (۱) اونٹ (۲) گائے (۳) بکری

ان میں سے حسب حیثیت جو بھی میسر ہو سکے اسی کی قربانی کر لے۔ اور احرام سے حلال ہو جائے۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ :- یعنی حصر یا صد کی صورت میں قربانی کرنے کے بعد سر منڈوائے اور احرام کھول دے۔ ورنہ جبتک احرام کی حالت باقی ہو اس وقت تک سر منڈوانا یا باقی حجامت کرانا ممنوع ہے اور اسی کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ سر منڈوانا جائز نہیں ہے جبتک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے تفصیل اس کی یہ ہے کہ احرام کی دو قسمیں ہیں (۱) احرام حج اور (۲) احرام عمرہ اور ہر دو صورتوں میں رکاوٹ یا حصر (بیماری) سے ہوگی یا صد (خوف دشمن وغیرہ) سے تو یہ کل چار صورتیں بنتی ہیں

(۱) پس اگر احرام حج کا ہو اور رکاوٹ کی وجہ بیماری ہو جس سے آگے نہ جا سکتا ہو تو اس صورت میں اپنی حسب حیثیت قربانی روانہ کر دے اور اس کے ذبح کا محل مقام منیٰ ہے۔ اور قربانی لے جانیوالے کے ساتھ وقت کی تعیین کر لے کہ دسویں ذوالحجہ کے دن فلاں وقت میں اس قربانی کو ذبح یا نحر کرنا ہے۔ پس یہ بیمار دسویں کے دن اس وقت تک انتظار کرے جس میں قربانی کے ذبح کا وعدہ کیا تھا اور جب وہ وقت آجائے تو یہ اپنے احرام کو کھول دے اور حجامت وغیرہ کرالے لیکن اس وقت سے پہلے نہ سر منڈوا سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا کام کر سکتا ہے جو احرام کے منافی ہو۔

(۲) اگر احرام حج کا ہو اور رکاوٹ دشمن وغیرہ کی وجہ سے ہوگئی ہو کہ آگے نہ جا سکے تو جس مقام پر اسے روکا گیا ہے وہیں قربانی کر کے احرام سے سبکدوش ہو جائے۔

(۳) اگر احرام عمرہ کا ہو اور رکاوٹ بیماری کی ہو تو قربانی مکہ میں بھیج دے اور تاریخ اور وقت مقرر کر لے کہ مثلاً فلاں روز فلاں وقت مکہ میں میری قربانی کو ذبح یا نحر کر دینا۔ پس یہ مریض اس وقت کی انتظار کرے اور وقت گذر جانے کے بعد اپنے آپ کو احرام سے آزاد سمجھے اور سر وغیرہ منڈوالے۔

(۴) اگر احرام عمرہ کا اور رکاوٹ دشمن کی وجہ سے ہو تو جس مقام پہ رکاوٹ لاحق ہوئی ہو۔ اسی مقام پر قربانی کر کے احرام کھول دے جسطرح کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پہ جناب رسالتمآبؐ نے مقام حدیبیہ پر اپنی قربانی ذبح کر لی اور صحابہ کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا۔

پس قرآن مجید کے اس حکم کا مطلب واضح ہوگیا کہ سر نہ منڈواؤ۔ جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حج کے احرام میں قربانی کا مقام منیٰ ہے اور عمرہ کے احرام میں قربانی کا مقام مکہ ہے۔ اور یہ دونوں صورتیں حصر (بیماری) کی وجہ سے رک جانے والے کے لئے ہیں۔ ورنہ صد (خوف دشمن) کی صورت میں حج کا احرام ہو یا عمرہ کا ہو۔ قربانی کا مقام وہی ہے جہاں صد واقع ہوا ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ :- اگر کوئی شخص بیماری یا سر میں جوؤں کے پڑ جانے کی وجہ سے سر منڈوانے کا محتاج ہو اور صبر

نہ کرسکتا ہو تو وہ اس صورت میں سر منڈوا سکتا ہے۔ لیکن اس پر کفارہ لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ یا تین دن روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ بعض روایات میں دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے اور یا ایک بکری ذبح کرے ان تینوں چیزوں میں سے اس کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ :۔ بیماری یا دشمن وغیرہ کا خوف نہ ہو اور حج کرنے والا صحیح اعمال حج کے بجالانے پر موفق ہو۔ تو حج تمتع کرنے والے پر ہدی (قربانی) واجب ہے اور اگر قربانی دستیاب نہ ہوسکے تو اس کے بدلہ میں اس پر دس روزے واجب ہیں۔ جن میں سے تین روزے وہیں ایام حج میں رکھنے پڑتے ہیں اور اُن کا پے درپے رکھنا ضروری ہے۔ مگر ایک صورت میں اور وہ یہ کہ آٹھویں اور نویں کو روزہ رکھا ہے اور دسویں کو رکھ نہیں سکتا۔ کیونکہ عید ہے تو یہ شخص تیسرا روزہ ایام تشریق کے گذر جانے کے بعد رکھ لے۔ اس صورت کے علاوہ ان روزوں میں اگر پے درپے ہونے کی شرط نہ پائی گئی تو باطل ہو جائیں گے۔ اور دس روزے سفر حج سے واپس آکر گھر پر رکھنے ضروری ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص گھر نہ پلٹے اور وہاں ٹھہر جائے تو پھر اتنے ایام صبر کرے جتنے گھر تک پہنچنے کے لئے درکار تھے اور اس کے بعد بقیہ روزے رکھ لے۔ یہ کل دس روزے ہیں۔ جو قربانی حج تمتع کا بدلہ ہیں۔

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ :۔ یہ حج تمتع ان لوگوں کا فریضہ ہے۔ جن کی اہل مسجد الحرام کے حاضرین سے نہ ہو حاضرین مسجد الحرام سے مراد ہے کہ مکہ سے اڑتالیس ۴۸ میل کے فاصلہ کے اندر ہوں۔ بعض علمائے کرام نے بارہ میل کا قول اختیار فرمایا ہے۔

کیفیت حج اور اُس کے بعض مسائل

حج کے اقسام

حج کی تین قسمیں ہیں حج تمتع، حج افراد، حج قرآن۔ ان ہر سہ قسموں میں سے حج تمتع افضل ہے جو لوگ مکہ یا اس کے ۴۸ میل کے فاصلہ کے اندر رہتے ہیں ان کا فریضہ حج افراد یا حج قران ہوتا ہے اور جو لوگ مکہ سے ۴۸ میل سے زیادہ فاصلہ پر آباد ہوں۔ ان کا فریضہ حج تمتع ہے۔ جس طرح قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ یہ حج (تمتع) ان لوگوں کا فریضہ ہے جن کی اہل مسجد الحرام کے حاضرین سے نہ ہو۔ حج تمتع میں پہلے عمرہ بجالانا پڑتا ہے اور یہ عمرہ عُمرۂ تمتع کہلاتا ہے اور حج افراد اور حج قران میں صرف حج کے اعمال کو بجالانا پڑتا ہے اور اس کے بعد عمرہ علیحدہ کیا جاتا ہے اور اس کو عُمرۂ مفردہ کہتے ہیں۔

عُمرہ :۔ عُمرہ کے واجبات یہ ہیں۔ احرام۔ طواف۔ دو رکعت طواف۔ سعی۔ تقصیر۔

احرام :۔ حاجی کے لئے میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے۔

میقات :۔ اس مقام مخصوص کو کہا جاتا ہے جہاں سے احرام باندھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

میقات کل چھ ہیں۔

(۱) جحفہ :۔ شام کے راستہ سے حج کو جانے والوں کے لئے یہی میقات ہے۔

(۲) مسجد شجرہ :۔ مدینہ کے رستہ سے حج کرنے والوں کا میقات ہے اگر حاجی یہاں سے احرام نہ باندھ سکے۔ تو مقام جحفہ سے احرام باندھ سکتا ہے۔

(۳) وادیٔ عتیق :۔ عراق کے راستہ سے حج کرنے کا میقات ہے۔

(۴) طائف والوں کے لئے قرن المنازل (۵) یمن والوں کے لئے یلملم ہے۔

(۶) جس شخص کا گھر ان مقررہ میقاتوں کی بہ نسبت مکہ کے زیادہ قریب ہو تو اس کا میقات اپنا گھر ہے یعنی وہ وہاں سے احرام باندھ لے۔

مسئلہ :۔ اگر کوئی شخص ایسے راستے سے حج کو جائے کہ کسی میقات سے نہ گذرتا ہو تو وہ شخص جب ان میقاتوں میں سے کسی ایک کی محاذات (برابری) میں پہنچے تو احرام باندھ لے۔

مسئلہ :۔ جنب، حیض، نفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔

مسئلہ :۔ اگر بھول کر بغیر احرام باندھنے کے میقات سے آگے گذر جائے تو اس پر واجب ہے کہ واپس آکر میقات سے احرام باندھ کر جائے۔ ہاں اگر واپسی ناممکن ہو تو جس مقام پر یاد آیا ہے وہیں سے احرام باندھ کر آگے چلے۔

مسئلہ :۔ احرام کے لئے تین چیزیں واجب ہیں۔ احرام کے کپڑوں کا پہننا، نیت اور لبیک کہنا۔

مسئلہ :۔ احرام کے کپڑے دو سوتی سفید چادریں ہوتی ہیں۔ ایک زیر ناف سے پاؤں تک ڈھانپنے کے لئے اور دوسری کندھوں پر اوڑھنے کے لئے۔

مسئلہ :۔ احرام کی چادروں کا کپڑا ایسا باریک نہیں ہونا چاہیئے کہ نظر اس سے پار ہو کر چمڑے تک پہنچ سکے۔

مسئلہ :۔ مستحب ہے کہ پہلے حجامت کروالے اور جسم سے بالوں کو صاف کر دے اور پھر غسل کر کے احرام باندھے

مسئلہ :۔ نماز ظہر کے بعد احرام باندھنا بہتر ہے۔ ورنہ کسی فریضہ نماز کے بعد باندھے۔ اور اگر ایسا کرنا ناممکن ہو تو پھر چھ رکعت نماز نافلہ احرام پڑھ کر بعد میں احرام باندھے اور یہ بھی نہیں تو کم از کم دو رکعت نافلہ پڑھ کر احرام باندھے۔

مسئلہ :۔ غسل کرنے اور احرام باندھنے کے وقت منقولہ دعاؤں کا پڑھنا اللہ کی حمد و ثنا اور درود پڑھنا باعثِ ثواب ہے۔

مسئلہ :۔ احرام کے کپڑے پہن لینے کے بعد نیت کرے کہ عمرہ تمتع کے لئے میں نے قربۃً الی اللہ احرام باندھا ہے اور اس نیت کے بعد فوراً اپنی زبان پر کلمات لبیک کو جاری کرے اور کہے :۔

لَبَّیْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ ۔

مسئلہ :۔ لبیک کہتے ہوئے مکّہ کو جائے اور مکہ کے مکانات جب دکھائی دینے لگیں تو لبیک کہنا ختم کر دے ۔

مسئلہ :۔ حالتِ احرام میں مندرجہ ذیل چیزوں سے بچنا چاہیئے ۔

(۱) جنگلی جانور کا شکار ۔ خود کرنا ۔ کسی کو حکم دینا ۔ مشورہ دینا ۔ اشارہ کرنا اور ذبح کرنا وغیرہ محرم کے لئے سب حرام ہیں اور محرم کا ذبح شدہ شکار مردار کی طرح حرام ہوا کرتا ہے ۔ اس کا کھانا ہر ایک پر حرام ہے ۔

(۲) **عورت** :۔ عورت سے ہمبستری کرنا ، بوس وکنار کرنا یا بنظر شہوت اس پر نظر کرنا حرام ہے ۔

مسئلہ :۔ اگر کوئی شخص حالتِ احرام عمرہ میں سعی کرنے سے پہلے اپنی عورت سے ہمبستری کرے تو اس پر ایک کفارہ واجب ہے اور اس سال اس کی حج بھی فاسد ہے ۔ لہٰذا اس پر واجب ہے کہ یہ حج بھی پوری کرے اور آئندہ سال اس کی قضا بھی کرے ۔

مسئلہ :۔ اگر احرام حج میں وقوفِ مشعر سے پہلے عورت کے ساتھ ہمبستر ہو جائے تو حج بھی فاسد اور اونٹ کا کفارہ بھی واجب ہے ۔ لیکن اس سال اس حج فاسد کو پورا کرنا واجب ہے اور اگلے سال اس کی قضا بھی ضروری ہے ۔

مسئلہ :۔ عورت کے ساتھ بوس وکنار سے بھی اونٹ کا کفارہ واجب ہے اور نظرِ شہوت کرنے سے اگر خروج منی ہو جائے تب بھی واجب ہے کہ اونٹ کفارہ دے ۔

(۳) عورت سے نکاح کرنا ۔ یا کسی اور کا نکاح پڑھنا محرم پر حرام ہے بلکہ خواستگاری کرنے اور کسی کے نکاح میں شریک ہونے اور گواہ بننے اور گواہی دینے سے بھی پرہیز کرے ۔

(۴) استمنا ۔ یعنی مشت زنی یا اسی قسم کے کسی کرتوت سے منی کا خارج کرنا ۔

(۵) خوشبو ، مشک زعفران وغیرہ کا سونگھنا ، بدن پر ملنا اور کھانا وغیرہ (اس کا کفارہ ایک گوسفند ہے)

(۶) سیا ہوا لباس ۔ یا وہ جو مثل سیئے ہوئے کے ہو جس طرح نمدہ وغیرہ

(۷) بقصدِ زینت سیاہ سُرمہ لگانا ۔

(۸) آئینہ دیکھنا ۔

(۹) جراب یا موزہ یا جوتا وغیرہ جو پاؤں کے ظاہر حصّہ کو ڈھانپ لیں ۔ البتہ نعل عربی میں کوئی حرج نہیں ۔

(۱۰) جھوٹ بولنا ۔

(۱۱) قسم کھانا ۔ مثلاً لَا وَاللہ ۔ بلٰے واللہ کہنا ۔

مسئلہ :۔ جھوٹی قسم کا کفارہ پہلی بار ایک گوسفند ۔ دوسری بار ایک گائے ۔ اور تیسری دفعہ ایک اُونٹ ہے ۔

اور سچّی قسم کے لئے پہلی دو دفعہ صرف توبہ استغفار ہی کافی ہے اور تیسری بار اگر کرے تو ایک گوسفند کفارہ ہے۔

(۱۲) مچھر، جوں، اور کھٹمل وغیرہ کا مارنا۔ بلکہ ایک حصّہ جسم سے دوسرے غیر محفوظ حصّہ پہ اس کا منتقل کرنا بھی خلافِ احتیاط ہے۔

(۱۳) مہندی لگانا، زینت کے لئے بلکہ احرام سے پہلے مہندی لگانا بھی ٹھیک نہیں اگر اس کا اثر احرام کے بعد تک رہنے والا ہو۔

(۱۴) عورت کا حالتِ احرام میں زینت کے لئے زیورات کا استعمال کرنا۔

(۱۵) تیل یا گھی یا دیگر روغنی چیزوں کا ملنا اگرچہ خوشبودار نہ بھی ہو۔

(۱۶) اپنے بدن سے یا کسی دوسرے محرم کے بدن سے بال دُور کرنا۔

مسئلہ:۔ اگر کسی کی آنکھ میں بال پیدا ہو جائے تو اس کو دُور کرنا جائز ہے اسی طرح وضو یا غسل وغیرہ سے اگر کوئی بال جُدا ہو جائے تو حرج نہیں۔ نیز سر دردی وغیرہ کی وجہ سے اگر سر منڈوالیا جائے تو بھی گناہ نہیں۔

مسئلہ:۔ جسم سے بال دُور کرنے کا کفارہ ایک گوسفند ہے اگر مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔ تو تین روزے یا دس مُد کفارہ دے۔

مسئلہ:۔ سر یا داڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے اگر کوئی بال گر جائے تو ایک مٹھی گندم صدقہ دے۔

(۱۷) مرد کا سر کو ڈھانپنا حالتِ احرام میں حرام ہے اور اس کا کفارہ ایک گوسفند ہے۔

(۱۸) عورت کا حالتِ احرام میں منہ کو ڈھانپنا اور اس کا کفارہ بھی ایک گوسفند ہے۔

(۱۹) مرد کا حالتِ احرام میں اپنے سر پہ سایہ کرنا۔

مسئلہ:۔ اگر کسی بیماری یا کمزوری یا کسی تکلیف کی وجہ سے سایہ میں بیٹھنا ضروری ہو جائے تو اس صورت میں سایہ کے نیچے بیٹھ سکتا ہے۔ لیکن ایک گوسفند کفارہ دینا ہوگا۔ حج اس کی صحیح ہوگی۔

(۲۰) اپنے بدن سے خون نکالنا۔ اور اس کا کفارہ ایک گوسفند ہے۔

(۲۱) ناخن لینا۔ ایک ناخن کا کفارہ ایک مُد ہے۔ اور پورے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن اتارنے سے ایک گوسفند کفارہ دینا ہوگا۔

(۲۲) دانت نکلوانا۔ اس کا کفارہ بھی ایک گوسفند ہے۔

(۲۳) حرم کے درخت یا گھاس وغیرہ کاٹنا۔ درخت کاٹنے کا کفارہ ایک گوسفند ہے۔

طواف عمرہ تمتع کا احرام باندھنے کے بعد جب مکہ میں داخل ہو تو مکہ میں داخلے کے لئے غسل مستحب کرے اور پھر مسجد الحرام کے داخلے کے لئے ایک اور غسل مستحب کرلے اور طواف واجب کرے (۱) طواف بیت اللہ

کے گرد سات چکر پھرنے کا نام ہے۔ طواف میں طہارتِ جسم (حدث اور خبث سے) اور طہارتِ لباس اور اس کا مباح ہونا ضروری ہے۔ مرد کا بغیر ختنہ کے طواف باطل ہوتا ہے طواف کرنے سے پہلے نیت یہ کرے کہ عمرۂ تمتع کا طواف قربتہً الی اللہ بجا لاتا ہوں۔ اور نیت کا دل میں ہونا ضروری ہے۔ اس کا زبان پر جاری کرنا لازم نہیں۔

طواف کا طریقہ یہ ہے کہ نیت کرکے حجرِ اسود سے طواف شروع کرے اس لحاظ سے اس کا ہر چکر حجرِ اسود تک پورا ہوگا۔ اور یہ خیال رہے کہ حالتِ طواف میں اس کا بایاں کندھا بیت اللہ کے سامنے رہے۔ لہٰذا ہر کونہ سے موڑ کاٹتے ہوئے اپنے جسم کو ترچھا رکھ کر اپنے کندھے کو کعبہ کی سیدھ سے ہٹنے نہ دے۔ اسی طرح اگر اثناء طواف بیت اللہ کو بوسہ دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ تو یہ خیال رکھے کہ اپنا کندھا کعبہ کی سیدھ میں رہے۔ ورنہ اگر غفلت ہوجائے اور کندھا بیت اللہ کی سیدھ سے ہٹ جائے اور اسی حالت میں طواف کا کچھ حصہ گذر جائے تو ملتفت ہونے کے بعد اس پر واجب ہے کہ اسی مقام سے طواف کو دوبارہ شروع کرے جہاں سے یہ بے اعتدالی واقع ہوئی تھی۔ اور پھر طواف کو صحیح طریقہ سے ادا کرے۔

مسئلہ:۔ طواف میں ضروری ہے کہ ایک طواف کے لئے سات چکر پورے کرے اگر سات چکروں سے عمداً کم یا زیادہ کرے گا تو طواف باطل ہوگا۔

مسئلہ:۔ حالتِ طواف میں زبان کو ذکرِ خدا سے تر رکھے۔ بے ہودہ باتیں نہ کرے۔ نیز منقول دعاؤں کا پڑھنا مستحب ہے۔

نمازِ طواف

طواف کے بعد دو رکعت نمازِ طواف پڑھنی چاہیئے۔ طواف واجب کے لئے نمازِ طواف واجب اور طوافِ مستحب کے لئے مستحب ہے۔ طواف کے فوراً بعد مقامِ ابراہیم پر جاکر دو رکعت نمازِ طواف ادا کرے۔ مقامِ ابراہیم سے مراد وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں مبارک کا نشان باقی ہے اگر لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے وہاں جگہ نہ مل سکے تو اس کے قریب دائیں یا بائیں جانب دو رکعت نمازِ طواف ادا کرے۔

مسئلہ:۔ دو رکعت نمازِ طواف میں مستحب ہے کہ پہلی رکعت میں حمد کے بعد سورۂ قل ہو اللہ احد اور دوسری رکعت میں حمد کے بعد قل یا ایہا الکافرون پڑھے اور اس کے بعد اپنے گناہوں سے توبہ کرکے اللہ سے معافی طلب کرے۔

سعی صفا و مروہ کے درمیان = دو رکعت نمازِ طواف سے فارغ ہوکر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے۔ سعی کو کوہِ صفا سے شروع کرے اور کوہِ مروہ پر ختم کرے۔ شروع کرتے وقت کوہِ مروہ کے کچھ حصہ کے اوپر چڑھ جائے۔ سعی کے بھی سات چکر واجب ہیں۔ لیکن صفا سے مروہ تک جانا ایک چکر اور واپس صفا تک آنا دوسرا چکر شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا ساتواں چکر کوہ مروہ پر ہی ختم ہوگا۔ سعی کو شروع کرنے سے پہلے نیت کر لینا ضروری ہے۔ لیکن طہارت بدن و لباس اس میں شرط نہیں ہے۔ سعی کرنا حج کا رکن ہے۔

تقصیر

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر لینے کے بعد تقصیر کی نیت کر کے سر کے بال تھوڑے سے کٹوا لے اور اسی کا نام تقصیر ہے لیکن سر منڈوانا اس مقام پر حرام ہے۔ اب احرام میں جتنی چیزیں اس پر حرام تھیں۔ وہ سب حلال ہو گئیں یہ تھا عمرۂ تمتع جس کے اعمال کی بجا آوری ہو گئی۔ اس کے بعد مکہ میں ٹھیرا رہے پھر جب حج کے احرام کا وقت آئے گا۔ تو مکہ سے دوسرا احرام باندھ کر عرفات و منیٰ کی طرف جائے اور وہاں حج کے اعمال بجالائے۔

افعالِ حج

حج کے واجب افعال چودہ ہیں :۔

(۱) احرام (۲) وقوفِ عرفات (۳) وقوفِ مشعر (۴) افاضہ (۵) رمی جمرۂ عقبہ (۶) نحر یا ذبح (۷) سر منڈوانا (۸) مکہ میں آکر طوافِ زیارت (۹) دو رکعت نماز طواف (۱۰) سعی درمیان صفا و مروہ (۱۱) طوافِ نساء (۱۲) دو رکعت نماز طواف (۱۳) مبیتِ منیٰ (۱۴) رمی جمارِ ثلاث۔

احرامِ حج

احرام باندھنے کا طریقہ۔ کپڑے۔ نیت وغیرہ وہی ہیں جو پہلے بیان ہو چکے ہیں اور جو چیزیں احرام کی حالت میں حرام ہو جاتی ہیں ان کا بیان گذر چکا ہے۔

مسئلہ :۔ حج کا احرام مکہ معظمہ کے جس مقام سے باندھے جائز ہے لیکن مسجد الحرام میں مقامِ ابراہیم سے باندھنا افضل ہے

مسئلہ :۔ احرام حج ایسے وقت میں باندھے کہ نویں ذوالحجہ کو وقوفِ عرفات کے لئے وہاں پہنچ سکے اور بہتر یہ ہے کہ آٹھویں ذوالحجہ کو احرام باندھ کر روانہ ہو جائے اور رات کو مقامِ منیٰ میں رہے اور نویں کے روز وہاں سے روانہ ہو کر عرفات کے مقام پر جائے۔ اور احرام باندھ کر لبیک کے کلماتِ گذشتہ کو زبان پر جاری کرے۔ اور جب مقام ابطح پر پہنچے تو باآواز بلند لبیک پڑھے۔

وقوفِ عرفات

نویں ذوالحجہ کو زوال سے لے کر غروبِ شمس تک عرفات میں ٹھیرنے کا نام وقوفِ عرفات ہے اور یہ حج کا رکن ہے اس کے فوت ہونے سے حج فوت ہو جاتی ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقیہہ میں موجود ہے

مسئلہ :۔ عرفات میں ظہر سے مغرب تک ٹھیرنا واجب ہے خواہ وہاں کھڑا رہے یا بیٹھا رہے یا چلتا رہے۔

مسئلہ :۔ وقوف کی نیت کرے کہ وقوفِ عرفات حج تمتع کے لئے کرتا ہوں۔ قربۃً الی اللہ

مسئلہ :۔ وقوفِ عرفات غروبِ آفتاب تک ہے اگر کوئی شخص غروب سے پہلے عرفات سے باہر نکل جائے تو اس پر واپس پلٹ کر غروب تک وقوف کرنا واجب ہے ورنہ اس کا کفارہ ایک اونٹ ہے اور اگر یہ ناممکن ہے۔ تو اٹھارہ روزے پے در پے رکھے۔

مسئلہ :۔ اگر بصورتِ سہو قبل از غروب عرفات سے چلا جائے اور غروب تک ملتفت نہ ہو یا جہالتِ مسئلہ کی صورت میں ایسا کرے اور بغروب تک اس کو مسئلہ کا علم نہ ہو سکے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ لیکن اگر بروقت اس کو علم ہو جائے۔

تو واپس اگر غروب تک وقوف کرنا واجب ہے اور بصورتِ مخالفت کفارہ لازم ہے۔

مسئلہ:۔ اگر حکومتِ وقت کے قاضی نے چاند کے ثبوت کا حکم دے دیا ہو لیکن مذہب شیعہ کی رُو سے شرعاً چاند اس تاریخ پر ثابت نہ ہو اور تقیہ حکومتِ وقت کے قاضی کے حکم کے موافق عمل کرنے کا مقتضی ہو تو ایسی صورت میں انشاءاللہ فریضۂ حج ادا ہو جائے گا۔

مسئلہ:۔ وقوفِ عرفات سے پہلے غسل کرنا مستحب ہے اوّل وقت میں اذان کے بعد نمازِ ظہر و عصر کو پڑھے اور اس مقام پر تمام مذاہب اسلامیہ بلا اختلاف جمع بین الصلوٰتین پر عمل کرتے ہیں جس میں مذہب شیعہ کی صداقت کی پُرزور عملی تائید ہے۔ پس چاہیئے کہ نہایت دل جمعی سے باطہارت وہاں غروب تک کھڑے ہو کر اور ایسا نہ کر سکے تو قبلہ رُخ بیٹھ کر تا غروب ذکرِ خدا میں مشغول رہے۔ اللہ اکبر ایک سو بار۔ الحمد للہ ایک سو بار۔ سبحان اللہ ایک سو مرتبہ، لا الٰہ الا اللہ ایک سو دفعہ، آیۃ الکرسی ایک سو دفعہ، دُرود شریف ایک سو دفعہ، سورہ اِنَّآ اَنْزَلْنَا ایک سو مرتبہ، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ایک سو دفعہ اور سورہ توحید ایک سو دفعہ پڑھنا مستحب ہے۔ اپنے گناہوں کو اپنے سامنے رکھ کر اللہ سے ان کی معافی مانگے اپنے والدین و قریبیوں و دیگر برادرانِ ایمانی کے لئے دُعا طلب کرے۔ کیونکہ جو شخص غائبانہ طور پر اپنے مومن بھائیوں کے لئے دعا کرتا ہے تو فرشتے اس کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ مقامِ عرفات گناہ معاف کرانے کے لئے بہترین مقام ہے اور بدبخت انسان ہے وہ جو مقامِ عرفات سے واپس آئے اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب نہ کر سکے روایت میں ہے کہ ماہِ رمضان میں جس کے گناہوں کی بخشش نہیں ہو سکتی تو اس کی بخشش ہو ہی سکتی۔ مگر یہ کہ عرفات جانے پر موفق ہو اور وہاں اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرے۔

اس مقام پر آئمہ معصومین علیہم السلام سے جو دعائیں منقول ہیں۔ ان کو پڑھنا مستحب ہے۔

اِفاضہ:۔ غروبِ شمس کے بعد عرفات سے مشعر کی طرف روانگی کا نام افاضہ ہے۔

وقوفِ مشعر غروبِ شمس کے بعد عرفات سے روانہ ہو کر مشعر الحرام میں پہنچے اور وہاں اذان کے بعد دونو نمازیں مغرب و عشا بجا لائے۔ اس مقام پر بھی تمام مسلمان مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھتے ہیں وقوفِ مشعر سے پہلے غسل مستحب ہے اس مقام پر منقولہ دعائیں پڑھے اور اپنے گناہوں کی اللہ سے مغفرت طلب کرے اور حمد و ثنا پروردگار سے اپنی زبان معطر رکھے۔ نیت کرے کہ وقوفِ مشعر کرتا ہوں۔ حج تمتع کے لئے قربۃً الی اللہ طلوعِ صبح صادق سے لے کر طلوعِ شمس تک وقوف کرنا لازم ہے۔ البتہ عورتیں اور ضعیف مرد اور بیمار لوگ جن کو طلوعِ شمس کے بعد روانہ ہونے میں لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے تکلیف کا خطرہ ہو تو وہ طلوعِ صبح سے پہلے بھی منیٰ کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ خوف نہ ہو تو پھر طلوعِ شمس کے بعد روانہ ہونا چاہیئے۔

مِنیٰ کے اعمال طلوعِ شمس کے بعد مشعر الحرام سے روانہ ہو اور اگر اس سے پہلے روانہ ہو جائے تو وادیٔ

محسر کو طلوعِ شمس سے پہلے عبور نہ کرے اور یہاں سے تین جمروں کو مارنے کے لئے ستر سنگریزے چُن لے اگر دو چار زیادہ اٹھالے تو بہتر ہے۔ منٰی کے اعمال تین ہیں۔

(۱) رمی جمرۂ عقبہ (۲) قربانی (۳) حلق

رمی جمرۂ عقبہ منٰی میں پہنچ کر پہلے پہل جمرۂ عقبہ کو نیّت کر کے سنگریزے مارے۔ سنگریزوں میں شرط ہے کہ پہلے استعمال شدہ نہ ہوں اور بہتر ہے کہ رنگ برنگے ہوں اور حذف کے طریقہ سے مارے یعنی انگشتِ شہادت کے ناخن اور انگوٹھے کے درمیان رکھ کر کم از کم سات ذراع کے فاصلہ سے جمرہ کی طرف منہ اور قبلہ کی طرف پشت کر کے پاپیادہ باوضو یکے بعد دیگرے مارے اور مارتے وقت منقول دعا بھی پڑھے۔

قربانی حج تمتع کرنے والے پر واجب ہے کہ جمرۂ عقبہ کو سنگریزے مار چکنے کے بعد حسبِ حیثیت اونٹ یا گائے یا بکری وغیرہ کی قربانی کرے اور ہر شخص کو جدا جدا قربانی کرنی چاہیئے۔

مسئلہ:۔ قربانی کے جانور کی عمر یہ ہوں۔ بھیڑ یا دنبی کی عمر سات ماہ سے زائد ہو اور گائے بکری وغیرہ دوسرے سال میں داخل ہو۔ اونٹ چھٹے سال میں داخل ہو۔

مسئلہ:۔ قربانی کا جانور دُبلا بیمار، عیب دار نہ ہو۔ لہٰذا اندھے، کانے، لنگڑے، کن کٹے، بیمار اور دُبلے جانور کی قربانی ناکافی ہے۔ قربانی کا جانور خصی بھی نہیں ہونا چاہئیے۔

مسئلہ:۔ قربانی کے گوشت میں سے کچھ صدقہ دے۔ اور کچھ مومنین کو ہدیہ دے اور ہدیہ یا صدقہ کو ایک تہائی سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔

مسئلہ:۔ قربانی کے وقت یہ دعا مستحب ہے۔

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ۔

اگر قربانی کرنے والا خود ذبح کا طریقہ نہ جانتا ہو تو ذبح کرنے والے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے اور دعائے مذکور پڑھے :۔

مسئلہ:۔ اونٹ نحر کئے بغیر حلال نہیں ہوتا۔ اور دوسرے جانور ذبح سے حلال کئے جاتے ہیں۔

حلق یا تقصیر قربانی کر چکنے کے بعد سر منڈوانا چاہیئے یا تقصیر کرنی چاہیئے۔ یعنی مونچھوں یا سر کے بالوں میں سے کچھ بال کٹوالے یا ناخن اُتروالے۔ اگر پہلی دفعہ کا حاجی ہے تو اس کے لئے حلق (سر منڈوانا)

افضل ہے۔ عورتوں پر حلق نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لئے تقصیر ہے۔
حلق کے وقت قبلہ رُخ بیٹھے اور یہ دعا پڑھے :- اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِىْ بِكُلِّ شَعْرَةٍ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ
مسئلہ :- حلق یا تقصیر کے بعد احرام کی وجہ سے جتنی چیزیں حرام ہوئی تھیں۔ صرف خوشبو۔ بیوی اور شکار کے علاوہ سب حلال ہو جائیں گی۔

طوافِ زیارت منیٰ کے اعمال سے فارغ ہونے کے بعد مکہ معظمہ کا رُخ کرے اور طوافِ زیارت بجالائے طواف کے لئے غسل مستحب ہے۔ باقی شرائط و طریقہ وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ صرف نیت یہ کرے گا کہ حج تمتع کے لئے طوافِ زیارت کرتا ہوں۔ قربۃً الی اللہ۔

دو رکعت نمازِ طواف :- طواف سے فارغ ہو کر دو رکعت نماز طواف مقام ابراہیم پر پڑھے جس طرح مذکور ہو چکا ہے۔

سعی :- طواف و نماز طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے جیسا کہ عمرہ کے بیان میں گذر چکا ہے۔

مسئلہ :- سعی کے بعد اس پر خوشبو لگانا حلال ہو جائے گا۔

طوافِ نساء سعی کے بعد بیت اللہ کا طواف کرے اور اس کو طواف النساء کہا جاتا ہے۔ نیت یہ کرے کہ طوافِ نساء کرتا ہوں یا کرتی ہوں حج تمتع کے لئے قربۃً الی اللہ۔ اور طواف کے بعد دو رکعت نمازِ طواف مقام ابراہیم پر پڑھے۔

مسئلہ :- طوافِ نساء کرنے سے عورت اور شکار بھی حلال ہو جائیں گے۔ اگر طواف نساء کو ترک کیا جائے تو عورت کے لئے مرد اور مرد کے لئے عورت حرام رہے گی۔ جب تک کہ یہ طواف نہ کیا جائے اور شیعہ حاجیوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔

مبیتِ منیٰ اعمالِ منیٰ سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ میں جا کر طوافِ زیارت اور سعی اور طوافِ نساء وغیرہ کے اعمال بجالائے اور اس کے بعد واپس مقام منیٰ پر آجائے اور نیت قربۃً الی اللہ کر کے ۱۱ر ذوالحجہ، ۱۲ر ذوالحجہ کی دو راتیں یہاں ٹھہرے۔

مسئلہ :- اگر جان بوجھ کر یہ راتیں مقام منیٰ میں نہ رہے تو ایک گوسفند فی شب قربانی دینا اس کا کفارہ ہے۔
مسئلہ :- جو شخص حالتِ احرام میں شکار اور بیوی سے بچ چکا ہے اس پر تیرھویں کی رات منیٰ پر رہنا ضروری نہیں پس ۱۲ر ذوالحجہ کو بعد از ظہر منیٰ سے جا سکتا ہے اور اگر ۱۲ر ذوالحجہ کے دن منیٰ میں غروب ہو جائے تو پھر ۱۳ر ذوالحجہ کی رات کا وہاں مقام منیٰ میں ٹھہرنا ضروری ہے۔

رمیِ جمار ۱۱ر ۱۲ر ذوالحجہ کو تینوں جمروں کو نیت قربت سے سنگریزے مارے۔ پہلے جمرۂ اُولیٰ پھر جمرۂ وسطیٰ اور پھر جمرۂ عقبیٰ کو سات سات سنگریزے مارے اور ترتیب یہی رکھے۔ اور عمداً اس کی خلاف ورزی نہ کرے

اگر ۱۳ر کی شب منیٰ میں ہو تو ۱۳ر کے دن بھی تینوں جمروں کو اسی ترتیب سے سنگریزے مارے اور اگر ۱۲ر کی ظہر کے بعد وہاں سے روانہ ہو جائے تو باقی ماندہ سنگریزوں کو دفن کردے۔

مسئلہ:۔ مقام منیٰ میں رہائش کے دوران میں نماز ہائے واجبہ و مستحبہ کو مسجد خیف میں ادا کرنا مستحب ہے روایت میں ہے کہ وہاں ایک سو رکعت نماز نافلہ پڑھنا ستر برس کی عبادت کے برابر ہے۔

طواف وداع

ان اعمال سے فارغ ہو کر مستحب ہے کہ پھر مکہ معظمہ میں داخل ہو اور طواف وداع کرے۔ اور زیادہ سے زیادہ طواف کرنے کی کوشش کرے اور ۳۶۰ طواف کرنا مستحب ہے اور اگر یہ نہ کر سکے تو ۳۶۰ چکر مستحب ہیں۔ بیت اللہ میں طواف کرنا نافلہ پڑھنے سے افضل ہے۔ وہاں اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ والدین، قریبیوں اور دیگر مومن بھائیوں کے لئے دعا طلب کرے۔ کعبہ کے اندر داخل ہو کر ذکر خدا بجالائے۔

مسئلہ:۔ ہر طواف میں خواہ واجب ہو خواہ مستحب حجر اسود کو بوسہ دینا مستحب ہے اگر بھیڑ و اژدھام وغیرہ کی وجہ سے بوسہ دینے پر قدرت نہ ہو تو ہاتھ سے مس کرے دیوار کعبہ سے اپنے جسم کو مس کرنا بہتر ہے۔ خصوصاً تمام ارکان سے چمٹنا مستحب ہے اور ان تمام حالات میں حمد و ثنار پروردگار اور درود شریف کے ذکر خیر سے اپنی زبان کو تر رکھے۔ بیت اللہ کو اس طرح وداع کرے جس طرح اپنے انتہائی قریبی دوست سے وداع کر رہا ہو اور خدا سے دوبارہ حج پر موفق ہونے کی دعا طلب کرے۔ روانگی کے وقت کچھ کھجوریں خرید کر صدقہ کرے۔ آب زمزم کو واپسی پر شفا کے لئے ہمراہ لانا خوب ہے۔

مسئلہ:۔ حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد یا حج سے پہلے مدینہ منورہ میں جناب رسالتمآبؐ اور دیگر معصومینؑ کی زیارت کو جانا مستحب ہے اور حضور رسالتمآبؐ کا فرمان ہے کہ مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ۔ یعنی جو حج کرے اور میری زیارت کو نہ آئے تو تحقیق اس نے میرے اوپر جفا کی۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حَجَّ بَیْتِکَ الْحَرَامِ وَزِیَارَۃَ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ۔

تتمہ:۔ تمام اور کمال میں فرق

تمامیت:۔ کسی مرکب کے بعض اجزا شروع ہو جانے کے بعد اس کے آخری جزء تک انضمام کا نام ہے۔

کمال:۔ تمامیت کے بعد ایک وصف کے ساتھ اس کا متصف ہونا جس پر اس شے کے آثار کا ترتب موقوف ہو۔ مثلاً انسان کے تمام اجزار کا پورے طور پر موجود ہونا یہ اس کی تمامیت ہے اور اس کا عالم یا شجاع ہونا۔ مثلاً اس کا کمال ہے پہلی صورت میں انسان تام ہے اور دوسری صورت میں انسان کامل ہوگا۔ اس مقام پر حکم ہے کہ حج اور عمرہ کے شروع کرنے کے بعد اس کو تمام کرو۔ یعنی تمام اس کے اجزار بجالاؤ۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ

حج کے مہینے معلوم (مقرر شدہ) ہیں۔ پس جس نے ان مہینوں میں حج واجب کیا (اپنے اوپر) تو وہ قرب عورت

وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ

جھوٹ اور سچی یا جھوٹی قسموں سے دوران حج میں بچے اور جس قدر تم نیکیاں کروگے اللہ ان کو جانتا ہے

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

اور زاد راہ تیار کرو۔ تحقیق بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور مجھ سے ڈرو اے صاحبانِ عقل

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ

نہیں ہے تم پر کوئی گناہ۔ کہ طلب کرو فضل اپنے رب سے پس جب تم افاضہ کرو

مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا

عرفات سے تو ذکر کرو۔ اللہ کا نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کا ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں

هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا

ہدایت کی۔ اگرچہ تم اس سے پہلے (احکام شرعیہ) سے گمراہ تھے پھر افاضہ کرو تم۔ جہاں سے

مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

افاضہ کرتے ہیں لوگ۔ اور بخشش طلب کرو اللہ سے تحقیق اللہ غفور رحیم ہے

سوال:۔ قربانی کے نہ ملنے کی صورت میں جہاں دس روزوں کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تین روزے حج کے دوران میں اور سات روزے واپس پہنچ کر۔ پس یہ دس کامل ہوں گے۔ حالانکہ گذشتہ فرق کے پیش نظر سات روزوں کے ملنے سے دس کو تمام کہنا چاہیئے۔

جواب:۔ تین اور سات روزوں کا حکم جُدا جُدا ہے گویا یہاں تین روزوں کا حکم اپنے مقام پر تمام ہے۔ البتہ ان کا کمال اور قائم مقام قربانی کا ہونا۔ ان سات روزوں کے رکھنے پر موقوف ہے لہٰذا یہ سات روزے پہلے تین روزوں کے لئے کمال ہیں۔

رکوع ۹ - اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُومٰتٌ - حج کے مہینے تین ہیں :- شوال - ذوالقعدہ - ذوالحجہ - لہٰذا حج تمتع کے عُمرہ کا احرام ماہ شوال سے پہلے نہیں باندھا جاسکتا ۔

فَمَنْ فَرَضَ :- اپنے اوپر حج فرض کرنے سے مراد ہے کہ جس شخص نے حج کا احرام باندھ لیا تو پھر آئندہ ذکر ہونے والی چیزوں سے اس کو بچنا لازم ہے ۔

وَلَا فُسُوْقَ - اس سے مراد جھوٹ ہے اور ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ تمام گناہ مراد ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کسی کو بُرے نام سے پکارنا۔ بعضوں نے گالی گلوچ مراد لئے ہیں اس مقام پر تمام معانی مراد لئے جاسکتے ہیں اور حالتِ احرام میں اِن سب سے اجتناب کرنا واجب ہے ۔

وَلَا جِدَالَ :- اس سے مراد لَا وَاللّٰہ اور بَلٰی وَاللّٰہ کے الفاظ ہیں ۔ خواہ جھوٹ میں کہے یا سچ میں کہے :- اور بعضوں نے مطلق جھگڑا اور گالی گلوچ مراد لیا ہے ۔

نکتہ علمیّہ :- آیت مجیدہ میں حج کے لفظ کو تین دفعہ دہرایا گیا ہے ۔ حالانکہ پہلی دفعہ ذکر کرنے کے بعد باقی دونوں مقامات پر ضمیر کا لانا کافی تھا ۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حج سے مراد ہر سہ مقامات پر ایک نہیں ہے ۔ پہلی جگہ لفظ حج سے مراد زمانِ حج ہے اور دوسری جگہ افعالِ حج مراد ہیں اور تیسری جگہ افعالِ حج کا زمانہ مقصود ہے اگر لفظ حج کو نہ دہرایا جاتا ۔ بلکہ ضمیر کو لایا جاتا تو عبارت میں طول ہو جاتا ۔ کیونکہ دوسری جگہ بجائے لفظِ حج کے اَفْعَالَہٗ اور تیسرے مقام پر بجائے لفظ حج کے زَمَانُ اَفْعَالِہٖ کہنا پڑتا ۔ اور اس میں شک نہیں کہ لفظ حج کے دہرانے سے اس طول کی ضرورت نہیں رہتی

اَنْ تَبْتَغُوْا :- امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ فضل سے مراد رزق ہے یعنی جب احرام سے فارغ ہو جائے اور اپنے مناسکِ حج ادا کرلے اور تو اس کے لئے خرید و فروخت کی ممانعت نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ جو لوگ زمانِ حج میں کرایہ دار اور مزدور ہوا کرتے تھے تو ان کو دوسرے ساتھی کہا کرتے تھے کہ تمہاری حج صحیح نہیں ہوئی کیونکہ تم پیسہ کما رہے ہو ۔ اور اس بنا پر یہ آیت اتری اور جابر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ فضل سے مراد یہاں مغفرت ہے کہ ان ایام میں خدا سے بخشش و مغفرت طلب کرو ۔

ثُمَّ اَفِیْضُوْا :- اس کے معنی میں دو قول ہیں :- ایک یہ کہ افاضہ سے مراد وہی عرفات سے افاضہ کرنا ہے ۔ کیونکہ قریش لوگ وقوفِ عرفات نہیں کرتے تھے اور لوگوں کے ہمراہ رہنا اپنی ہتک سمجھتے تھے ۔ لہٰذا وہ مشعر میں وقوف کرکے وہاں سے منیٰ کی طرف افاضہ کرتے تھے تو یہ آیت اتری کہ تم اسی جگہ سے افاضہ کرو ۔ جہاں سے اور لوگ افاضہ کرتے ہیں ۔

اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ عرفات سے افاضہ کرنے کا حکم پہلے بھی آچکا ہے تو یہاں تکرار کیوں کیا گیا ؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر ہے ۔ اصل میں یوں تھا ۔ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ یعنی پھر افاضہ کرو جہاں سے افاضہ کرتے ہیں باقی لوگ

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

پس جب پورا کرو اپنے اعمال کو تو ذکر کرو اللہ کا جسطرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

پس بعض لوگ کہتے ہیں ۔ اے رب ہمیں عطا کر دنیا میں اور نہیں ہے ان کا آخرت میں کچھ حصّہ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً

اور بعض ان میں سے کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں عطا کر دنیا میں خیر و خوبی اور آخرت میں خیر و خوبی

وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے ایسے لوگوں کے لئے حصّہ ہے اس چیز سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ جلدی حساب لینے والا ہے

یعنی دوسرے عرب اور جب عرفات سے افاضہ کرو تو پھر مشعر الحرام میں پہنچ کر خدا کا ذکر کرو اور دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ اس افاضہ سے مراد مشعر الحرام سے افاضہ کرنا ہے پس دو افاضے واجب ہوئے ۔ پہلے عرفات سے مشعر کی طرف اور دوسرا مشعر سے منٰی کی طرف ۔ (از مجمع البیان)

روایاتِ اہلبیت میں پہلے معنی کو اختیار کیا گیا ہے اور وجہ یہی ہے کہ قریش مشعر سے افاضہ کرتے تھے اور دوسرے عرب قبائل عرفات سے افاضہ کرتے تھے جب جناب رسالتمآبؐ تشریف لائے تو سب کو عرفات سے افاضہ کا حکم ہوا۔ نیز آیت میں ناس سے مراد حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ لئے گئے ہیں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ :- مجمع البیان ۔ امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب جاہلی عرب ان اعمال سے فارغ ہوتے تھے تو منٰی میں جمع ہو کر اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے ذکر کر کے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے پس یہ آیت اتری کہ جب مناسک حج کو ادا کر لیا کرو تو اللہ کا ذکر کیا کرو جس طرح اس سے پہلے اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے تھے ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔ اور ذکر سے مراد تکبیرات ہیں جو عنقریب ذکر کی جائیں گی۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً :۔ اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں ۔ (۱) حسنہ دنیا سے مراد نعماتِ دنیا ہیں اور حسنۂ آخرت سے مراد نعماتِ آخرت ہیں ۔ (۲) امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حسنہ دنیا سے مراد، رزق و معاش کی وسعت اور حسن خلق ہے اور حسنۂ آخرت سے مراد اللہ کی خوشنودی و جنت ہے (۳) دنیا میں علم و عبادت اور آخرت میں بہشت (۴) دنیا میں مال اور آخرت میں جنّت (۵) دنیا میں نیک عورت اور آخرت میں جنّت ۔ یہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے اور جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جس شخص کو شکر گذار دل،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ
اور تم ذکر کرو اللہ کا گنے چنے ہوئے دنوں میں پس جو شخص جلدی کرے دو دنوں میں تو اس
عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ واسطے اس کے جو بچا ہو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو تحقیق تم

اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾
طرف اسی کے جمع کئے جاؤ گے۔

ذکر کرنے والی زبان اور امورِ دنیا و آخرت میں امداد کرنے والی مومنہ عورت عطا ہو تو پس اس کو دنیا و آخرت کی خیر و خوبی عطا ہو گئی اور وہ عذاب دوزخ سے بھی بچ گیا۔

سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) انسان کو اپنے اعمال کی جزاء دُور نہیں سمجھنی چاہیئے بلکہ خدا بہت جلد اس سے حساب لینے والا ہے کیونکہ ادھر اُس کی موت آئی اُدھر اس کا حساب شروع ہُوا۔ لہٰذا حساب لئے جانے میں کوئی دیر نہیں۔ (۲) قیامت کے روز خدا تمام (اپنی مخلوق) سے جلدی (لے گا یعنی) ایک ہی وقت میں وہ تمام اہل محشر کا حساب لے لیگا۔ بعض روایات میں ہے ایک پلک جھپکنے کے وقت میں سب حساب لے لے گا۔ کیونکہ وہ ایک ہی وقت میں سب کی سُن سکتا ہے اور سب سے خطاب فرما سکتا ہے وہ اس معاملہ میں آلات و اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ خدا مخلوق کا حساب ایک ہی وقت میں اس طرح لے گا۔ جس طرح سب کو رزق ایک ہی وقت میں دے دیتا ہے۔

نکتہ لطیفہ:۔ یہاں حج کرنے والوں کی نیت میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ لوگ حج کے لباس میں بھی دو قسم کے ہوا کرتے ہیں ایک طالب دنیا اور دوسرے طالب دین۔ پہلی قسم کا پہلی آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ ان کی دعا صرف منافع دنیاوی کی طلب تک ہی محدود ہے لہٰذا ان کی طلب میں حَسَنَہ کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ اغراض دنیاویہ کے متوالے صرف تکمیل منافع دنیاویہ ہی ان کا مطمح نظر ہوتا ہے خواہ اللہ کے نزدیک وہ اچھی ہو یا بُری۔ کیونکہ ان کو تمام دنیاوی فوائد اچھے ہی اچھے نظر آتے ہیں۔ اور دوسری آیت میں دوسری قسم کے حاجیوں کا ذکر ہے جو خوشنودی خدا کے لئے حج کرتے ہیں اور چونکہ ان کا مطمح نظر اللہ کی رضامندی ہوتی ہے لہٰذا ان کی دعا میں دنیا و آخرت میں حسنہ کی طلب کا ذکر فرمایا ہے پہلی قسم کے لوگوں کا عمل اگرچہ تمام ہوتا ہے لیکن چونکہ کامل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کے متعلق فرمایا کہ ان کا آخرت میں حصّہ نہ ہوگا۔ اور دوسری قسم کے لوگوں کا عمل تام بھی ہوتا ہے اور کامل بھی۔ لہٰذا وہ جزا و ثواب کے مستحق ہیں تو ان کے لئے فرمایا کہ ان کے لئے اُن کے کمائے ہوئے کا اجر ثابت ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ:۔ ایّام معدودات یعنی گنے ہوئے دن ان سے مراد ایّام تشریق ہیں یعنی ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ اور ان ایام

میں ذکر کرنے سے مراد تکبیرات ہیں۔ جن کو نماز ہائے فریضہ کے بعد پڑھنا مستحب ہے اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور عید کے دن نماز ظہر سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ کی نماز صبح تک ان پندرہ نمازوں کے بعد اُن کو پڑھنا چاہیئے اور وہ یہ ہیں :- اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا هَدَانَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مَا اَوْلَيْنَا وَاللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا رَزَقَنَا مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ اور جو لوگ منیٰ میں موجود نہ ہوں۔ ان کے لئے دس نمازوں کے بعد ہی تکبیرات پڑھنی چاہئیں۔ یعنی عید کے دن نماز ظہر سے لے کر بارہویں کی نماز صبح تک۔ گویا حاجیوں کے لئے پندرہ نمازوں کے بعد اور باقی لوگوں کے لئے دس نمازوں کے بعد تکبیرات کا پڑھنا مستحب ہے اور بقولے واجب ہے۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ - ظاہراً اس میں نفر اوّل کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے جو شخص ایام تشریق کے دوسرے روز یعنی ۱۲ ذوالحجہ کو منیٰ سے روانہ ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ (حرج) نہیں ہے اور جو تاخیر کرے اور ۱۳ ذوالحجہ کو وہاں سے روانہ ہو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ بارہویں کے دن نفر کرنا یعنی کوچ کرنا بھی جائز اور تیرھویں کے دن نفر کرنا بھی جائز ہے لیکن نفر اوّل سے نفر ثانی یعنی تیرھویں کے دن کی روانگی افضل ہے تاکہ جمروں کو سنگریزے اس دن بھی مار کر مقدار پوری کرلے اور بارہویں کے دن اگر نفر کرے تو زوال سے پہلے ناجائز ہے بلکہ زوال کے بعد غروب تک جس وقت چاہے جا سکتا ہے اور غروب اگر منیٰ میں ہو جائے تو پھر رات کو رہنا واجب ہو جائے گا اور تیرھویں کے دن نفر ثانی کو اختیار کرنا لازم ہوگا۔

آیت کے معانی میں چند قول ہیں۔

(۱) لَا اِثْمَ عَلَيْهِ :- سے مراد ہے کہ اعمال حج کرنے کے بعد اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے۔ خواہ نفر اوّل کرے یا نفر ثانی، دونوں صورتوں میں اس کے سابقہ گناہ مغفور ہیں۔

(۲) ازالۂ شبہ ہے :- ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں یہ وہم پڑ جائے کہ شاید نفر اوّل یعنی بارہویں کو منیٰ سے کوچ کرنا گناہ ہو تو اس وہم کا ازالہ کر دیا گیا ہے کہ نفر اوّل یا نفر ثانی ہر دو میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس کی موت جلدی آ جائے اور ان دنوں کے اندر مر جائے تو اس کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں کیونکہ مناسک حج ادا کرنے کی وجہ سے سب کے سب معاف ہو گئے ہیں اور جس کی موت ان ایام سے مؤخر ہو جائے تو اس کا آئندہ کوئی گناہ نہ محسوب ہوگا۔ بشرطیکہ گناہان کبیرہ سے بچا ہے

لِمَنِ اتَّقٰى :- اگر پچھلے فقرہ سے مراد نفر اوّل اور نفر ثانی کا جواز ہو۔ (یعنی ۱۲ ذوالحجہ یا ۱۳ ذوالحجہ دونوں ہی تاریخوں میں منیٰ سے روانگی جائز ہے اور حاجی کو اختیار ہے کہ جس دن چاہے روانہ ہو) تو اس صورت میں لِمَنِ اتَّقٰى اس کے اختیار کی قید ہے یعنی یہ اختیار اس حاجی کے لئے ہے جو حالت احرام میں شکار سے بچا رہے۔ ورنہ جو شخص حالت احرام

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ

اور لوگوں میں سے بعض کہ آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہے بات اس کی دنیا میں اور وہ گواہ بناتا ہے اللہ کو اوپر اس کے جو اس کے دل میں ہے

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ

حالانکہ وہ سخت ترین دشمن ہے اور جب وہ برسرِ اقتدار آتا ہے تو بھاگ دوڑ کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اس

الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ

میں اور برباد کرے کھیتی اور نسل کو اور خدا فساد کو دوست نہیں رکھتا اور جب اس کو کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو غلبہ کرتی

الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

ہے اس پر حمیت ساتھ گناہ کے پس کافی ہے اس کے لئے دوزخ اور وہ بُرا ٹھکانا ہے اور بعض لوگ ہیں جو بیچتے ہیں

يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اپنے نفس کو واسطے طلب رضامندی خدا کے اور اللہ بڑا مہربان ہے اپنے بندوں پر

میں تنکار سے نہ بچ سکا ہو۔ تو اس کے لئے نفرِ اول جائز نہیں ہے بلکہ نفرِ ثانی اس پر واجب ومعین ہے اور اگر پہلے فقرہ میں پہلا یا تیسرا قول اختیار کیا جائے تو اِتّقٰی سے مراد گناہانِ کبیرہ سے اجتناب ہے یعنی حاجی کے تمام سابقہ ولاحقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں بشرطیکہ آئندہ گناہانِ کبیرہ سے بچا رہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا ہے۔

ربط:۔ بیانِ حج میں گذر چکا ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک طالبِ دنیا اور دوسرے طالبِ آخرت تو اس مقام پر بھی لوگوں کی دو قسموں کو بیان فرما رہا ہے۔ ایک منافق قسم کے اور دوسرے خالص مومن۔ پس ان آیتوں کو حج کی آیات سے مناسبت تھی لہذا حج کے بیان کے بعد ان کا ذکر کیا گیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ:۔ تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ ایک شخص منافق اخنس نامی جو نہایت خوش گفتار تھا۔ حضرت رسالتمآبؐ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوتا اور اللہ کو گواہ کرکے کہتا کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زبان پر ہے اور میں سچے دل سے مسلمان ہوں۔ آنحضورؐ کو اس کی چکنی چپڑی باتیں ظاہر کے لحاظ سے پسند آیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ آنحضورؐ کی خدمت سے رخصت ہوکر چلا گیا تو کسی مقام پر مسلمانوں کی کھیتی کو آگ لگادی اور ان کے چوپاؤں کو قتل کر دیا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی تفسیر برہان میں معصومینؑ سے مروی ہے کہ باطن کے لحاظ سے اس آیت کے مصداق فلاں فلاں ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ :- اس کے شانِ نزول کے متعلق اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے حق میں اتری جبکہ شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر سوئے تھے اور واقعہ یوں ہے کہ کفارِ قریش نے مشورہ کیا تھا کہ جناب رسالتمآبؐ کو اپنے مقام پر قتل کر دیا جائے اور چونکہ ظاہر ہو کر ایک آدمی یا ایک قبیلہ کا قتل کرنا مشکل ہے کیونکہ بنی ہاشم مشتعل ہو جائیں گے اور خواہ مخواہ قصاص لیں گے لہذا بہتری اسی میں ہے کہ تمام خاندانوں میں سے ایک ایک آدمی منتخب کر لیا جائے اور وہ سب مل کر آنحضورؐ کو قتل کر دیں اس صورت میں اگر بنی ہاشم مشتعل ہوں گے تو ان کو خون بہا پر راضی کر لیا جائے گا۔ کیونکہ تمام خاندانوں سے قصاص لینا اُن کے لئے مشکل ہو گا۔ پس حضرت جبرائیل نازل ہوئے اور قریشیوں کے خبثِ باطن کی آنجنابؐ کو خبر دی اور حکم سنایا کہ اپنے بستر پر حضرت علیؑ کو سلا دیں اور خود بنفسِ نفیس مدینہ کی طرف تشریف لے جاویں۔ پس آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت علیؑ بسترِ رسولؐ پر سو گئے جوانانِ قریش اپنے مشورہ کے ماتحت جب پہنچے تو انہیں یہ یقین تھا کہ حضورؐ خود بستر پر سوئے ہوئے ہیں پس جب انہوں نے جگایا تو حضرت علیؑ کو سویا ہوا پایا۔ پوچھنے لگے۔ محمدؐ کہاں ہیں؟ آپؑ نے فرمایا مجھے کیا معلوم؟ پس وہ خائب و خاسر وہاں سے چلے گئے۔

تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ خداوند کریم نے جبرائیل و میکائیل کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ مقرر کی ہے پس دونوں میں سے کون اپنی عمر کے کچھ حصہ کی قربانی پیش کرتا ہے تاکہ اس کے حصہ سے کاٹ کر اس کے بھائی کے حصہ میں شمار ہو جائے یہ سنتے ہی دونوں فرشتے خاموش ہو گئے۔ پس خدا کی جانب سے وحی ہوئی کہ تم میرے ولی علیؑ بن ابی طالب کی مثل کب ہو سکتے ہو؟ کہ میں نے اس کے اور اپنے نبی محمدؐ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہے پس وہ اپنے بھائی پر اپنی جان قربان کر کے سو رہا ہے۔ پس تم دونوں زمین پر اترو اور دشمنوں سے اس کی حفاظت کرو۔ پس دونوں فرشتے اترے جبرئیل جانب سر بیٹھا اور میکائیل جانب قدم بیٹھ گیا اور جبرئیل نے کہنا شروع کیا۔

بَخٍّ بَخٍّ مَنۡ مِثۡلُكَ يَا ابۡنَ اَبِيۡ طَالِبٍ وَاللّٰهُ يُبَاهِيۡ بِكَ الۡمَلٰٓئِكَةَ۔ مبارک۔ مبارک! اے ابو طالب کے فرزند! تیرا ہمسر کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا ملائکہ پر بھی تیرے ایثار کا فخر کر رہا ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ رات کے وقت آپ کو نیند نہ آئی ہو گی کیونکہ موت کا خطرہ تھا تو آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم، آج کی شب کی طرح مجھے عمر بھر نیند نصیب نہیں ہوئی۔

بعض لوگوں نے اس آیت مجیدہ کے شانِ نزول کو دوسرے صحابہ سے متعلق کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جن کو قدرے علومِ اسلامیہ میں دخل ہے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس آیت میں علیؑ کا اور شریک کوئی نہیں ہے خود حضرت امیر المومنینؑ نے مجلسِ شوریٰ میں عثمان۔ طلحہ۔ زبیر۔ عبدالرحمن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص کے سامنے جب اپنی یہ منقبت بیان فرمائی تو سب نے سر جھکائے اور اس کے انکار کی جرأت کسی سے نہ ہو سکی۔

معاویہ کے زمانہ میں جب حدیث سازی کا کام شروع ہوا تو سمرہ بن جندب کو حکومت نے چار لاکھ درہم صرف اس انعام میں دیئے کہ اس نے وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ الخ علیؑ کے حق میں اور مَنۡ يَّشۡرِىۡ ابن ملجم کے حق میں اترنے کی روایت گھڑ کر پیش کی تھی (سوانح عمری حضرت عمر حصہ اول نقلاً از شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ

اے ایمان والو (صرف زبانی دعویٰ کرنے والو) داخل ہو جاؤ اسلام میں (دل و جان سے) سب کے سب اور نہ اتباع کرو نقش قدم شیطان

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ

کی۔ تحقیق وہ تمہارا ظاہر دشمن ہے پس اگر تم پھسل جاؤ بعد اس کے کہ آچکیں تمہارے پاس روشن دلیلیں تو پس جان لو کہ

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ

تحقیق اللہ غالب اور حکمت والا ہے وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کی کہ لائے خدا ان پر بادل کے ٹکڑے

فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

اور فرشتے (عذاب کے) اور حتمی ہو جائے معاملہ (عذاب کا) اور اللہ کی طرف ہی پھیرے جائیں گے تمام امور

رجعت کا بیان

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ۔ تفسیر برہان میں آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی طرف سے متعدد روایات منقول ہیں جو غالباً حد تواتر تک پہنچتی ہیں کہ سلم سے مراد اس آیت میں حضرت علیؑ اور اس کی اولاد طاہرینؑ کی ولا کا اقرار ہے اور خطوات شیطان سے مراد دشمنان اہلبیت کی ولاء ہے (یہ تفسیر باطنی اعتبار سے ہے)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ۔ تفسیر آئمہ اہلبیتؑ میں ہے کہ یہ آیت رجعت کے متعلق ہے چنانچہ ایک روایت میں حضرت جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ یوم وقت معلوم میں ابلیس اپنے تمام مریدوں کو جمع کرلے گا اور اس کے مقابلہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام اپنے شیعوں میں تشریف لائیں گے ان دونوں لشکروں کی ملاقات فرات کے کنارے کوفہ کے قریب مقام روحا پر ہوگی۔ اور سخت ترین لڑائی واقع ہوگی پس اس وقت خدا کا امر بادلوں کے ٹکڑوں میں نمودار ہوگا۔ ملائکہ عذاب اتریں گے اور جناب رسالتمآبؐ تشریف لائیں گے کہ ان کے ہاتھ مبارک میں ایک نورانی حربہ ہوگا۔ جب ابلیس یہ چیزیں ملاحظہ کرے گا۔ تو فرار کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے پیروکار اس سے بھاگنے کی وجہ پوچھیں گے تو جواب میں کہے گا کہ مجھے وہ چیز نظر آرہی ہے جس کو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ پس جناب رسالتمآبؐ اس کو پیچھے سے دونوں کندھوں کے درمیان نیزہ ماریں گے اور وہ واصل جہنم ہوگا۔ اس کے بعد ایک طویل مدت تک حضرت علیؑ حکومت کریں گے جو چوالیس ہزار سال ہوگی۔ الخبر)

سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ

دریافت کیجئے بنی اسرائیل سے کہ کس قدر دی ہیں ہم نے اُن کو نشانیاں واضح اور جو شخص تبدیل کرے اللہ کی نعمت

اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

کو بعد اس کے کہ اس کے پاس آجائے تو پس تحقیق اللہ سخت عذاب والا ہے زینت دی گئی کافروں کے لئے

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ

زندگانی دنیا اور وہ لوگ مسخری کرتے ہیں اُن سے جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو متقی ہیں ان سے بلند مرتبہ ہوں گے بروز

الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

محشر اور خدا رزق دیتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے

رکوع ۱۰

ربطِ آیات :۔ اصولِ اسلام بیان کرنے کے بعد خداوند کریم نے یہ فروعی مسائل بیان فرمائے اور عمل کرنے والوں کے لئے وعدۂ جنت اور نافرمانی کرنے والوں کے لئے وعیدِ جہنم کا ذکر کیا اور بیان فرمایا کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) مومن جو دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتے ہوئے نیک اعمال بجالاتے ہیں

(۲) خالص کافر جن کا مطمحِ نظر صرف منافع دنیاویہ ہیں ۔

(۳) منافق لوگ جو تیرے سامنے میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں اور باہر جاکر فساد بپا کرتے ہیں ۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کی مخالفت اس لئے نہیں کہ حق کی دلیلیں کمزور ہیں بلکہ اُن کا خبثِ باطن اور سوءِ سریرت اُن کو قبولِ حق سے روکتی ہے۔ اور تجھ سے پہلے بنی اسرائیل کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے لہٰذا اُن سے سوال تو کیجئے کہ تمہارے پاس کس قدر واضح دلیلیں آچکی ہیں اور جو لوگ جان بوجھ کر حق سے کنارہ کش ہوتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کا عذاب سخت ہے ۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا :۔ بنی اسرائیل کو متنبہ کرنے کے بعد کفار کے متعلق فرماتا ہے کہ اُن کو زینتِ دنیاوی پر غرور ہے اور اپنی ظاہری ٹھاٹھ کی بنا پر حق سے یکسوئی کرتے ہوئے مومنین سے مسخری وغیرہ کرتے ہیں اور اُن کو اپنے سے پست سمجھتے ہیں حالانکہ رزق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ ہاں قیامت کے دن ان کو پتہ چلے گا کہ ایمان والوں اور ڈرنے والوں کا مرتبہ کس قدر بلند ہے اور وہ لوگ خود کس تاریکی و پستی میں تھے اور اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق کہا گیا ہے کہ ابوجہل اور دیگر اکابرِ قریش جو مالدار

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ

لوگ ایک جماعت تھے پس بھیجا خدا نے نبیوں کو جو بشارت دینے والے اور ڈرانے

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

والے تھے اور اتاری ان کے ساتھ کتاب ساتھ حق کے تاکہ حکم کرے لوگوں میں اس چیز کے متعلق جس میں ان کو اختلاف تھا

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

اور اس میں نہیں اختلاف کیا مگر ان لوگوں نے جن کو وہ دی گئی بعد اس کے کہ آئیں ان کے پاس واضح دلیلیں

بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ

سرکشی کرتے ہوئے اپنے درمیان ۔ پس ہدایت فرمائی اللہ نے ایمان والوں کی اس چیز میں اُن کو اختلاف تھا حق سے

بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

ساتھ اپنے اذن کے ۔ اور خدا ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے طرف راہِ راست کے

تھے فقراء مومنین مثلاً عبداللہ بن مسعود اور بلال و عمار وغیرہ سے مسخری کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر محمد اللہ کا نبی ہوتا تو ہمارے اشراف و اکابر اس کی اتباع کیوں نہ کرتے؟ اور بعض کہتے ہیں کہ رؤسا یہود مہاجر فقرا سے مسخری کرتے تھے اور ان کو فقر کا طعنہ دیتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً :۔ اس آیت مجیدہ کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں :۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوحؑ کے زمانہ تک کے لوگ مراد ہیں کیونکہ یہ سب ملتِ کفر پر تھے۔ چنانچہ تفسیر برہان میں حضرت صادقؑ سے ایک روایت ہے کہ جب حضرت آدمؑ کی رحلت ہوئی تو حضرت شیثؑ ان کے وصی اور جانشین تھے۔ لیکن قابیل نے ان کو دینِ حق کے اظہار سے روک دیا تھا اور قتل کی دھمکی دی تھی۔ پس حضرت شیثؑ تقیہ میں زندگی بسر کرتے رہے اور کفر روز بروز ترقی کرتا گیا اور حضرت شیثؑ ایک جزیرہ میں علیحدگی اختیار کر کے عبادتِ خدا میں مشغول رہے۔

(۲) بعضوں نے کہا ہے کہ اس آیت سے حضرت نوحؑ سے حضرتِ ابراہیمؑ تک کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں جو کہ حالت کفر پر تھے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ ایک جماعت میں تھے یعنی کلمہ حق پر تھے لیکن بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

(۴) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرتِ نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے یہ سب حق پر تھے۔ لیکن

کچھ عرصہ بعد ان میں اختلاف پیدا ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے پاس انبیاؑ بھیجے گئے۔

۵۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان والے لوگ مراد ہیں اور یہ لوگ نہ کافر تھے اور نہ مومن تھے بلکہ مذبذب تھے۔ پس انبیاء مبعوث ہوئے اور ان کو صحیح اسلام کے راستہ کی دعوت دی گئی۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ :۔ یعنی جن لوگوں کے پاس کتاب آجاتی تھی تو پھر جان بوجھ کر وہ اس میں اختلاف ڈال دیتے تھے جس طرح یہودی علماء کہ انہوں نے جناب رسالتمآبؐ کے اوصاف (جو تورات میں موجود تھے) کو تبدیل کر کے عوام کو اختلاف و گمراہی میں ڈال دیا۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا :۔ خدا ہدایت سب کو کرتا ہے لیکن فائدہ چونکہ مومن ہی اٹھاتے ہیں اس لئے ان کو خاص طور پر ذکر فرمایا۔

عقلی و اُصولی بحث

ذاتِ حق سبحانہٗ نے اس مقام پر نوعِ انسانی کی اصل فطرت، ان کی تکلیف، دین کی وجہ تشریع، نوعِ انسانی میں سبب اختلاف اور ارسالِ انبیاء کی غرض کو واضح فرمایا ہے۔

جس کا اجمال یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی فطرت جو اللہ نے ان کو ودیعت فرمائی ہے وہ ہے باہمی اتحاد و تعاون یعنی اوّل خلقت میں مزاجِ انسانی کا خمیر اسی فطرتِ پاکیزہ اور جبلت سعیدہ سے ہے۔ لیکن طلب فضائل و کمالات اور اشتہار مآثر و مرغوبات کی فطری و خلقی ہوس نے اسے بے اعتدالی اور بے راہ روی کی آماجگاہ میں ڈال کر باہمی انتشار اور آپس کے نزاعات تک پہنچا دیا۔ لہٰذا ان کے باہمی حقوق کے امتیازات اور نزاع و اختلاف سے نجات کے لئے ایسے قوانین کے وضع کرنے کی ضرورت ناگزیر تھی۔ جو ان کے روزمرہ کے معاملاتی خلفشار اور ذاتی مشاجرات کے قلع قمع کے لئے عمل میں لائے جائیں۔ پس ایسے قوانین جو خود ذاتِ اقدس الٰہیہ نے مصالح عباد کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ ان کے مجموعی ڈھانچے کو دین کا لبادہ اوڑھا دیا اور اُن پر عمل کرنے یا ان کو پسِ پشت ڈالنے کا نتیجہ ثواب و عقاب مقرر فرمایا اور ان قوانین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انبیاء و رسل کو بشارت و نذارات کے فرائض تفویض فرما کر بھیجا اور ساتھ ساتھ ان کو معارف و حقائق کا معلّم بناتے ہوئے فروعی اعمال کا ضابطہ دے کر ان کو قیادتِ انسانی کا عہدہ سپرد فرمایا۔ تاکہ نوعِ انسانی جور و اعتساف کجی و انحراف اور بے داد و استبداد کی پُرخطر، امن سوز اور وحشیانہ انداز سے اجتناب کرتے ہوئے بجائے توحش و تفحش کے پُربہار پُرامن اور پُراطمینان زندگی گذاریں۔ باہمی اختلاف و انتشار کی جگہ انس و محبت لے لے۔ افتراق اتفاق سے بدل جائے خلفشار کی بجائے دوستی و پیار ہو، سفاکی و بیباکی کے مقام پر صلح و آشتی آجائے، بے حیائی و بے اعتدالی حیا و عفت اور عدل و انصاف سے تبدیل ہوجائے، خودغرضی و نفس

پرستی کی جگہ رواداری و غمگساری آجائے اور حیوانیت اور درندگی کی بجائے شرافت اور انسانیت کا بول بالا ہو۔
پس دین ایک ایسا ضابطہ اور لائحہ عمل ہے جو نوعِ انسانی کو اپنی فطرت و جبلت کے فرائض سے روشناس کراتا ہے اور جو اتحاد و تعاون کا سرچشمہ ہے اور لادینی انسانیت کے لئے وہ سمِ قاتل اور زہرِ ہلاہل ہے جو خلافِ فطرت افعال کے لئے انسان کا پیش خیمہ ہے جن کا نتیجہ آخر کار انسانیت کے زندہ درگور کرنے پر منتہی ہوتا ہے۔
انسان کیا ہے؟ مادہ و طبیعت کے پرستار سادہ لوح طبائع انسانیہ کو ماؤف بلکہ مضمحل کرنے اور ان کو لادینیت کے اُلجھاؤ میں ڈالنے کے لئے کئی ایک بے تکیاں کستے ہیں اور من جملہ ان کی خرافات کے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کی ابتدا بندر سے ہوئی۔ یعنی انسان پہلے بندر تھا اور مرورِ زمانہ سے ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ اُن کا یہ دعویٰ صرف بعض مشابہات سے اکتشاف کا نتیجہ ہے۔ ورنہ مقامِ دلیل میں اُن کے پاؤں لنگ اور زبان گنگ ہے۔ خداوند قدوس نے اپنے کلام پاک میں متعدد مقامات پر پوری تفصیل سے آغازِ خلقتِ انسانیہ کا تذکرہ فرمایا ہے اور نوعِ انسانی کو ایک علیحدہ مخلوق قرار دیا ہے۔ اس کا ماں باپ حضرت آدم و حوا کو قرار دیکر ان بے ہودہ ولایعنی خیالات میں پڑنے سے روکا ہے اور اس کو اشرف المخلوقات کی خلعت سے مزین فرما کر دنیا میں بھیجا ہے اگر نسل انسان بندر سے ہو تو اس عقیدہ کی حمایت کرنے والوں پر یہ عقلی فرض عائد ہوتا ہے کہ خلعتِ شرافت و تاجِ کرامت جو انسانیت کا زیور ہے اپنے سر سے اتار کر ان کرم فرماؤں اور مہربانوں کے سپرد کر دیں جن سے اپنی نسل کی ابتدا مانتے ہیں۔ کیونکہ باپ کی موجودگی میں بیٹے کو قطعاً حکومت کا حق نہیں بلکہ کس قدر ناخلف اور عاق ہوگی وہ اولاد جو دوسروں پر تو بجائے خود اپنے باپ اور محسن پر بھی اپنی فوقیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والی ہو (بریں عقل و دانش بباید گریست)
انسان دو جزؤں کا مرکب ہے۔ ایک رُوح دوسرے بدن۔ رُوح جزء اشرف و اعلیٰ ہے اور بدن جزء اخس ہے ان ہر دو جزؤں کا تعاون و تلازم زندگی کہلاتا ہے اور ان کے تفارق کا نام موت ہے اور جو خُدا قسرِ عدم سے نکال کر ہر دو جزؤں کو خلعتِ وجود سے آراستہ فرماتے ہوئے ان کو اتحاد و یگانگت بخش سکتا ہے وہ ان کے افتراق و انتشار کے بعد دوبارہ ان میں یکجہتی لا کر حیاتِ ثانیہ سے بھی سرفراز فرما سکتا ہے اور جو عدمِ ازلی کے بعد وجود دینے پر قادر ہے اس کے لئے عدمِ لاحق کے بعد موجود کرنا کیا مشکل ہو سکتا ہے کیونکہ نئے سرے سے جوڑ سکنے والے کے لئے توڑنے کے بعد جوڑنا تو کوئی بڑی بات ہی نہیں۔
پھر فیاضِ مطلق نے انسان پر خلعتِ وجود کے ساتھ ساتھ ایک جوہرِ شعور بھی مرحمت فرمایا اور اس کو کان، آنکھ، دل و دماغ ایسی قوتیں عطا فرمائیں۔ پس وہ حواسِ ظاہریہ و قوائے باطنیہ کے باہمی تعاون اور عقل و دماغ کی روشنی میں ادراک و فکر کے صحیح و صائب نظریوں سے استفادہ کر کے اشیاءِ عالم کا مطالعہ کر سکتا ہے اور پوری دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے ذریعہ سے تمام عالمی پیداواریں سے اپنے نفع و نقصان کی چیزوں میں امتیاز کر کے جلبِ نافع اور دفعِ ضار کرنے پر قادر ہے۔ یعنی انواعِ موجودات میں آمرانہ تصرف اور حاکمانہ تسلط اس حضرتِ انسان کو حاصل ہے۔

ارشاد قدرت ہے:- خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (جو کچھ زمین میں ہے وہ تمہارے لئے ہی اللہ نے پیدا کیا ہے) سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (تمہارے لئے اس نے آسمانوں اور زمین کی تمام اشیاء کو مسخر فرمایا ہے) اس کے علاوہ دیگر آیات بھی بکثرت موجود ہیں جن میں انسان کا عالمی اشیاء کے استخدام و تسخیر پر قادر ہونے کا صراحتاً یا اشارتاً وکنایتہً ذکر آتا ہے اور دَورِ حاضر میں اس کا مطلب عقلی ادلہ یا نقلی براہین سے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ مشاہدہ و تجربہ نے مقامِ اثبات میں پڑنے سے سبکدوش کر دیا ہے۔

پس قوتِ فکر و ادراک اور رابطہ تسخیر موجودات کے حصول کے بعد انسان کا ارتقاء پسند اور رفعت طلب دماغ علوم مناسبہ وفنونِ لائقہ میں دسترس حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے اور اس کے مشاعر و قویٰ اس کو ہمیشہ آگے بڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

وجوہِ اختلاف و انتشار نیز انسان میں اسی شعور و ادراک کے آثار و نتائج میں مختلف قوتیں موجود ہیں جو باہمی طور پر برسرِ پیکار بھی رہتی ہیں۔ جذباتِ خود پسندی و خود غرضی و نفس کوشی کا مقتضا یہ ہے کہ ان کمالات میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو اور انصاف و عدل کے تقاضے اپنی اپنی حدود سے تجاوز کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ جہاں اپنی ذات کے لئے جلب منفعت اور استخدام و تسخیر موجودات کی طرف پیش قدمی کی دعوت انسان کے جذبۂ فطرت کی آواز ہے وہاں تجاوز حدود سے اجتناب اور شرافت و دیانت کے ماتحت باہمی یگانگت و اتحاد و صلح و آشتی اور عدل و انصاف کے اصولوں سے تمسک اس کی آزاد و صالح ضمیر کی آواز ہے جس کو خلاقِ عالم نے نوعِ انسانی کی فطرت و جبلت میں تفویض فرما دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:- فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (اس نے انسان کو برائی اور تقویٰ کا الہام کر دیا ہے) اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کا بھی یہی مطلب ہے۔

افرادِ انسانی چونکہ قوت و ضعف میں یکساں نہیں اور جس طرح ان کی قوائے ظاہریہ میں تفاوت ہے۔ اسی طرح ان کے مشاعر باطنیہ دل و دماغ اور حس و شعور وغیرہ میں بھی معتد بہ فرق ہے فطری رجحان و جبلی میلان میں چونکہ ایک دوسرے سے متحد ہیں لیکن ان کی ہر ہر قوت ظاہری و باطنی میں اپنے اپنے مقام پر نمایاں اختلاف ہے تو ہر مرحلہ پر جذبہ تسخیر و استخدام جہاں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہاں دوسرے کو اپنے راستہ سے ہٹانے کی بھی پیش کش کرتا ہے اور ذاتی شعور اور فطری احساس چونکہ سب میں ہے۔ لیکن اسبابِ حصول اور ذرائع وصول میں تفاوت ہے لہذا اپنا رستہ ہموار کرنے کے لئے دوسروں پر دست تعدی دراز کرنے اور اپنی طاقت کے بل بوتہ پر ضعیف و کمزور پر ظلم کرنے تک نوبت آجاتی ہے اور جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ جذبۂ ہوس کے پیشِ نظر دوسروں کے حقوقِ زندگی کو پامال کرتے ہوئے ان کے فطری استحقاق کو صرف نظر انداز نہیں بلکہ کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ تمدن کا تقاضا یہ تھا کہ باہمی اُنس و محبت ہو تعاون و اتحاد ہو اور رواداری و ہمدردی سے امن و اطمینان کا دَور دورہ ہو اور یہی چیز نوعِ انسانی کا پہلا فطری جوہر

بلکہ اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن حرص و ہوس کے جذبات کا اُبھار عدل و اعتدال کی اس شاہراہ سے انسان کو کوسوں دور لے جاکر اسے اختلاف و انتشار کا گرویدہ بناتے ہوئے باہمی دست و گریبان ہونے کی بھی پیش کش کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ سفاکی و بے باکی اور درندگی و بہیمیت بلکہ انسانیت کشی ہے۔

اختلاف کا علاج

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔یعنی لوگ ایک امت تھے یعنی اصل فطرت کے لحاظ سے ان میں یگانگت و اتحاد تھا اور تمدن اُن کی عین جبلت تھا۔ لیکن ان کو اختلاف و انتشار نے بے راہ روی اور امن سوزی کے تاریک گڑھے میں ڈال کر وحشت زدہ اور دہشت خوردہ بنا دیا۔ لہٰذا خدائے حکیم نے انبیاء و رسل کو شریعت اور کتاب دے کر بھیجا جو اُن کے لئے ضابطۂ زندگی اور شاہراہ امن و سکون ہو۔

بنظرِ ظاہر ان اختلافات کے قلع قمع کا جو علاج سوچا گیا ہے اس کے دو طریقے ہیں:۔ایک قانون اور دوسرا تعلیم و تربیت۔ اور اس کی مثال اس طرح ہے کہ جس طرح ایک قافلہ کسی مقصد کے حصول کے لئے کسی دُور منزل کی طرف اپنے زادِ راہ اور لوازمِ سفر کے ساتھ گامزن ہو۔ اور اثنائے طریق میں اُن کے مابین پھوٹ پڑ جائے کہ آپس میں ہتکِ عزت، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت تک کی نوبت آجائے۔ پس ان ناگفتہ بہ حالات کا جائزہ لے کر اربابِ حل و عقد یکجا ہو کر اپنے جان و مال کی خاطر کافی سوچ و بچار سے متفقہ طور پر ایک لائحہ عمل کی تشکیل دینا چاہیں تو امن و سلامتی کی بقاء ان کو دو نظریوں میں معلوم ہو گی۔ مثلاً ایک جماعت کہے گی کہ قافلہ کے تمام افراد کی شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ان کی ہر شے پر ہر شخص کو تصرف کا حق دیا جائے کیونکہ سفر کا وقت پاس کرنا ہے جب سفر ختم ہوگا تو ہمیں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ لہٰذا اس انفرادی ملکیت کا کیا فائدہ ہے جو باہمی رفاقت کے لئے باعثِ خطرہ ہو۔ پس امن و آشتی کے قیام کی واحد صورت ہے اشتراکیت۔

اور دوسری جماعت کہے گی کہ نہیں! بلکہ ہر شخص کی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایسا ضابطہ بنا لیا جائے جس کی بناء پر کوئی انسان اپنی حدودِ معینہ سے باہر نہ جاسکے اور باہمی ہمدردی اور رواداری کے اصول سے اس منزلِ سفر کو چین و آرام سے گذار لیں

وجہ اشتباہ

یہ دونوں طریقے اس نظریہ کے ماتحت ہیں کہ انسان کی زندگی صرف انہی دنیاوی چند لمحات میں منحصر ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں اور یہ صرف جہالت اور نا اندیشی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں نے انسانیت کی غرضِ خلقت سے چشم پوشی کر لی ہے کیونکہ صرف یہی چند روزہ زندگی انسان کی غرضِ خلقت نہیں۔ بلکہ اس فانی دنیا کے بعد انسان ایک غیر فانی منزل تک پہنچتا ہے اور اس منزل کی بود و باش اور آرام و امن اس چند روزہ حیاتِ فانیہ سے وابستہ ہے۔ انسان کو سمجھنا ہے کہ مجھے کس نے پیدا کیا۔ اور کیوں پیدا کیا اور میں نے کیا کرنا ہے؟ توحید سے چشم پوشی بلکہ کنارہ کشی ہی امن عالم کو جلا کر خاکستر کا ڈھیر بنانے کی ذمہ وار ہے۔ ہزار قانون بنائے جائیں لاکھ ضابطے تیار کئے جائیں لیکن حرص و ہوس جذباتِ شہویہ اور ہیجاناتِ نفسیہ جور و اعتساف اور ظلم و استبداد کی ناخوشگوار فضا سے قطعاً

باہر نہ آنے دیں گے۔ کیونکہ قہر و غضب سے کمزور طبقہ کو دبایا تو ضرور جائے گا۔ لیکن ان کی قلبی ہم آہنگی اور سچی وفاداری کی تحصیل نہایت مشکل بلکہ محال ہے نیز قانونی شکنجہ کی سخت گرفت نچلے طبقہ میں اگر ظاہری طور پر مؤثر ثابت ہو بھی جائے۔ لیکن اُوپر کا طبقہ اور با اقتدار گروہ اپنی بدعنوانیوں سے ہرگز باز نہیں آسکتا۔

ضرورتِ دین پس ان حالات کے پیشِ نظر جب تک یہ تصور نہ ہو کہ (ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی ہے اور اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ہمیں کہیں جوابدہ بھی ہونا ہے اور ہمارے لئے جہاں نیک کرداری کی جزا ہے وہاں بداعمالی کی سزا بھی مقرر ہے) تو یقیناً تمدن میں اعتدال آ ہی نہیں سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ ان تمام نزاعات و مشاجرات کا واحد علاج ہے دین۔ اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے خداوند حکیم نے انبیاء و رسل کو شریعت دے کر مبعوث فرمایا۔ جو انسانی پُرامن زندگی کے لئے مژدہ جانفزا ہے۔ اور اُخروی پُرکیف زندگی بنانے کے لئے انتہائی طور پر کامیاب دستور العمل ہے پس توحید و عدل کا عقیدہ، نبوت و امامت کا اعتقاد اور قیامت کا یقینی تصور ہی انسان کو انسانیت کے صحیح معیار پر لانے کا کفیل ہے اور اسی نظریہ کو تسلیم کرنے اور اسی کے ماتحت وضع شدہ قوانین شرعیہ کی پابندی کرنے کا نام ہے دین۔ پس دین مادہ و طبیعت پرستوں کے قول کے مطابق صرف تقلید ہی تقلید کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا ناقابلِ تردید اصولی و عقلی ضابطہ ہے۔ جس سے کوئی صاحبِ عقلِ سلیم سرِمو انکار کر ہی نہیں سکتا۔ بشرطیکہ اولاد انسان سے ہو۔ البتہ بندروں کی اولاد اسے اگر تقلید سے تعبیر کرے تو ان سے بعید بھی نہیں۔ بہرکیف قیامت کا یقین محاسبہ کا خوف اور جزا و سزا کا تصوّر ہی ہر قسم کی غلط کاریوں کا علاج اور دنیوی و اُخروی فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔

نتیجہ معاشی پہلو میں جو کچھ اختلاف ہوتا ہے وہ صرف ان ہی دو فطری تقاضوں کی نبرد آزمائی کی ہی بدولت ہے یعنی تمدّن اور استخدام و تسخیرِ موجودات اور اس اختلاف کا حل واحد ہے بعثتِ انبیاء۔

سوال: دو فطری تقاضے جب آپس میں متضاد ہیں تو خالق حکیم نے انسان کو تفویض کرنے میں کیا مصلحت رکھی ہے؟

جواب: دو فطری تقاضوں کا تضاد باعثِ عیب اور خلافِ حکمت ہوا کرتا ہے جب کہ ان کے اُوپر کوئی سلطان نہ ہو۔ لیکن جب یہ دونوں ایک حاکم بالا کے زیرِ نگیں قرار دیئے جائیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور اس کی مثالیں بہت سی مل سکتی ہیں؟

وجودِ انسان میں جو قوتیں موجود ہیں وہ اپنے اپنے مقام پر فطری حقوق رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے تصرف سے باہمی تزاحم تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جس کو بیماری کہا جاتا ہے۔ مثلاً قوتِ جاذبہ کا فطری حق ہے کہ غذا طلب کرے اور قوّتِ ہاضمہ کی فطری ڈیوٹی ہے کہ اس کو ہضم کر کے جزو بدن بننے کے اہل کرے لیکن قوتِ جاذبہ جب بے اعتدالی سے کام لیتے ہوئے حد سے بڑھ جائے تو قوّتِ ہاضمہ سے اس کا ٹکراؤ ہو جائے گا۔ یا قوتِ جاذبہ موذی غذا حاصل کرے اور قوّتِ ہاضمہ اس کو ہضم کر کے جزویتِ بدن کی حد تک پہنچا دے تو دیگر قوائے باطنیہ اس سے بُری طرح متاثر ہوں گی۔ اور نتیجہ میں نظامِ بدن

خراب ہو جائے گا۔ اسی طرح زبان کا فطری حق ہے بولنا۔ لیکن اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو نتیجہ ہوگا شر و فساد اسی طرح باقی اعضائے بدنیہ کی بعینہٖ یہی حالت ہے۔ پس ان قوتوں کو اپنے اپنے مقام پر حق فطری کے استعمال کی اجازت ہے لیکن بحدِ اعتدال اور چونکہ یہ خود ان حدود کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو خدا نے اپنی حکمتِ کاملہ سے ان کے رفع تزاحم اور دفع تہاجم کے لئے ایک سلطان و حاکم بالا اپنی طرف سے متعین فرمایا۔ جس کو لسان شرع میں رسولِ باطنی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور وہ ہے عقل۔ اور خداوند کریم نے اس رسول (عقل) کو ایک حد تک مصالح و مفاسد معلوم کرنے کی طاقت دی ہے۔ پس بدنی طاقتوں کا کام ہے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا اور عقل کا فریضہ ہے ان کو بے اعتدالیوں سے روکنا۔ اور جب تک عقل کی یہ رعایا اپنے سلطان (عقل) کے زیرِ حکم عمل پیرا رہے گی تو اس میں امن و سلامتی اور صلح و آشتی رہے گی۔ جس کے نتیجہ میں نظامِ بدن درست رہے گا۔ اور ساری رعایا کو خوش حالی نصیب ہوگی۔ لیکن جب ہی اس رعایا میں سے کسی فرد نے اپنے حاکم یعنی عقل کے سامنے علم بغاوت بلند کیا۔ اور بے راہ روی اختیار کی تو اس کا وبال صرف اسی تک محدود نہ رہے گا۔ بلکہ پوری مملکتِ بدن کی تباہی کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

پس اسی طرح نوعِ انسانی کو خدا نے ایک طرف فطری طور پر حق تمدن عطا فرمایا اور دوسری طرف حق استخدام موجودات مرحمت کیا۔ اور اعتدال و توازن قائم کرنے کے لئے رسولوں کو ان پر مسلط فرمایا۔ جن کو انسانی ضابطۂ حیات بطور وحی و الہام و کتاب و شریعت تفویض فرمایا۔ تاکہ ہر ایک اپنی اپنی حدود کے اندر رہ کر دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کی طرف اقدام کرے۔ اور عالم میں امن و سکون اور آرام و اطمینان قائم ہو۔ پس جب تک نوعِ انسانی اس نظام کے ماتحت رسولوں کی ہدایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اعتدال میں رہے گی تو نتیجہ خوشگوار ہوگا۔ لیکن بخلاف اس کے اگر انسانی افراد کل یا بعض حکومتِ الٰہیہ سے بغاوت کریں گے تو امن عالم تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

مصلحتِ جہاد

یہاں تک پہنچنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکے گی کہ ایک طرف تو انسان کا قتل گناہِ عظیم ہے اور دوسری طرف خدا کی طرف سے جہاد کا حکم وجوبی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں انسانی موت کو فراوانی دی جاتی ہے تو مثالِ گذشتہ اس سوال کو حل کرنے کے لئے کافی ہے کہ بدن کی حفاظت کے لئے ایک یا دو فاسد اور باغی عضوؤں کو بدن سے الگ کر دینا عقل کا اٹل فیصلہ ہے جو انتہائی طور پر قابلِ قبول ہے۔ کیونکہ جزوی مفاد کو کلی مفاد پر قربان کرنا بہتر ہے اس سے کہ کلی مفاد کو جزوی مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ پہلے بمقتضائے عقل فاسد حصوں کی ہمہ تن کوشش سے اصلاح کی جائے اور حتی الوسع ہر ممکن علاج سے اس کو رو بصحت لانے کی سعی بلیغ کی جائے لیکن جب علاج سے مایوسی ہو اور اس کا رو بصحت لانا ناممکن ہو اور باقی بدن کی اصلاح و بقاء اس فاسد حصہ کے معدوم کرنے میں ہو تو بلا دریغ اس کو کائناتِ بدن سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جانا عین دانائی ہے۔

پس اسی طرح نظامِ عالم کی بقاء کے لئے جن جن اصول و عقائد اور فروع و اعمال کے ضابطہ کی ترویج پر رسول مامور ہیں اگر بعض افراد اپنے مفسدانہ رویّے پر قائم رہیں اور اس ضابطہ کو تسلیم نہ کریں تو پہلے ہر ممکن طریقہ سے ان کو سمجھانا ضروری ہے اور بصورتِ ضد و ہٹ دھرمی ان کا صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینا عینِ مصلحت اور قرینِ عقل ہے۔ کیونکہ امنِ افراد پر امنِ عالم کو ہرگز قربان نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بقائے عالم پر بقائے افراد کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

دینی اختلاف

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ فطری تمدن اور صلح و آشتی کی زندگی کے پیشِ نظر یگانگت کی دولت کے مالک تھے لیکن استخدام و تسخیر موجودات کے فطری حق کی بناء پر ذاتیاتی کشمکش ان کو تفرق و تشتت کی وادی میں ڈال کر آپس میں دست و گریباں کر رہی تھی۔ پس اس مفسدہ کے قلع قمع کے لئے اور اعتدال و امن کی برقراری کے لئے خدا نے رسول بھیجے۔ پس آیت کا مقصد یہ ہوا کہ لوگ ایک امت تھے۔ یعنی ان میں فطری یگانگت تھی۔ لیکن تعیش ظاہری اور مفاد زندگی کے حصول کی خاطر بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان میں نظریاتی اختلافات رونما ہوئے تو خدا نے ان کی اصلاح کے لئے کتاب و شریعت دے کر رسول بھیجے جو اطاعت گذاروں کو مژدۂ جنت اور سرکشوں کو عذاب خداوندی میں گرفتاری کی خبریں سنائیں اور لوگوں کے باہمی اختلافات کو ہر ممکن کوشش سے ختم کریں۔ لیکن اس کے بعد فرماتا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ۔ یعنی اختلاف ہی ان لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی۔ بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل و براہین پہنچ چکیں اور یہ اختلاف صرف ازراہِ بغاوت ہی تھا۔

پہلا اتحاد، اتحادِ فطری تھا اور اس پر متفرع اختلاف بھی اختلافِ فطری تھا۔ جس کا تعلق معاشی پہلو سے تھا اور اس کو رفع کرنے کے لئے انبیاؑ کی بعثت ہوئی۔ اب یہ اختلاف، اختلافِ فطری نہیں بلکہ ازراہِ بغاوت و عناد ہے۔ جو بعثتِ انبیاؑ کے بعد امتوں میں رونما ہوا۔ وہ اختلافِ معاشیات میں بے راہ روی کا نتیجہ تھا اور یہ اختلاف دینیات میں بے جا تصرفات سے ظاہر ہوا۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ اس اختلاف کی ذمہ داری اُن افراد پر عائد ہوتی ہے۔ جن کو کتاب دی گئی۔ پہلی قسم کا اختلاف فطرت کا تقاضا تھا۔ لہذا اس کے لئے خالقِ فطرت نے انبیاء و رسل کا انتظام فرمایا۔ لیکن دوسرا اختلاف چونکہ صرف عناد و سرکشی کی پیداوار تھا۔ لہذا اس کا علاج افہام و تفہیم یا ڈانٹ ڈپٹ یا عذابِ اخروی کی وعید سے کافی سمجھا گیا۔

ضرورتِ نبی

گذشتہ بیان سے واضح کر دیا جا چکا ہے کہ انسان طبعی و فطری طور پر استخدام و تسخیر موجودات کا حق رکھتا ہے اور اس کی بدولت انسان کی معاشی زندگی میں اختلاف و فساد کی بنیاد پڑتی ہے لہذا اجتماعی زندگی اور تمدنی بقا کے لئے قوانین کی ضرورت

ہے۔ جن کی پابندی انسان کو اپنے کمال وسعادت پر فائز کر سکے۔ پس ایسے قوانین کی تشکیل یا تو خود فطرت ہی کریگی یا کوئی ایسی ذات کرے گی جو فطرت کے تقاضوں کو جاننے والی اور اس کی تمام تر صلاحیتوں پر نگاہ رکھنے والی ہو۔ تو ظاہر ہے کہ فطرت جو خود منبع ہے ان تمام اختلافات کا وہ رفع اختلاف کا زینہ نہیں ہو سکتی۔ لہذا فطرتِ انسانی کے علاوہ ہی وہ ذات ہونی چاہیئے جو اصلاحِ انسانیت کے لئے قوانین مرتب کرے تو وہ سوائے خالق کائنات کے اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ پس ضروری ہے کہ خدا اپنے انتخاب سے ایسے افراد کو اصلاحِ خلق کے لئے مامور فرمائے جن کو ان قوانین کا پوری طرح علم دیا گیا ہو۔ اور وہ ان قوانین کے نفاذ میں بلا لومۃ لائم اپنی خدمات پیش کرنے والے ہوں۔ پس نبوّت وہ عہدۂ جلیلہ ہے جو خدا اصلاحِ خلق کے لئے کسی اپنے خاص بندے کو عطا فرماتا ہے۔ اور اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس کو خُدا یہ عُہدۂ جلیلہ عنایت فرمائے گا وہ خود اس قسم کی بے اعتدالیوں سے پاک و منزہ ہوگا۔ جن کی اصلاح کے لئے وہ مبعوث ہُوا ہے۔ ورنہ اگر اس عہدہ پر فائز ہونے والا بھی عام لوگوں کی طرح جور و اعتساف سے کام لینے والا ہو۔ تو اس کی اصلاح کے لئے کسی دوسرے مصلح کی ضرورت ہوگی اور اگر وہ بھی ویسا ہو تو پھر اس کے لئے کسی تیسرے کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ اور اسی کو تسلسل کہتے ہیں جو کہ اتفاقاً محال ہے نیز اگر فرستادہ خدا خود اُمّت کی غلط کاریوں سے ملوث ہو تو اس کے موعظہ کا عامۃ الناس پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ لہذا اس کی بعثت خالی از فائدہ ہوگی۔ نیز ایک غلط کار انسان پر اصلاحی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنا کسی عام عاقل انسان سے بعید از قیاس ہے۔ چہ جائیکہ خداوندِ حکیم ایسے فعل کا ارتکاب کرے۔ کیونکہ نہ سدھرے ہوئے کو دوسروں کے سدھارنے پر مامور کرنا وقارِ علم وحکمتِ ذاتِ اقدسِ الٰہی پر ایک ایسا بدنما دھبّہ ہے جو چہرۂ توحید و دامنِ عدل کو تشکیک و شبہات کی بے پناہ تاریکی و سیاہی میں پوشیدہ کرنے کے لئے کافی ہے پس ثابت ہُوا کہ اصلاحِ خلق کے لئے خداوندِ عدل و حکیم کی طرف سے ایسے افراد مامور بہ تبلیغ ہوں۔ جن کا دامن ہر قسم کی غلط کاریوں سے پاک و منزہ ہو۔ بلکہ جس رستہ پر چلنے کی دعوت دینے کے لئے مامور ہوں وہ خود اس پر اس طرح گامزن ہوں کہ اس راستہ پر اُن کی اُمت میں سے ان سے سابق کوئی نہ ہو۔ اور اسی کو عصمت کے مقدس نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم نے مقدمہ تفسیر انوار النجف میں ایک مستقل باب کے ذیل میں اس مسئلہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز اس بحث کی کی تفصیل کیلئے ہماری کتاب "اسلامی سیاست" کا مطالعہ ضروری ہے۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ

کیا تم نے گمان کیا ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور نہ آئے گی تم پر آزمائش (مثل ان لوگوں کے جو تم سے پہلے گزر

مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى

چکے ہیں۔ جن کو مس کیا سختی اور تکلیف نے۔ اور ان کو جھنجوڑا گیا حتیٰ کہ پکار اٹھے رسولؐ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے

نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسۡــَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ

کہ کب آئے گی اللہ کی مدد ؟ آگاہ ہو تحقیق اللہ کی مدد قریب ہے آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں ۔ فرما دیجئے

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ : شانِ نزول :- بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنگ خندق کے موقعہ پر اور بعض کہتے ہیں کہ جنگِ اُحد کے موقعہ پر نازل ہوئی جبکہ مومنین شدت اور تکلیف سے گھبرا گئے تھے خدا نے اُن کو یہ آیت بھیج کر تسلی دی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مہاجرین جب اپنا وطن ترک کر کے مصائب جھیل کر مدینہ میں وارد ہوئے تو اُن کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ۔

جناب رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے :- حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ ۔ یعنی جنّت مصائب میں گھری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات کے اندر محصور ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ جنّت میں پہنچنے کے لئے مصائب کو جھیلنا پڑتا ہے اور شہوات کی اتباع جہنّم تک پہنچاتی ہے ۔ تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ میں نے بعض حواریین کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا ہے ۔ اے فرزندِ آدم جب خدا تجھے مصائب میں مبتلا کرے تو خوش ہو کیونکہ یہ طریقہ انبیاء و اولیاء کا ہے اور جس وقت تجھے آسودگی و خوشحالی حاصل ہو تو غمزدہ ہو کیونکہ تیرے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو انبیاء و اولیاء کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا اور جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جنّت میں بعض درجات ایسے ہیں جو نیک اعمالیوں سے حاصل نہیں ہو سکتے ۔ بلکہ وہ مصائب و آلام میں صبر کرنے والوں کے لئے ہیں ۔ یہانتک کہ انسان جب اُن مراتب کو دیکھے گا تو کہے گا کہ کاش دنیا میں میرا جسم مقراضں سے ریزہ ریزہ کیا جاتا تاکہ مجھے یہ درجات نصیب ہوتے ۔ بہرکیف مصائب و آلام پر صبر کرنے کے درجات زیادہ ہیں ۔ خداوند کریم تمام مومنین کو آئمہ طاہرین علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور مصائب پر صبر کی طاقت عنائت کرے ۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الصَّابِرِيْنَ وَاحْشُرْنَا فِىْ زُمْرَةِ الصَّابِرِيْنَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ ۔

اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ
جو بھی خرچ کرو۔ خیر سے پس والدین اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔
السَّبِيۡلِ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ
اور جو بھی نیکی کرو پس تحقیق اللہ اس کو جانتا ہے فرض کیا گیا تم پر لڑنا حالانکہ
الۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ
وہ ناپسند ہے تم کو اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو ایک چیز کو اور (درحقیقت) وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور ہو سکتا ہے کہ
تُحِبُّوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ ع ۱۰
تم چاہو ایک شے کو اور (درحقیقت) وہ بری ہو تمہارے لئے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

يَسۡـــَٔلُوۡنَكَ :۔ مجمع البیان میں اس کے شان نزول کے متعلق لکھا ہے کہ ایک شخص جس کا نام عمرو بن جموح تھا بہت بوڑھا اور مالدار تھا، خدمتِ سرکارِ رسالتؐ میں پہنچ کر عرض کی۔ یارسول اللہ! میں کون سی چیز راہ خدا میں خرچ کروں اور کیسے لوگوں کو دوں تب یہ آیت اتری۔ گویا نزول اس کا اس ایک واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن حکم اس کا قیامت تک کے لئے جاری ہے اور باقی احکام قرآنی بھی سب اسی طرح ہیں۔

مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ :۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زکوٰۃ کا حکم ہے۔ لیکن زکوٰۃ کا مصرف چونکہ والدین نہیں ہوا کرتے لہذا اس کو صدقاتِ واجبہ و مستحبہ سے عام قرار دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہوا کرتا ہے جب وہ احتیاج رکھتے ہوں۔ حالانکہ زکوٰۃ نہیں لے سکتے اور علامہ طبرسی نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

وَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ :۔ کیونکہ جنگ میں فتح کی صورت میں کامیابی کی خوشی اور مالِ غنیمت کا حصول ہوتا ہے۔ اور قتل کی صورت میں شہادت و جنت عطا ہوتی ہے۔ پس ہر دو صورتیں خیر ہیں۔

وَهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ :۔ دنیاوی برائی یہ ہے کہ فقر و فاقہ کی ذلت کے علاوہ ہمیشہ کفار سے سہمے رہنا بدترین زندگی ہے اور اخروی خسارہ یہ ہے کہ نعماتِ آخرت سے ان کو قطعاً محروم کیا جائے گا

مسئلہ :۔ جہاد واجب کفائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سارے مسلمان ترک کر دیں تو سب گنہگار ہوں گے اور اگر اس قدر مسلمان مصروفِ جہاد ہو جائیں جو دشمن کے مقابلہ کے لئے کافی ہوں تو باقیوں سے وجوب ساقط ہے بشرطیکہ امام وقت کا خصوصی حکم کسی فرد کے لئے صادر نہ ہو ورنہ اس فرد پر جہاد واجب عینی ہو جائے گا۔

سوال وجواب

یہ آیت بتلاتی ہے کہ مومنین پر حکم جہاد گراں تھا اور وہ دل سے اس کو نہ چاہتے تھے حالانکہ دوسرے مقام پر مومنین کی جو مدح ثنائی کی گئی ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مومنین راہِ خدا میں جان و مال بلکہ ہر قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرتے ہونگے جیساکہ تاریخ کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں اور اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں۔

(۱) مومنین کے دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو اپنے ایمان میں صادق تھے اور اسلام کی حقانیت وصداقت ان کی دلوں کی گہرائیوں میں اتری ہوئی تھی وہ خُدا و رسولؐ کے ہر حکم پر مٹنے والے تھے اور قرآن مجید میں جہاں جہاں مومنین کی دقیع الفاظ میں مدح کی گئی ہے اس سے مراد یہی طبقہ ہے اور دوسرے وہ تھے جو ظاہر طور پر دعویٰ ایمان کرتے تھے۔ لیکن اُن کی زبان پر کلمۂ حق کا جاری ہونا ان کی دل کی آواز نہیں تھا۔ اور اکثر مقامات پر ایسوں کی قدح بھی کی گئی ہے اور ان کو عتابانہ خطاب سے بھی مخاطب کیا گیا ہے چنانچہ جنگ اُحد، بدر، خندق کی آیات اس کی گواہ ہیں۔ پس یہاں بھی جن کی طرف جہاد کی کراہت منسوب ہے وہ یہی گروہ ہے۔

(۲) ابتدائے اسلام میں چونکہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی اسلحہ جنگ بھی ناکافی تھا اور کفار میں جنگی اسلحہ اور باقی فوجی طاقت کی کمی نہ تھی۔ لہٰذا اسلام کا حلقہ بگوش طبقہ دل سے اس امر کا خواہاں تھا کہ جنگ کو مؤخر کر دیا جائے۔ یہانتک کہ مسلمانوں کا حلقہ وسیع ہو جائے اور فوجی قوت دشمن کے مقابلہ میں درجہ کمال کو پہنچ جائے تاکہ مقابلہ کے بعد ناکامی کی رسوائی سے دوچار نہ ہونا پڑے پس ان کا اس وقت جنگ کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا اسلام کی سربلندی کے لئے تھا تو خداوند کریم چونکہ انجام سے دانا بینا ہے اُس نے ان کے اس نظریہ کی تردید اس لہجہ میں فرمائی کہ مجھے انجام معلوم ہے اور تمہیں معلوم نہیں اور گویا جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو یعنی فوری جہاد اسی میں تمہاری بھلائی کا راز مضمر ہے۔

(۳) مومنین جہاد کے حکم کو بزدلی کی بنأ پر ناپسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو وسعتِ اسلام محبوب تھی وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ بجائے قتل وغارت کے ان کفار کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے تو نفوسِ انسانیہ ہلاکت سے بچ جائیں گے۔ اور دوسری طرف اسلام کے دائرہ میں وسعت ہو جائے گی۔ پس خداوند کریم نے ان کو اس طرح سے رد فرمایا کہ میں چونکہ رازہائے دل سے واقف ہوں اور تمہیں پتہ نہیں ہے تم خواہ کتنی ہی کوششیں کرو خاک فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ حسد وعناد کی بنا پر اسلام کے حلقہ بگوش ہرگز نہ ہوں گے اور ہٹ دھرمی کو کسی قیمت پر نہ چھوڑیں گے اور دریں حالات چونکہ ان کا تخریبی پہلو نوعِ انسانی کے لئے وبالِ زندگی ہے اور امنِ عامہ کے لئے پیغامِ موت ہے لہٰذا افراد کو نوع پر قربان کرنا اس سے بہتر ہے کہ افراد کی خاطر نوعِ انسانی کو خطرہ میں ڈال دیا جائے ان کی مثال بدن انسانی کے اس عضوِ فاسد کی سی ہے جس میں کوئی علاج کارگر نہ ہو اور بدن کی سلامتی کا دارومدار اس کے کاٹ دینے میں ہو۔ لہٰذا ان سے ایمان کی توقع رکھنا اور اصلاح کی امید کرنا فضول ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ

آپ سے دریافت کرتے ہیں حرمت والے مہینے میں لڑائی کے بارے میں۔ فرما دیجئے کہ اس میں لڑائی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اللہ کی

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ

راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد الحرام سے روکنا اور اس کے اہل کو وہاں سے نکال

اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى

دینا گناہِ اکبر ہے اللہ کے نزدیک اور فتنہ (کفر) بہت بڑا گناہ ہے قتل سے ہمیشہ (اہلِ مکہ) تم سے برسرِپیکار رہیں گے یہاں تک

يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ

کہ تمہیں پلٹا دیں تمہارے دین سے اگر ان کے بس میں ہو اور جو شخص مرتد ہو جائے تم میں سے اپنے

دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

دین سے۔ پس وہ مر جائے حالتِ کفر میں تو پس ایسے لوگوں کے اعمال ضائع ہو گئے دنیا اور آخرت میں

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

اور وہ لوگ اصحابِ جہنم ہیں درحالیکہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

بلکہ اُن کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی اسلام کی سربلندی اور دینِ خدا کی سرفرازی کا موجب ہے پس چونکہ وہ جہاد سے گریزاں اور صلح کے خواہاں تھے تو خدا نے اُن کے ہر دو نظریوں کی اپنے علم اور اُن کی بے علمی کے حوالہ سے تردید فرما دی۔ اور اسی نکتہ کے پیشِ نظر لفظِ عسٰی کا تکرار بھی فرمایا ہے۔

رکوع ۱۱

يَسْـَٔلُوْنَكَ :- اس کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب جناب رسولِ خداؐ ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تو انہوں نے اطراف و نواح میں سریئے (چھوٹے لشکر) روانہ فرمائے۔ چنانچہ ایک سریہ جو آٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ عبداللہ بن جحش کی زیرِ قیادت (جو کہ آپؐ کا پھوپھی زاد تھا، مقامِ نخلہ کی طرف روانہ فرمایا (اور یہ جنگِ بدر سے دو ماہ قبل ہجرت کے بعد سترھویں ماہ کا واقعہ ہے) تاکہ طائف

سے آنے والے قافلہ قریش کی سرکوبی کریں اور اُن کا مال بطور غنیمت قبضہ میں لیں۔ قریش کا جو قافلہ طائف سے آرہا تھا اُن کا سرکردہ عمرو بن عبداللہ حضرمی تھا۔ جو عتبہ بن ربیعہ کا ہم قسم تھا اور ماہ جمادی الآخری کے آخری دن ان ہر دو قافلوں کا آپس میں تصادم ہُوا۔ اور درحقیقت یہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ لیکن مسلمان اس کو جمادی الاخری کا آخری دن سمجھے ہوئے تھے۔ عمرو بن عبداللہ حضرمی مارا گیا اور مسلمانوں نے اُن کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا اور مدینہ واپس آگئے۔ کفار نے طعن و تشنیع شروع کی کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینے (ماہ رجب) میں جنگ کو حلال کر دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالتمآبؐ نے عبداللہ بن جحش سے ماجرا پوچھا۔ تو اس نے عرض کی۔ حضورؐ! ہم نے جمادی الاخری کی آخری تاریخ سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ بہرکیف حضورؐ نے وہ لوٹا ہُوا مال و اسباب واپس کر دیا۔ اس کے بعد صحابہ نے ماہ حرام میں جنگ کرنے کے متعلق آپ سے دریافت کیا۔ نیز کفار قریش کا ایک خط بھی آنحضورؐ کے پاس پہنچا تو خداوند کریم نے یہ آیت بھیجی۔ کہ بے شک حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور کفر کرنا اور مسجد الحرام سے روکنا اور وہاں سے اس کے اہل کو نکال دینا (جس طرح اہلِ مکّہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیا) یہ چیزیں گناہِ اکبر ہیں اور شرک کا گناہ قتل کے گناہ سے بہت زیادہ ہے۔

مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ :۔ مرتد کے اعمال سابقہ کے ضائع ہونے کے متعلق جہاں تک اس آیتِ مجیدہ سے ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ارتداد پر اس کی موت آجائے۔ ورنہ اگر ارتداد کے بعد مرنے سے پہلے توبہ کرلے اور اپنے سابق کئے پر نادم ہو جائے تو مفہوم آیت سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے اور اس کو اپنے اعمالِ صالحہ کا بدلہ دیا جائے گا۔ گویا ارتداد سابقہ اعمال کی موت ہے اور توبہ ان کو دوبارہ زندہ کر دیتی ہے جبھی تو کہا جاتا ہے کہ مرتد پر اپنے زمانۂ ارتداد میں فوت شدہ عبادات کی قضا بھی واجب ہے۔ جس طرح کہ ظاہری حکومتوں میں حکومت کے باغی افراد کی گذشتہ تمام خدمات کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے اور اسے گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ نادم ہو کر آئندہ کے لئے حکومت سے وفاداری کا عہد کرلے تو اس کی تن بخشی ہو جایا کرتی ہے۔ بشرطیکہ حکومت کو اس کے عہد و پیمان پر اطمینان بھی ہو جائے۔ اسی طرح حکومتِ الٰہیہ جو اساس عدل اور معیار انصاف پر مبنی ہے اس کے باغی کی تمام تر نیکیوں پر قلم نسخ پھیر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب توبہ کرلے اور دل و جان اپنے خالق سے طالب عفو ہو جائے تو بتقاضائے عدل و انصاف اور بمقتضائے کرم وجود اس کی توبہ کے لئے دامنِ عفو خداوندی میں گنجائش ہے تو پس اس کے اعمال قابلِ جزا ہوں گے۔ بشرطیکہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔

مُرتد کی قسمیں

علماء نے مرتد کی دو قسمیں کی ہیں ۱۔ مرتد ملّی ۲۔ مرتد فطری۔ مرتد ملّی وہ ہے جو کافر والدین کے گھر پیدا ہو کر بعد میں باختیار خود دائرہ اسلام میں داخل ہو اور پھر دوبارہ کفر کی طرف پلٹ جائے۔

مرتد فطری اس کو کہتے ہیں جو مسلمان والدین کو ہاں پیدا ہُوا ہو یا اس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک اس کے انعقادِ نطفہ کے وقت مسلمان ہو لیکن بعد میں وہ عقیدہ چھوڑ کر کفر میں داخل ہو جائے۔

مسئلہ :۔ مرتد ملّی کا حکم یہ ہے کہ اس سے توبہ طلب کی جائے اور اس کی توبہ ظاہری اور اُخروی ہر دو لحاظ سے قابلِ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ

تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا راہِ خدا میں وہ لوگ

يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

اُمیدوار ہیں رحمتِ خدا کے اور خدا غفور رحیم ہے آپ سے دریافت کرتے ہیں شراب اور جوئے کے متعلق

قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۗ

فرما دیجئے کہ ان میں گناہ کبیرہ بھی ہے اور نفع بھی ہے لوگوں کیلئے اور گناہ اُن کا اُن کے نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ

اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو فرما دیجئے کہ بچت اس طرح بیان فرماتا ہے خدا تمہارے

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۹﴾

لئے آیات کو۔ تاکہ تم سوچو

قبول ہے دنیاوی لحاظ سے اس کی توبہ کے قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مقدار زمان عدّت کے اندر اس کی عورت اس کو واپس مل جائے گی اس کی جائیداد تقسیم نہ ہو گی اور اس سے قتل کا حکم برطرف کر دیا جائے گا اور اُخروی لحاظ سے توبہ قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُخروی جزا کا بھی حقدار رہے گا۔ لیکن اگر اس عرصہ کے اندر توبہ نہ کی تو واجب القتل قرار دیا جائیگا اس کی عورت اس سے آزاد اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ مرتد فطری کی ظاہری طور پر توبہ قبول نہیں بلکہ مرتد ہوتے ہی اس کی عورت اس سے بائن اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم ہو جائے گا۔ اور اگر حکومت شرعی ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ البتہ اُخروی طور پر اگر صدق دل سے توبہ کرے تو بعید نہیں کہ رحمتِ خداوندی اس کو اپنے سایہ میں لے لے اور عذاب آخرت اس سے برطرف کر دے۔

شراب و جُوئے کی حرمت کا بیان

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا :۔ جو لوگ ایمان لائے اور مہاجر بھی ہوئے اور مجاہد بھی رہے ان کے اللہ کے نزدیک بلند درجات ہیں اور وہ جنتی ہیں۔ لیکن بشرطیکہ اُن کا خاتمہ بھی ایمان پر ہو جائے۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ: حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ شراب کی حرمت کیلئے پہلے پہل یہ آیت اتری۔ پس اس آیت کے آنے سے لوگوں کو شراب اور جوئے وغیرہ کی حرمت کا احساس ہوگیا اور اس سے بچنے کے متعلق سوچنے لگے۔ پھر اس کے بعد حتمی حکم نازل ہوا جس میں شراب، جوئے انصاب اور ازلام کو رجس اور عملِ شیطان کہا گیا اور پھر ان سے اجتناب کا حکم دیا گیا۔ اور یہ آیت شراب وجوا کی حرمت کے لئے پہلی سے سخت تر ہے اس کے بعد تیسری آیت خدا نے نازل فرمائی جس میں شراب اور جوئے کا ذکر خدا اور نماز وغیرہ سے روکنے والا قرار دیا گیا۔ گویا شراب اور جوئے کی حرمت کے ساتھ وجہ حرمت بھی بیان فرمائی اور یہ پہلی دو آیتوں سے شراب وجوئے کی حرمت میں سخت تر ہے اور ان سب کے بعد خداوند کریم نے ایک اور آیت نازل فرمائی۔ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ یعنی بجز اس کے نہیں کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فاحش چیزوں کو جو ظاہر ہیں یا باطن اور گناہ کو اور بغاوت کو جو بغیر حق کے ہو۔

اس آیت میں خداوند کریم نے سابقہ تینوں آیتوں کے امتناعی حکم کی وضاحت فرمادی۔ کیونکہ پہلی آیت میں شراب اور جوئے کو اِثم کے لفظ سے تعبیر فرمایا تھا کہ یہ دونوں چیزیں گناہ (اثم) ہیں اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے بعض منافع بھی ہیں اب اس آیت میں اِثم کو حرام قرار دے دیا۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ خداوند کریم مخلوق پر جس چیز کو حرام کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کے حکم میں شدت کرتا ہے تاکہ آہستہ آہستہ لوگ عادی ہو جائیں اور یہ اس کی بہترین تدبیر ہے (کیونکہ پہلے صرف اتنا فرمایا کہ اس میں گناہ بھی ہے اور نفع بھی لیکن نفع کے مقابلہ میں گناہ زیادہ ہے تو اس کو سنتے ہی لوگ اس کے منع ہونے کو بھانپ گئے تو دوسری آیت میں حکم ہوگیا کہ فَاجْتَنِبُوْهُ یعنی اس سے بچو پھر تیسری آیت میں مصلحت بھی فرمادی کہ کہ یہ امورِ خیر ذکرِ خدا و نماز وغیرہ سے روکنے والی چیزیں ہیں اور چوتھی آیت میں صاف حرمت کا فتویٰ صادر فرمادیا)

ایک روایت میں علی بن یقطین سے مروی ہے کہ مہدی عباسی خلیفہ نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے عرض کی کہ مولا! خدا نے قرآن مجید میں شراب نوشی سے منع کیا ہے لیکن یہ نہیں کہا کہ "شراب حرام ہے"۔ آپ نے فرمایا۔ بلکہ خدا نے قرآن میں شراب کو حرام فرمایا ہے۔ مہدی نے دریافت کیا کہ کہاں؟ آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (سوائے اس کے نہیں کہ خدا نے حرام قرار دیا برائیوں کو جو ظاہر ہوں یا باطن اور گناہ اور بغاوت جو بغیر حق کے ہو)۔ برائی ظاہر سے مراد اعلانیہ زناکاری جس طرح قحبہ خانوں کا قیام اور ان میں آمدورفت کا سلسلہ۔ اور باطنی برائی سے مراد ہے کہ باپ کی منکوحہ بیٹے کو نہیں آسکتی)

(اقول۔ جو عورت مرد پر حرام ہو۔ اسی کے ساتھ بدکاری ممنوع ہے لیکن امام پاک نے ایک جزئی بیان فرمادی کیونکہ خلفائے عباسیہ اسی مرض میں مبتلا تھے۔) اور اِثم سے مراد ہے شراب۔ کیونکہ خدا نے فرمایا۔ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ پس قرآن مجید میں اِثم کا اطلاق شراب اور جوئے پر ہوا ہے۔ اور اس کو

خدا نے حرام کیا ہے پس مہدی عباسی نے سنتے ہی علی بن یقطین سے متوجہ ہو کر کہا:۔ هٰذِهٖ فَتْوٰی هَاشِمِیَّةٌ (یہ ہاشمی فتوے ہے)

مجمع البیان میں ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا کہ شراب کے بارے میں خداوند کریم نے دس آدمیوں کو ملعون قرار دیا ہے (۱) خریدنے والے کو (۲) اس کو جس کے لئے خریدا جائے (۳) نچوڑنے والے کو اور جس (۴) کے لئے نچوڑا جائے (۵) پلانے والے کو (۶) پینے والے کو (۷) اٹھانے والے کو (۸) اور جس کی طرف اٹھا کر لے جائے (۹) اور بیچنے والے کو (۱۰) کاشت کرنے والے کو۔

ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ شراب پینے والا مثل بت پوجنے والے کے ہے اور منقول ہے کہ جنابِ رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ میری امت میں دس قسم کے لوگ ایمان کا دعوے کرتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔

(۱) تارکِ نماز (۲) تارکِ زکوٰۃ (۳) سود خور (۴) زانی (۵) شرابی (۶) چغل خور (۷) فتنہ باز (۸) گلہ کرنے والا (۹) ہمسایوں کو دکھ دینے والا (۱۰) ظالموں سے تعلق قائم کرنے والا تاکہ کسی کو مصیبت میں پھنسائے۔

اَلْمَیْسِرُ:۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نرد اور شطرنج، میسر کی قسمیں ہیں اور جناب رسالتمآب سے میسر کا معنی پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہر وہ شے جس میں جیت ہار کا مقابلہ ہو پس وہ جوا ہے۔ حتیٰ کہ گوٹیاں اور اخروٹوں سے کھیلنا بھی جوا بازی میں داخل ہے: تاش بازی جس کا ہمارے ملک میں عام رواج ہے۔ یہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔ کہ شطرنج کا بیچنا، اس کی قیمت کا کھانا حرام ہے۔ اس کا خریدنا کفر ہے اس کے ساتھ کھیلنا شرک ہے اور اس کو ہاتھ لگانا ایسا ہے جس طرح سؤر کے گوشت کو ہاتھ لگایا جائے۔ لہٰذا جس طرح سؤر کے گوشت کو ہاتھ لگانے کے بعد بغیر دھونے کے نماز نہیں ادا کی جا سکتی۔ اسی طرح شطرنج کو ہاتھ لگانے کے بعد بھی بغیر ہاتھ دھوئے نماز نہیں ہو سکتی اور شطرنج کی طرف نظر کرنا ایسا ہے جس طرح اپنی ماں کی شرمگاہ کی طرف نظر کرنا۔ شطرنج کھیلنے والے پر سلام کہنا گناہ ہے اور شطرنج کھیلنے والوں کے پاس بیٹھنا دوزخ میں لے جاتا ہے۔ (حدیثوں میں شطرنج کا نام بطور مثال کے ہے ورنہ تمام اُن چیزوں کا یہی حکم ہے جو میسر کے حکم میں داخل ہیں۔ جیسے گوٹیاں کھیلنا اور اخروٹ بازی اور تاش وغیرہ) (خداوند کریم تمام مومنین کو ان روحانی امراض سے محفوظ رکھے۔

قُلِ الْعَفْوَ:۔ عفو کا معنی ہے جو اپنے اور بال بچوں کے اخراجات سے بچ جائے۔ یا اس کا معنی ہے درمیانہ، یعنی نہ اسراف نہ بخل۔ احادیثِ اہلبیت میں دونوں معنے وارد ہوئے ہیں۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن

دنیا و آخرت کے متعلق اور آپ سے دریافت کرتے ہیں یتیم بچوں کے متعلق فرما دیجئے کہ اصلاح ان کے مال کی

تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

اچھی ہے اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو تو تمہارے بھائی ہیں اور خدا جانتا ہے فساد کرنے والے کو اصلاح کرنیوالے سے۔ اور اگر چاہتا خدا

لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾

تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ تحقیق اللہ غالب و دانا ہے

یتیموں کے مال کی حفاظت کا بیان

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ :۔ یتیم کے مال کی حفاظت واجب ہے اور اس کے مال میں خیانت کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اگر ایک شخص یتیموں کے اموال کی دیکھ بھال کے لئے اس قدر مصروف ہو کہ اس کو اپنے لئے کسب معاش کی فراغت ہی نہ مل سکتی ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ یتیموں کے مال سے ضرورت کے مطابق کھا پی لے۔ لیکن اگر یتیموں کا مال تھوڑا ہو تو پھر اس کو ان کے مال سے کچھ بھی نہیں کھانا چاہیئے۔ ابو صباح کنانی راوی حدیث نے عرض کی کہ حضورؑ! خدا فرماتا ہے :۔ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ۔ یعنے اگر تم یتیموں کا مال اپنے مال سے ملا دو۔ تو وہ تمہارے بھائی ہیں یعنی اس میں حرج نہیں" تو آپؑ نے فرمایا :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کے لئے نسبت لگا کر ان کا اور اپنا سامان خورد و نوش ملا لو۔ اور پھر کھانا اکٹھا تیار کر کے اکٹھا کھا پی لو۔ راوی نے عرض کی :۔ حضورؑ! اگر یتیموں میں بعض چھوٹے اور بعض بڑے ہوں۔ بعض کے لباس کا خرچ زیادہ اور بعض کا کم۔ اسی طرح بعض کم کھاتے ہوں اور بعض زیادہ تو پھر کس طرح نسبت قائم ہو گی؟ آپؑ نے فرمایا۔ کہ لباس کے لئے سب کا حساب جدا جدا ہونا چاہیئے۔ لیکن کھانے میں سب کو یکساں نسبت سے رکھا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ چھوٹا بڑے سے زیادہ کھا جاتے (یا اس کے برابر کھاتے)

عبداللہ بن یحییٰ کاہلی سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ بعض اوقات ہم اپنے ایک بھائی کے ملنے کے لئے جاتے ہیں اور ان کے پاس یتیم ہوا کرتے ہیں، ہم ان کے بستروں پر بیٹھتے ہیں اور بعض اوقات وہ ہم کو کھانا بھی کھلاتے ہیں حالانکہ اس میں یتیموں کا مال ملا ہوا ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ

اور نکاح کرو مشرکہ عورتوں سے یہاں تک کہ ایمان لائیں اور البتہ مومنہ لونڈی بہتر ہے مشرکہ آزاد عورت سے اگرچہ وہ تمہیں

اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

بھلی معلوم ہو اور نکاح کر دو مشرکوں کو (مومنہ عورتیں) یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور البتہ غلام مومن بہتر ہے (آزاد) مشرک سے

وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ

اگرچہ وہ تم کو پسند بھی ہو (کیونکہ) وہ لوگ دعوت دیں گے طرف دوزخ کے اور خدا دعوت دیتا ہے طرف جنت اور

الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

بخشش کے ساتھ اپنے اذن کے۔ اور بیان فرماتا ہے اپنی آیات کو لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

آپؑ نے فرمایا کہ اگر تمہارا جانا ان کی مصلحت و منفعت کے لئے ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر تمہارے جانے میں ان کی کوئی مصلحت و فائدہ نہیں تو پھر تمہارے لئے ایسا کرنا جائز نہیں اور اس چیز کو ہر انسان خود سمجھ سکتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ :- اس فقرہ سے جبریہ کا قول باطل ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے کیونکہ اس صورت میں کسی فعل بد کے مرتکب کو نیکی کا حکم دینا، مشقت میں ڈالنا تو بجائے خود ایک ناشدنی امر کی تکلیف دینا ہے اور خدا جب بندے کو مشقت میں ڈالنا پسند نہیں فرماتا۔ تو اس کو امرِ محال کی تکلیف کیسے دے سکتا ہے؟

مومن کا کافر سے رشتہ ناجائز ہے

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ :- اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق صاحب مجمع البیان نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک شخص مرثد ابن ابی مرثد غنوی کو جناب رسالتمآبؐ نے مکہ روانہ کیا تاکہ وہاں سے مسلمانوں کو نکال کر مدینہ منورہ کی طرف لائے اور یہ طاقتور اور بہادر آدمی تھا پس جب یہ مکہ میں پہنچا تو اس نے اپنا کام شروع کر دیا وہاں ایک عورت تھی جس کا نام عناق تھا۔ زمانِ کفر و جاہلیت میں مرثد بن ابی مرثد کے اس عورت سے ناجائز تعلقات تھے جب اس عورت کو مرثد کے مکہ میں پہنچنے کی خبر ہوئی تو وہ اس کے پاس آئی اور اس سے فعل بد کے ارتکاب کی خواہش کی لیکن اس نے زنا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس عورت نے خواہش کی کہ میرے ساتھ نکاح کر لو۔ مرثد نے جواب دیا کہ جب تک میں

جناب رسالتمآبؐ سے اجازت نہ لوں گا تیرے ساتھ نکاح بھی نہیں کر سکتا۔ پس جب وہاں سے فارغ ہو کر واپس مدینہ آیا تو جناب رسالتمآبؐ سے اس عورت سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ مشرکہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ خواہ آزاد مشرکہ عورت خوبصورت ہی ہو اور تمہیں پسند بھی ہو۔

مسئلہ:۔ مذہب شیعہ کا متفقہ فتوے ہے کہ کافرہ عورت خواہ اہل کتاب سے ہو یا مشرکین سے اس کے ساتھ نکاح دائمی کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ البتہ کافرہ کتابیہ کے ساتھ متعہ کرنا جائز ہے۔

وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنوں کے لئے جائز نہیں کہ مومنہ عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں دے دیں تو گویا مومنہ عورت کا نکاح کافر مرد سے خواہ اہل کتاب سے ہو یا ہونا جائز ہے اور یہ مذہب امامیہ کا متفقہ فیصلہ ہے۔

أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ۔ مشرکوں، کافروں سے مومنہ عورت کے نکاح کے ناجائز ہونے کی وجہ بیان فرمائی کہ چونکہ مرد، عورت پر غالب اور حاکم ہوتے ہیں جب مومنہ عورت ان غیر مومن مردوں کے نکاح میں چلی جائے گی۔ تو غیر مومن مرد اپنی فطرت فاسدہ اور طینت خبیثہ کے ماتحت اپنی زوجہ مومنہ کو دین حق کے ترک کرنے پر مجبور کریں گے اور اگر وہ بالفرض مجبور نہ بھی کریں تو چونکہ عورت نے محکومی کی زندگی بسر کرنی ہے لہٰذا رفتہ رفتہ مرد کے اثرات قبول کرتے کرتے اسی کے اعتقادات کو اپنائے گی اور دین حق سے برگشتہ ہو جائے گی یا یہ کہ مرد کی خوشامد کے لئے اور اپنی زندگی کو راحت و آرام سے بسر کرنے کے لئے دین حق کے ترک کرنے پر مجبور ہو جائے گی جبکہ اس کو علم ہو جائے کہ مرد کی محبت سوائے اس کے حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ پس ان وجوہات کے پیش نظر خداوند کریم نے مومنہ عورت کا نکاح کافر اور غیر مومن مرد سے ناجائز قرار دے دیا ہے اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ کافر اور غیر مومن دوزخ کی طرف دعوت دیں گے اور میں اللہ جنت اور بخشش کی دعوت دیتا ہوں لہٰذا ایسا رشتہ جس سے کفر کی دعوت میں قبولیت کو تقویت پہنچتی ہو ترک کر دیا جائے اگر مومنہ عورت کے ماں باپ غیر مومن مرد سے اس کا نکاح کرنے کی جسارت کریں گے تو اس کا وبال اُخروی ماں باپ کے سر پر ہوگا اور اس حکم کی وضاحت کے بعد قیامت کے دن اُن کا کوئی عذر نہ سُنا جائے گا اگر مومنہ عورت غیر مومن مرد کے نکاح کی وجہ سے دین حق کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئی تو بروز محشر عذر کر سکے گی کہ مجھے ماں باپ نے اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا اور میں مجبور تھی تو اس قسم کے والدین کو قیامت کے دن جواب دہی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

مسئلہ:۔ کافر اور مشرک کا جو حکم ہے فرق اسلامیہ میں سے ناصبی، خارجی اور غالی کا بھی وہی حکم ہے۔ بلکہ مومن اپنا رشتہ صرف مومن کو ہی دے سکتا ہے۔

وجہ ربط آیات:۔ احکام فرعیہ میں سے پہلے اوامر کا بیان فرمایا، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، وصیت، قصاص وغیرہ اور ان احکام کے بعد نواہی کا بیان شروع کیا یعنی وہ چیزیں جن سے بچنے کا حکم ہے پس ان میں سے زیادہ اہم امور کا ذکر فرمایا

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ

آپ سے پوچھتے ہیں حیض کے متعلق فرما دیجئے کہ وہ نجس ہے۔ پس علیحدہ رہو عورتوں سے اثنائے حیض میں

وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ

اور نہ نزدیک جاؤ ان کے یہانتک کہ پاک ہولیں۔ پس جب پاک ہولیں تو آؤ ان پر جہاں سے امر کیا تم کو

اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲

خدا تعالیٰ نے تحقیق خدا دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے پاک بازوں کو

مثلاً شراب نوشی، جوا بازی، یتیموں کا مال کھانا اور مشرکوں، کافروں (غیر مومن لوگوں کے ساتھ) رشتہ ناطہ کرنا۔ ان سب سے مومنوں کو بچنا واجب ہے۔ ان مسائل کے بعد امور خانہ داری کی طرف متوجہ فرماتے ہوئے مسائل زوجیت کو بیان فرمایا۔

رکوع ۱۲

حیض کا بیان

يَسْـَٔلُوْنَكَ :۔ اس کے شانِ نزول کے متعلق ہے کہ ایام جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ لوگ اپنی عورتوں سے حیض کے دنوں میں بالکل علیحدہ ہو جایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا، پینا، بیٹھنا ترک کر دیتے تھے۔ پس انہوں نے جناب رسالتمآب سے اس بارے میں سوال کیا تو یہ آیت اتری۔

فَاعْتَزِلُوْا :۔ ایام حیض میں عورت کے ساتھ جماع کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص عمداً ایسا کرے تو اس پر کفارہ واجب ہے۔ اگر حیض کے پہلے حصہ میں مجامعت کرے تو اس کا کفارہ ایک دینار اور اگر درمیان میں کرے تو اس کا کفارہ نصف دینار اور اگر آخر حصہ میں کرے تو اس کا کفارہ دینار کا چوتھا حصہ ہے

مسئلہ :۔ ایام حیض میں مجامعت کے علاوہ عورت سے بوس و کنار وغیرہ جائز ہے البتہ زیر ناف اس سے استمتاع حاصل کرنا مکروہ ہے۔ یعنی اس کو ہاتھ لگانے سے بھی گریز نہ کرے۔

حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۔ اس لفظ کو بعض قاریوں نے يَطَّهَّرْنَ شد کے ساتھ پڑھا ہے اگر بغیر شد کے پڑھا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ عورتوں سے مقاربت نہ کرو جب تک کہ خون سے پاک نہ ہو جائیں اور شد کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں معنی ہوگا کہ عورتوں سے مجامعت نہ کرو۔ جب تک کہ خون ختم ہونے کے بعد غسل نہ کر لیں۔

مسئلہ :۔ خون حیض ختم ہو جانے کے بعد اور غسل سے پہلے عورت کے ساتھ مجامعت کرنا جائز ہے لیکن غسل سے پہلے مکروہ ہے

لہٰذا بہتر ہے کہ غسل سے پہلے مجامعت نہ کرے اور بعض علماء کے نزدیک غسل سے پہلے عورت کے ساتھ مجامعت کرنا حرام ہے۔
فَاِذَا تَطَهَّرْنَ - یعنی جب خون سے پاک ہوجائیں یا غسل کرلیں تو ان کے پاس آؤ یعنی مجامعت کرو اور ان کے پاس آنے کا امر وجوب کے لئے نہیں ہے بلکہ اباحت کے لئے ہے مقصد یہ ہے کہ اب تمہارے لئے جائز ہے کہ اُن کیساتھ مجامعت کرو
مسئلہ :- خونِ حیض کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن آتا ہے اور ہر تندرست عورت کو ایک ماہ میں ایکدفعہ آتا ہے اور ایک حیض سے دوسرے حیض تک کم از کم مدّت دس دن ہے اگر ایک حیض کے بعد دس دن گزرنے سے پہلے کوئی خون آجائے تو وہ یقیناً استحاضہ کا خون ہوگا اور حائض عورت کے احکام یہ ہیں
(۱) وہ عبادات جن میں طہارت شرط ہے مثلاً نماز، روزہ وغیرہ۔ حیض والی عورت پر ان کا بجالانا حرام ہے۔
(۲) اللہ تعالیٰ کے اسماءِ طاہرہ کو مس کرنا اس پر حرام ہے۔ بلکہ انبیائے طاہرین اور آئمہ معصومین کے ناموں کو مس کرنے سے بھی پرہیز کرے۔ نیز قرآن مجید کے حروف حرکات سکنات وغیرہ کو بھی وہ مس نہیں کرسکتی۔
(۳) وہ آیات جن میں سجدہ واجب ہے۔ حائض عورت پر ان کا پڑھنا حرام ہے بلکہ سورۂ سجدہ کے پڑھنے سے بھی اجتناب کرے
(۴) مساجد میں ٹھیرنا اس کے لئے حرام ہے۔
(۵) کوئی چیز مسجد میں رکھنا اس کے لئے حرام ہے جبکہ مُستلزم دخول مسجد ہو۔
(۶) مسجد الحرام اور مسجد نبیؐ - ان دو مسجدوں سے گذرنا بھی حیض والی عورت پر حرام ہے۔
(۷) حیض والی عورت کے ساتھ مجامعت کرنا حرام ہے۔ اور بصورت مجامعت کفّارہ واجب ہے۔
(۸) ایّام حیض میں عورت کو طلاق دینا ناجائز ہے۔ بشرطیکہ (۱) مدخولہ ہو (۲) حاملہ نہو (۳) مرد حاضر ہو یعنی عورت کے حالات سے مطلع ہونا اس کے لئے آسان ہو اور ان شرائط کے نہ پائے جانے کی صورت میں حیض والی عورت کو طلاق دی جاسکتی ہے یعنی اگر عورت مدخولہ نہ ہو یا مدخولہ حاملہ ہو یا یہ کہ مرد کے لئے اس کے حالات سے مطلع ہونا دشوار ہو۔ ان حالتوں میں عورت کو طلاق دینا جائز ہے خواہ ایّام حیض ہی میں کیوں نہ ہو۔
(۹) خون کے اختتام کے بعد غسلِ حیض عباداتِ مشروطہ با طہارت کے لئے واجب ہوا کرتا ہے۔
مسئلہ :- غسلِ حیض کی کیفیت مثلِ غسل جنابت کے ہے۔ یعنی اگر ارتماسی ہو تو نجاست دُور کرنے کے بعد نیت کرکے ایک دفعہ غوطہ لگانا کافی ہے اور اگر غسل ترتیبی ہے تو نجاست دُور کرنے کے بعد نیت کرکے پہلے سر اور پھر دایاں حصّہ اور پھر بایاں حصّہ بدن پر پانی کو جاری کرے اس طرح کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔
مسئلہ :- عورت کے وہ زیورات جو چمڑے تک پانی پہنچنے سے مانع ہیں غسل کے وقت ان کا اتارنا واجب ہے۔ تاکہ پانی چمڑے تک پہنچ جائے ورنہ غسل باطل ہوگا۔
مسئلہ :- ناخن پالش جس کا عورتوں میں آجکل عام رواج ہے اس کی موجودگی میں غسل کی صحت مشکل ہے کیونکہ ناخن کے اُوپر ایک علیحدہ پردہ سا ہوتا ہے جو ناخن تک پانی پہنچنے سے مانع ہے۔

مسئلہ:- سر کے بال اگر گندھے ہوں اور پانی جسم تک پہنچنے سے مانع ہوں تو ان کا کھولنا بوقت غسل واجب ہے۔

مسئلہ:- غسل حیض کے پہلے یا بعد وضو کرنا عبادت کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے اور بہتر ہے کہ وضو بقصد قربت پہلے کیا جائے۔

مسئلہ:- غسل کے بعد عورت پر وہ سب چیزیں حلال ہو جائیں گی جو بوجہ حیض کے اس پر حرام تھیں سوائے ان عبادات کے جو مشروط با طہارت ہیں کیونکہ ان کے لئے وضو بھی ضروری ہے خواہ غسل سے پہلے کرے یا بعد کرے۔ لیکن پہلے کرنا بہتر ہے

مسئلہ:- اگر غسل کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو تیمم بدلے غسل کے کرنا چاہیئے اور اگر وضو بھی ناممکن ہو تو دوسرا تیمم بدلے وضو کے کرنا ضروری ہوگا۔

(۱۰) ایام حیض میں عورت سے جو نمازیں ترک ہوتی ہیں۔ اُن کی قضا واجب نہیں لیکن جو روزے قضا ہوئے ہوں ان کی قضا واجب ہے۔

(۱۱) جو عورت، طہارت و نجاست کی پرواہ کرنے والی نہ ہو اور ایام حیض میں اپنے لباس و بدن وغیرہ کو آلودگی سے بچانے میں احتیاط نہ کرتی ہو۔ ایسی عورت کی جھوٹی چیز اُس کا پس خوردہ استعمال کرنا مکروہ ہے اسی طرح حیض والی عورت کے لئے مہندی لگانا، سجدہ والی سورتوں کے علاوہ اور قرآن کے حروف کے علاوہ اوراق کی خالی جگہوں کو یا جلد کو مس کرنا مکروہ ہے۔

مسئلہ:- اگر ایام حیض میں عورت مر جائے تو اس کو غسل حیض دینے کے بعد غسل میت دیا جائے۔

مسئلہ:- اگر وقت نماز داخل ہونے کے بعد اتنی مقدار گزر جائے کہ وہ باشرائط نماز پڑھ سکتی ہو اور اس کے بعد اس کو حیض شروع ہو جائے تو اس پر اس نماز کی قضا واجب ہے اسی طرح اگر آخر وقت میں حیض ختم ہو جائے اور اتنا وقت باقی ہو کہ غسل اور باقی نماز کی شرائط حاصل کرنے کے بعد ایک رکعت نماز وقت کے اندر ادا کر سکتی ہو۔ لیکن نہ کرے تو اس پر اس نماز کی قضا واجب ہے۔

مسئلہ:- من جملہ علامات بلوغ کے عورت کو حیض کا آنا بھی ایک علامت بلوغ کی ہے۔

مسئلہ:- ایام حیض میں اگرچہ عورت پر نماز معاف ہے لیکن اس کے لئے مستحب ہے کہ وقت نماز میں وضو بقصد قربت کر کے مصلائے عبادت پر بیٹھ کر نماز کی مقدار کے برابر ذکرِ خدا کرتی رہے۔

مسئلہ:- ہر عورت بالغہ پر واجب ہے کہ مسائل حیض سیکھے اور ان پر عمل کرے۔

مسئلہ:- حیض کے دنوں میں عورت پر روزہ رکھنا حرام ہے اور اس کی قضا واجب ہے۔

مسئلہ:- اگر روزہ دار عورت کو غروب آفتاب سے پہلے حیض شروع ہو جائے تو اس کا روزہ باطل ہو جائیگا اور اس کی قضا لازم ہوگی

مسئلہ:- حیض والی عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی کیونکہ بیت اللہ مسجد الحرام کے اندر ہے اور مسجد میں اس کا داخل ہونا ممنوع ہے

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں ۔ پس آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو اور بھیجو اپنے نفسوں کے لئے (نیک اعمال) اور اللہ سے ڈرو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّكُمْ مُّلٰقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾ وَلَا

اور جانو تحقیق تم اس کے پاس حاضر ہونے والے ہو ۔ اور خوشخبری دیجیے ایمان والوں کو اور نہ بناؤ

تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا

اللہ کو نشانہ اپنی قسموں کا تاکہ نیک بنو اور بچو گناہوں سے اور اصلاح کرو درمیان

بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ

لوگوں کے اور خدا سننے جاننے والا ہے نہیں گرفت کرتا تم کو خدا ساتھ لغو کے تمہاری قسموں میں

أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٢٥﴾

لیکن وہ مواخذہ کرے گا ساتھ اس چیز کے جو کسب کیا تمہارے دلوں نے اور خدا بخشنے والا حلیم ہے ۔

ازدواجی زندگی کا حقیقی مفاد

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ :۔ نسلِ انسانیت کو چونکہ موجودات پر افضلیت اور فوقیت دی گئی ہے لہذا ان کے احکام کو بھی موجودات سے امتیازی شان کا حامل ہونا ضروری ہے ۔ عام حیوانات کی بقاء نسل کا دارومدار بھی نر، مادہ کے باہمی جوڑ پر ہے ۔ بلکہ ماہرین نباتات کے نزدیک تو نباتات کی افزائش و بقاء بھی اجناس نباتیہ کے نر و مادہ کے ملاپ پر موقوف ہے اور عربی ممالک میں تو آج کل بھی بار آوری کے زمانہ میں نر کھجور کے خوشوں سے اس کا پھل نکال کر مادہ کھجور کے خوشوں میں داخل کر کے اُسے ادنیٰ سے اعلیٰ بنایا جاتا ہے اور اسے تابیر کہتے ہیں ۔ اور چونکہ تمام نباتات میں نر و مادہ کی ملاوٹ پر انسان کی قدرت نہیں بلکہ پودہ جات کے اقسام مختلفہ میں سے نر و مادہ کی پوری شناخت بھی انسان کے بس کا روگ نہیں ۔ لہذا خداوند حکیم نے ہواؤں اور تیز آندھیوں کے ذریعہ سے ان کے اثرات کو ایک دوسرے تک منتقل فرمانے کا انتظام کیا ہے اور یہ تجربہ شدہ امر ہے کہ کھجوروں کے باغات میں اگر نر کھجور کے پودے نہ ہوں یا بہت کم ہوں تو باغات کے پھلوں میں معتدبہ کمی واقع ہو جاتی ہے اس سے اس امر کا بخوبی انکشاف ہو سکتا ہے کہ باقی پودہ جات اور میوہ دار اشجار کا بھی یہی حال ہو گا ۔

اس مقام پر خدائے قدوس نے نسل انسانی کی بقا اور نشوونما کے طریقہ کی وضاحت کی ہے کہ عورت کو صرف استلذاذ اور تسکین شہوات کا آلہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ قدرت کی حکیمانہ ایجاد و تخلیق نے اسے اشرف المخلوقات کی نشوونما کے لئے کھیتی قرار دیا ہے۔

اس مختصر سے لفظ میں خداوند کریم نے عورت و مرد کی ازدواجی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی نشان دہی فرمائی ہے

(۱) کھیتی میں متعدد مالکوں کی شرکت باعث نزاع ہوا کرتی ہے۔ بنا بریں عورت کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ مرد حرام ہیں۔

(۲) کھیتی پر مالک کا تصرف حاکمانہ ہوتا ہے اس سے عورت پر مرد کی حکومت کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) کھیتی کی تربیت مالک کے ذمہ ہوتی ہے۔ اس سے عورت کے تمام تر اخراجات لائقہ کی ذمہ داری کا وجوب مرد پر عائد ہونا سمجھا جاتا ہے۔

(۴) کھیتی کے حفاظتی انتظامات مرد پر عورت کے لئے پردہ داری کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

(۵) کھیتی میں غیر کے بے جا داخلے سے نقصان کا اندیشہ، جہاں زنا کی حرمت بتاتا ہے وہاں مرد کو غیرت کا بھی درس دیتا ہے۔

(۶) بعض وقتی تقاضوں کے ماتحت کھیتی کو اپنی ملکیت سے خارج کیا جا سکتا ہے جو مسئلہ طلاق کی طرف متنبہ کرتا ہے۔

(۷) اسی طرح ازدواجی زندگی کے جملہ اصول کا اسی مثال سے استکشاف کیا جا سکتا ہے اور خاص طور پر قابل توجہ امر یہ ہے اور انسان کا عقلی قرینہ بھی یہی ہے کہ اچھے پھل حاصل کرنے کے لئے اچھی سے اچھی زمین کا انتخاب کرے کیونکہ اچھے سے اچھا بیج ناکارہ زمین میں تلف ہو جاتا ہے یا بعض اوقات غیر تسلی بخش افادیت کا حامل ہوتا ہے اور بخلاف اس کے کمزور بیج لائق اور شستہ زمین میں تسلی بخش اور صحت افزا نتیجہ تک منتہی ہوتا ہے۔

اسی نقطہ کے پیش نظر تو خانوادۂ عصمت سے کافی روایات منقول ہیں جن میں عورت کے انتخاب پر زور دیا گیا ہے عورت کو صرف حسن و جمال کی خاطر یا زر و مال کے طمع کے لئے منتخب کیا جائے تو یہ دانش مندی نہیں بلکہ قرآن مجید کی تشبیہ کے لحاظ سے پہلے پہل عورت کے عقل و دماغ کا جائزہ لیا جائے کیونکہ صنفی طور پر تو وہ ویسے ناقص العقل ہے اگر شخصی طور پر بھی کور دماغ ہو تو ایک دانش مند اور بلند خیال انسان کا اس کے ساتھ قطعاً گذر نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ عورت اپنے مقام پر ظاہری لحاظ سے تصویر حسن اور پیکر جمال ہی کیوں نہ ہو، اسی بنا پر تو معصوم کا فرمان ہے کہ اگر عورت کو صرف ظاہری جاہ و جلال یا حسن و مال کی خاطر اپنے عقد میں لائے تو بعید نہیں کہ وہ ان دونوں فائدوں سے محروم رہے۔

نیز اگر عورت کند ذہن اور بد دماغ ہو گی تو اس کا لازمی نتیجہ ہے اولاد کا کند ذہن ہونا، خواہ مرد کتنا ہی

عقیل اور فہیم ہو، جس طرح کہ عورت کی کھیتی سے تشبیہ اس امر کی شاہد ہے کہ عمدہ بیج نالائق زمین میں نالائق پیداوار لاتا ہے اور ناکارہ بیج بھی اعلیٰ زمین میں خوشگوار نتائج پیش کرتا ہے اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا شجاع اولاد کی خواہش میں شجاع خاندان کی عورت کے انتخاب کے لئے حضرت عقیل سے مشورہ لے کر ام البنین کا عقد میں لانا اسی نکتہ کے پیش نظر تھا۔ ورنہ اگر یہ اوصاف مرد کے تابع ہوتیں تو شجاعت کے مقام میں آنحضرتؑ کسی سے کیا کم تھے؟ اور یہی وجہ ہے کہ حسنین شریفینؑ گو مقام شجاعت میں بھی بے پناہ شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن ایثار، حلم و حوصلہ، صبر و رضا، سکون و اطمینان اور رحم و کرم میں بھی نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور یہ شیر بتول معظمہؑ کی تاثیر تھی اور حضرت عباسؑ باوجود باقی صفات میں کامل ہونے کے جوہر شجاعت میں امتیازی شان پر فائز تھے۔ اور یہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے اسی انتخاب کا نتیجہ تھا اگر تتبع کیا جائے اور تاریخ میں شخصیات کے ان پہلوؤں پر منظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ اولاد کی اچھائی یا برائی میں ماؤں کا کس قدر دخل ہے۔

بہرحال عورت و مرد کی ازدواجی زندگی کا انحصار صرف شہوت رانی اور تعیش پرستی پر ہی نہیں بلکہ ان کی نگاہ ایک اعلیٰ اور بلند مقصد پر ہونی چاہیئے تاکہ ایک طرف ان کی اپنی زندگی خوشگوار ہو اور دوسری طرف بہترین اولاد ان کی نسل سے منصۂ شہود پر آئے تاکہ عالم وجود انسان نما درندوں سے بھرپور ہو جانے کی بجائے صحیح معنوں میں انسانیت کا گہوارہ بن کر امن و اطمینان کا سانس لے

اَنّٰی شِئۡتُمۡ۔ اس میں خداوند کریم نے اپنی عورت کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کی کھلی اجازت دی ہے کہ جب چاہو یا جہاں چاہو اپنی منکوحہ کو اپنی نسل کیلئے کھیتی سمجھ کر اس سے ہمبستری کرو اور ایک دوسرے مقام پر عورت کو مرد کے لئے باعث سکون قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر عورت و مرد کو ایک دوسرے کا لباس تصور کیا گیا ہے۔ ان سب تصریحات و ارشادات میں مرد کو ہوس جنسی کی تسکین کے ساتھ ساتھ حقوق و فرائض کی طرف بھی متنبہ کیا گیا ہے تاکہ صرف شہوت رانی اور جنسی لذات کو ہی ازدواجی زندگی کا مال نہ سمجھے بلکہ ہمبستری کے وقت بھی تسکین قلب کے ساتھ ان حدود کی پاسداری کا خیال رکھے جو شریعت مقدسہ نے اس کے لئے مقرر فرمائی ہیں اور چونکہ وطی فی الدبر میں عورت کے کھیتی ہونے کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے لہذا شریعت مقدسہ نے اس فعل شنیع کو قابل نفرت اور مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ عورت کے ساتھ ہمبستری کرنے کے لئے اس کے کھیتی ہونے حیثیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور عورت پر بھی واجب ہے کہ مرد کے لئے تسکین قلب کی موجب ہو اور ہر ممکن طریقہ سے مرد کے جذبات کا احترام کرنا اپنا نصب العین سمجھے۔

وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰہَ۔ تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ عبداللہ بن رواحہ نے اپنے بہنوئی سے ناراض ہو کر قسم کھائی تھی کہ نہ اس کے ساتھ نیکی کروں گا اور نہ اس کی زوجہ سے اس کی صلح کراؤں گا اور نہ اس کے دشمنوں اور اس کے درمیان صلح کراؤں گا۔ پس یہ آیت اتری کہ اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ تاکہ نیک بنو یا یہ کہ اللہ کو باعث رکاوٹ نہ بناؤ اس بات سے کہ نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور صلح کراؤ۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ

واسطے ان کے جو قسم کھاتے ہیں اپنی عورتوں کے بارے میں مہلت چار ماہ کی ہے پس اگر رجوع کرلیں تو تحقیق

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور اگر ارادہ کریں طلاق کا ۔ تو تحقیق اللہ سننے والا ہے ۔

ایلاء کا بیان

ایلاء کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مدخولہ عورت سے ہمبستری نہ کرنے کی قسم کھائے اور اس سے اس کا مقصود صرف عورت کو ضرر و تکلیف دینا ہو خواہ اس میں مدت مقرر نہ کرے یا مدت مقرر کرے لیکن چار ماہ سے زیادہ ہو۔

ایلاء میں شرط یہ ہے کہ قسم اللہ کے لفظ سے ہو یا اللہ کے خاص صفات سے واقع ہو اور اگر کسی اور متبرک چیز مثلاً قرآن یا انبیاء و اوصیائے طاہرین علیہم السلام کے اسماء طاہرہ کی قسم کھائے گا تو اس پر ایلاء کا حکم جاری نہ ہوگا۔

ایلاء کرنے والے میں یہ شرطیں بھی ضروری ہیں :- (۱) عاقل ہو (۲) بالغ ہو (۳) صاحب اختیار ہو یعنی کسی اور نے ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا ہو (۴) ایلاء کرتے وقت اس کا قصد بھی ہو، اگر بھول کر یا حالت غفلت میں ایسا کرے تو ایلاء نہ ہوگا۔

مسئلہ ۱۔ اگر ایلاء متحقق ہو جائے تو عورت کو حاکم شرع کے پاس رپورٹ کرنے کا حق ہے ۔پس حاکم شرع چار ماہ کے بعد مرد کو دو چیزوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حکم دے گا ۔ (۱) یا تو عورت کی طرف رجوع کرکے ایلاء کا (قسم کا) کفارہ ادا کرے (۲) یا عورت کو طلاق دے دے ۔ مسئلہ ۔ اگر ایلاء کرنے والا ان دونوں میں سے کسی کو اختیار نہ کرے تو حاکم شرع اس سے جبریہ ایسا کرانے کا مجاز ہے ۔

مسئلہ ۔ ایلاء کا کفارہ دوسری قسم کے کفارہ کی طرح ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو لباس دینا یا غلام آزاد کرنا اور اگر ان تینوں چیزوں سے عاجز ہو تو تین روزے رکھ دے ۔

مسئلہ ۔ اگر عورت سے ہمبستری ترک کرنے کی قسم عورت کے فائدہ کے لئے کھائے ۔مثلاً عورت حاملہ ہو، یا بچہ دار ہو، یا بیمار ہو۔ پس ترکِ ہمبستری کی قسم حمل کی حفاظت کے لئے یا دودھ کی درستی کے لئے یا عورت کو تکلیف سے بچانے کے لئے کھائے تو یہ ایلاء نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا حکم عام قسم کی طرح ہوگا۔ یعنی اس کی خلاف ورزی سے صرف قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ

اور طلاق شدہ عورتیں انتظار کریں تین طہر۔ اور ان کے لئے حلال نہیں کہ چھپائیں وہ چیز جو پیدا کی

مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ

ہے اللہ نے ان کے رحموں میں۔ اگر ان کا ایمان خدا اور قیامت کے دن پر ہے اور ان کے شوہر زیادہ

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ

حقدار ہیں ان کو پھیر لینے میں اُس (عدت) میں اگر ارادہ کریں اصلاح (درستی) کا اور ان کا (مردوں پر حق) ویسا ہی ہے جیسا

عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

(مردوں کا حق) ان پر ہے۔ ساتھ نیکی کے اور مردوں کو ان پر درجہ ہے (فوقیت حاصل ہے) اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

مطلّقہ کی عدّت کا بیان

ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ قُرُوْءٍ جمع ہے قُرءٌ کی اور یہ لفظ لغات اضداد میں شمار ہوتا ہے یعنی اس کے دو معنی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قرءٌ کا معنی حیض بھی ہے اور اس کا معنی طہر بھی ہے اس مقام پر علمائے امامیہ کا مذہب یہ ہے کہ قرءٌ کا معنی طہر لیا جائے۔ پس طلاق شدہ عورت کی عدت تین طہر ہوگی۔ ایک طہر وہ بھی شمار ہوگا جس میں طلاق واقع ہوئی ہو اور اس کے بعد دو طہر سالم جب گزریں گے اور تیسری مرتبہ اس کو حیض شروع ہوگا تو پس عدت ختم ہو جائے گی اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے ایسا ہی مروی ہے۔ حنفیوں کے نزدیک یہاں قرءٌ سے مراد حیض ہے پس ان کے نزدیک طلاق کی عدت تین حیض ہے۔ پس تیسرے حیض کے ختم ہونے پر عورت کی عدت ختم ہوگی۔

فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ (جو کچھ ان کے رحم میں ہے) اس سے بعضوں نے مراد حیض لیا ہے اور بعضوں نے حمل مراد لیا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مراد اس سے حیض اور حمل دونوں ہیں اور لفظ کا عموم بھی اسی کا مؤید ہے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت کو اپنا حیض یا حمل چھپانا نہیں چاہیئے۔ (اگر اس سے ان چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے تو اس کو صاف صاف بتا دینا چاہیئے) اور حمل یا حیض کی خبر میں عورت کا قول معتبر ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو حائض بتلائیں تو اُن کو حائض سمجھنا چاہیئے اور اگر اپنے آپ کو حیض سے پاک بتلائیں تو ان کو پاک سمجھنا چاہیئے اس پر اُس سے مزید گواہ وغیرہ لینے کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس کی اپنے متعلق حامل ہونے یا نہ ہونے کی خبر شریعت میں معتبر

سمجھی گئی ہے۔

پس طلاق شدہ عورت کو حیض یا حمل کی حالت کے چھپانے سے ممانعت ہے کیونکہ اس کی عدت کے باقی ہونے، یا گزرنے کا دارومدار اسی چیز پر ہے اگر عورت غلط بیانی کرے تو اس میں مرد کی حق تلفی ہے کیونکہ مرد کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور عورت کی غلط بیانی اور حقیقت پر پردہ پوشی مرد کو اپنے جائز حق سے محروم رکھنے کے مترادف ہے۔

اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عدت کے اندر مرد کو بغیر عقد ثانی کے عورت کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے خواہ عورت رضامند ہو یا نہ ہو۔ لیکن بشرطیکہ مرد کی نیت اصلاح (خانہ آبادی) کی ہو اور اگر مرد کی نیت فاسد ہو۔ یعنی محض عورت کو تنگ کرنے کے لئے طلاق کے بعد رجوع کر رہا ہو۔ تاکہ وہ کسی اور جگہ نکاح کرنے کے قابل نہ رہے تو ایسی صورت میں مرد کے لئے رجوع کرنا ناجائز ہے اور اگر بالفرض مرد اسی فاسد نیت سے رجوع کرے بھی تو رجوع کا حکم صادق آجائے گا اور وہ عورت اس کی منکوحہ ٹھیری رہے گی۔ اگرچہ مرد پر ایسا کرنا حرام ہے۔

عورت و مرد کے حقوق

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي الخ۔ یعنی عورتوں کے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جس طرح مردوں کے عورتوں پر۔ لیکن مردوں کو اُن پر درجہ (فضیلت) حاصل ہے۔ خداوند کریم نے اس آیت میں امور خانگی کی اصلاح اور عورت و مرد کی حسن معاشرت کو نہایت جامع طریقہ پر بیان فرمایا ہے۔

مجمع البیان میں منقول ہے کہ معاذ کی عورت نے جناب رسالتمآبؐ سے مرد پر عورت کے حقوق دریافت کئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مرد پر عورت کا حق یہ ہے کہ اس کے منہ پر تھپیڑ نہ مارے اس کے ساتھ بدزبانی نہ کرے جو خود کھائے اس کو کھلائے۔ جو خود پہنے، اس کو پہنائے اور اس سے یکسوئی نہ اختیار کرے۔

نیز آپؐ سے مروی ہے کہ فرمایا :۔ عورت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ کی امانت میں تم نے اُن کو حاصل کیا ہے اور اللہ کے فرمان سے تم نے ان کے پوشیدہ مقامات پر تصرف کیا ہے تمہارا اُن پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے غیر کو اپنے جسم پر تصرف نہ کرنے دیں۔ اور ایسا کرنے سے وہ سزا کی حقدار ہیں اور اُن کا تم پر حق یہ ہے۔ کہ ان کو روٹی کپڑا خوش اسلوبی سے دیتے رہو۔ کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک عورت جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور دریافت کیا کہ مرد کے عورت پر کیا حقوق ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس پر مرد کی اطاعت واجب ہے۔ مرد کے اذن کے بغیر وہ گھر سے کسی کو صدقہ نہ دے اور نہ اس کی اجازت کے

بغیر سنّتی روزہ رکھے اور نہ اپنے جسم سے مرد کو روکے اگرچہ پالانِ شتر پر ہی کیوں نہ ہو اور بغیر اجازت مرد کے گھر سے باہر نہ جائے اور اگر بغیر اجازت مرد کے گھر سے باہر جائے گی تو آسمان و زمین کے فرشتے اور غضب اور رحمت کے فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ گھر واپس نہ پہنچ جائے۔

پھر اس عورت نے سوال کیا۔ یارسولؐ اللہ! لوگوں میں سے عورت پر زیادہ سے زیادہ حق کس کا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ شوہر کا۔" پھر اس نے پوچھا کہ کیا میرا حق بھی اس پر ویسا ہی ہے؟ جس طرح اس کا مجھ پر ہے؟" آپؐ نے فرمایا، کہ ایسا نہیں۔ بلکہ اُس کے مقابلہ میں ایک سو میں سے ایک بھی نہیں۔"

پس یہ سنتے ہی عورت نے آپؐ کی نبوّت کی قسم کھاتے ہوئے کہا، کہ میں ہرگز شادی نہ کروں گی۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، اگر مجھے کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دینا ہوتا تو البتہ میں عورت کو شوہر کے سجدہ کا حکم دیتا۔"

دورِ حاضر میں عورت کی آزادی کا تصوّر

زمانِ حاضر میں مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر عورتیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کو اپنے لئے توہین خیال کرتی ہیں کیونکہ مغرب کی اسلام کُش مسموم اور تند ہوا اُن کو مردوں کے دوش بدوش چلنے کی طرف مسلسل دھکیلے جا رہی ہے اور اسلامی تعلیمات سے برسرِ پیکار ہونے والے مرد بھی صرف اپنی خواہشاتِ نفسانیہ اور جذباتِ شہوانیہ کی تسکین کی سہولت کی خاطر اسی قسم کے نعرے بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

حالانکہ خداوندِ کریم نے عورت و مرد کو جو علیحدہ علیحدہ خصوصیات عطا فرمائی ہیں اُن سے آگے قدم بڑھانے کی جرأت کرنا خدائی فیصلہ کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے عورت کے وجود کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ گھر کے اندرونی کاروبار کو سنبھالنے کی ذمہ داری کا بوجھ ہی برداشت کر سکتی ہے اور اپنی چار دیواری کے اندر اپنے فرائض کی ادائیگی ہی اس کے نمایاں مقام پر فائز ہونے کی دلیل ہے برخلاف اس کے مرد کی ساخت اس نے ایسی رکھی ہے کہ وہ گھریلو زندگی کے سنوارنے کے علاوہ بیرونی میل جول سے اپنے نمایاں کردار کے ذریعے اپنی خداداد استعداد کو عمل میں لاکر اپنے لئے ایک بلند مقام حاصل کرے اور تعمیرِ اخلاق و کردار سے صحیفۂ انسانیت سے حیوانیت و درندگی کے بدنما داغ دھو کر عالم میں امن و سکون کا علم بلند کرے۔

مولائے کائنات حلّالِ مشکلات حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے عورت و مرد کی پوزیشن کو ایک مختصر سے جملہ میں یوں واضح فرمایا کہ:- حُسْنُ الرِّجَالِ فِیْ عُقُوْلِهِمْ وَعُقُوْلُ النِّسَاءِ فِیْ حُسْنِهِنَّ (بحار الانوار ج ۱۰) یعنی مردوں کا حُسن ان کی عقلوں میں مضمر ہے اور عورتوں کی عقلیں ان کے حُسن کے پردہ میں ہیں" اس جملہ کی کئی توجیہیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مرد کے لئے جوہرِ انتخاب جو اس کی امتیازی حیثیت کا نشان ہے وہ عقل ہے یعنی مرد عقل و خرد سے ہی اپنی محبوبیت

کا سکہ جما سکتا ہے اور اس کی دانائی و عقلمندی ہی اس کا طرّۂ کمال اور زیورِ حسن ہے لیکن بخلاف اس کے عورت کا جوہرِ امتیاز جو اس کی قدر و قیمت کا موجب ہے وہ حُسن ہے یعنی عورت کی خوبصورتی ہی اس کی محبوبیت کی علمبردار ہے اور اس کا حسن و جمال ہی اس کی دلآویزی کی جان اور اس کی برتری کا نشان ہے۔

(۲) مرد کے لئے مایۂ ناز اور سرمایۂ افتخار عقل ہے اور اسی عقل و دانش کے بل بوتہ پر ہی مرد دوسروں پر سبقت لے جانے کے اہل ہوتا ہے لیکن بخلاف اس کے عورت کا معیارِ سبقت اور مدارِ رفعت حسن ہوتا ہے اور وہ صرف حسن و صورت کی بناء پر ہی معرضِ افتخار میں قدم رکھ سکتی ہے۔

(۳) مرد کے عقل و دانش سے اس کی حسن و خوبی منظرِ عام پر آتی ہے لیکن عورت کے حسنِ منظر سے متاثر ہو کر اس کے عقل و خرد سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔

(۴) مرد کی دانشمندی اس کو اپنے فرائض سے روشناس کراتی ہے اور عورت کا حُسن اس کو اپنے فرائض سے غافل کرنے کا موجب بنتا ہے۔

(۵) مرد عقل کو اپنے مقبول عام ہونے کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور عورت کی عقل اس کو صرف اپنے حسن ظاہری کے اضافہ کی دعوت دیتی ہے یعنی مرد کی سوچ بچار اپنی دنیوی یا اُخروی فلاح و بہبود میں ہوا کرتی ہے جو اُس کا حقیقی حُسن ہے اور عورت کی تمام تر غور و فکر اپنے بناؤ سنگار میں صرف ہوتی ہے جو اس کی ظاہری چاہت کا ہی ذریعہ ہے۔

پس ہر دو فریقین کو اپنے اپنے مقام پر رہنا ہی زیبائش دیتا ہے لہٰذا عورت کا اپنے مخصوص فرائض کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہی اس کی شرافت اور فطری خوبی ہے لہٰذا اسے غلامی سے تعبیر کرنا نا اندیشی ہے بلکہ اس کا اپنی حدود متعیّنہ سے گذر کر مردوں کے دوش بدوش رہنے کا جذبہ اس کی فطرت سے کھلی ہوئی بغاوت اور نافرض شناسی ہے اور اس کے اس خیال کو نظریۂ آزادی قرار دینا انتہائی کورباطنی ہے جو مرد عورتوں کو اس نام نہاد نظریۂ آزادی کی طرف لانے کی فکر میں ہیں۔ وہ صرف اپنی خواہشات کا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے ان کی بھولی بھالی عقلوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے ہیں اور جو عورتیں اس دامِ تزویر میں پھنس کر اس غلط نظریئے کو اپنی آزادی کا پیش خیمہ سمجھتی ہیں۔ انہیں صرف دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

مردوں کو چاہیئے کہ وہ عورتوں کو اپنے جائز اور اسلامی حقوق سے محروم نہ کریں اور انہیں اپنی شرعی حدود میں رہ کر اپنے فرائض نسوانی سے روشناس کرائیں۔ مردوں کا عورتوں پر بے جا تشدّد اور ناقابلِ برداشت رویہ ہی ان کو خدا اور رسولؐ کے احکام سے باغی ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ مرد چونکہ بہت سے امورِ خانگی سے فارغ ہوتا ہے اس لئے اگر جسمانی قوت اور مالی وسعت اسے اجازت دے تو ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے جن کی حد چار تک ہے بشرطیکہ وہ اپنے عادلانہ رویّہ سے ان کی حق تلفی نہ کرے لیکن عورت امورِ خانہ داری اور بال بچوں کی تربیت میں گھر کر اس قدر مشغول الذمہ ہو جاتی ہے کہ وہ صرف ایک

ہی مرد کی ذمہ داریوں کا بوجھ بمشکل اٹھا سکتی ہے لہٰذا اس کے لئے بیک وقت صرف ایک ہی مرد سے نکاح کرنے کی پابندی ہے تو مرد کے لئے متعدد ازواج کا جواز اور عورت کے لئے صرف ایک مرد کی پابندی ایک فطری تقسیم ہے اس کو مرد کی آزادی اور عورت کی قید سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے اور عورت و مرد ہر دو کے فرائض کا جائزہ لیا جائے تو ہر دو اپنے اپنے مقام پر آزاد ہیں اور اگر فرائض و ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو دونوں مقید ہیں۔

اگر عورت کے لئے یہی قید ہے کہ وہ صرف ایک ہی مرد سے نکاح کر سکتی ہے تو کیا مرد اس امر کا مقید نہیں کہ وہ عورت کے تمام لوازماتِ زندگی مہیا کرے۔ جہاں مرد ایک نکاح کی قید سے آزاد ہے وہاں عورت اپنے لوازماتِ زندگی کی فکر سے آزاد ہے۔ اگر عورت کے لئے بچوں کی پرورش قید ہے تو مرد کے لئے تمام تر اخراجات کی ادائیگی کی قید بھی تو ہے۔

اگر عورت پر پردہ کی پابندی ہے تو مرد پر اس کے مناسب مکان و رہائش کا بندوبست اور پردہ داری کے جملہ اسباب کی فراہمی کی پابندی ہے۔

پس عورت کی پابندی عورت کی شان کے مطابق ہے اور مرد کی پابندی مرد کے رُتبہ کے ماتحت ہے اور دونو پابندیاں اپنے اپنے مقام پر موزوں ہیں جو پابندی عورت پر عائد ہے اس سے مرد آزاد ہے اور جو قید مرد کے لئے ہے اس سے عورت کو آزادی حاصل ہے۔

عورت چونکہ صرف اپنی پابندی کو مدّنظر رکھتی ہے اور مرد کی پابندیوں کا اُسے احساس نہیں ہوتا اس لئے وہ سمجھتی ہے کہ مرد آزاد ہیں اور بخلاف اس کے مرد عورتوں کو آزاد سمجھتے ہیں لہٰذا عورتیں اپنے حدود پھلانگ کر مردوں کے فرائض سنبھالنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں اور مرد اپنے فرائض کو بار خاطر قرار دے کر عورتوں کے نام نہاد نظریۂ آزادی کی تائید کرتے ہیں۔ اس میں ان کو دو فائدے نظر آتے ہیں ایک تو عورت کے اپنے اخراجات سنبھال لینا ان کے لئے غنیمت ہے اور دوسرے جذبۂ شہوانیت کی تسکین اس سے اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ بہر کیف عورت کے لئے یہ نام نہاد آزادی صرف عورت ہی کے لئے قید در قید ہے کیونکہ امور خانہ داری اور بچوں کی نگہداری کا بوجھ تو ویسے کا ویسا ان کے سر پر رہتا ہے اور مزید برآں جو اخراجات مرد پر عائد تھے وہ بھی اب اس کے اپنے اُوپر آ جاتے ہیں۔

پس خدا کا قانون وہ قانون ہے جس کو تا قیامت غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا اور قرآن مجید میں خُدا نے مردوں اور عورتوں کو اپنے جن جن حدود کے اندر پابند رہنے کا حکم دیا ہے وہی ہر دو کی دنیا و آخرت کی کامیابی و بھلائی کی ضامن ہیں۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ

طلاق رجعی دو مرتبہ ہے پھر یا تو اس کو رکھ لے خیر و خوبی کے ساتھ اور یا جانے دے ساتھ احسان کے اور ناجائز ہے تمہارے

تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ

لئے کہ لو ان چیزوں میں سے جو اُن کو تم دے چکے ہو، کچھ بھی مگر یہ کہ دونوں ڈریں اس بات سے کہ قائم نہ کرسکیں گے اللہ کی حدود کو پس

خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ

اگر تمہیں ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ کرسکیں گے۔ پس ڈر (یں عورت) ان دونوں پر گناہ نہیں اس چیز میں جو عورت فدیہ دے یہ اللہ کی

اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

حدیں ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی (بیان کردہ) حدوں سے بڑھے۔ پس وہی لوگ ظالم ہیں۔

رکوع ۱۳

طلاق عدت اور طلاق سنت کا طریقہ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ :۔ اگر کوئی شخص اپنی عورتِ مدخولہ کو شرائط کے ساتھ طلاق دے تو عدت کے اندر وہ اس عورت کی طرف رجوع کرسکتا ہے اور وہ عورت اس پر بغیر نکاح جدید کے حلال ہے پس اگر عدت کے اندر رجوع کرلے اور پھر شرائط کے ساتھ اس کو طلاق دے دے تو اب بھی عدت کے اندر اس کو عورت کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے پس اگر رجوع کرلے تو عورت کی اب دو طلاقیں پوری ہوگئیں اب حکم یہ ہے کہ اگر نیکی کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے عورت کو اپنے نکاح میں باقی رکھے اور نان ونفقہ وغیرہ میں اس کو تنگی نہ دے تو وہ اس کی عورت ہے ورنہ اس کو تیسری دفعہ شرائط کے ساتھ طلاق دے دے اور اس طلاق کے بعد وہ مرد اس عورت کی طرف رجوع نہیں کرسکتا اور یہ طلاق طلاق بائن ہو جائے گی۔ عدت گزرنے کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ جس مرد سے چاہے نکاح کرلے لیکن اس طلاق دینے والے سے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ ہاں البتہ اگر عورت نے اس طلاق بائن کے بعد کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرلیا اور اس مرد نے اپنی خوشی و رضامندی کے ساتھ اس کو طلاق بائن بطریق سابق دیدی یا طلاق رجعی دی اور عدت کے اندر رجوع نہ کیا یا وہ مرد مرگیا تو اس کی عدت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے طلاق دینے والے مرد کے

ساتھ نکاح کر سکتی ہے اس طلاق کو اصطلاح میں طلاق عدّت کہا جاتا ہے۔

اور اگر مرد عورت کو شرائط کے ساتھ طلاق دے اور عدّت کے اندر رجوع نہ کرے تو عدّت گزرنے کے بعد وہ مرد عورت کے ساتھ نکاح جدید کر سکتا ہے۔ پس اگر عدّت کے بعد وہ مرد اس عورت سے نکاح کر لے اور پھر شرائط کے ساتھ طلاق دے دے اور عدّت کے اندر رجوع نہ کرے بلکہ بدستور سابق عدّت کے بعد اسی عورت سے پھر نیا نکاح کر لے تو اس عورت کی دو طلاقیں مکمل ہو گئیں اب اگر اُسے اپنے نکاح میں باقی رکھے اور حسن سلوک سے گزارہ کرتا رہے تو ٹھیک ورنہ اب تیسری دفعہ جو طلاق دے گا یہ طلاق بائن ہو گی اور اس کے بعد نہ عدّت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدّت کے بعد اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ مگر اسی پہلی طرح کہ وہ عورت نیا شوہر کر لے اور وہ شوہر باشرائط اس کو طلاق بائن دے یا طلاق رجعی دے کر عدّت کے اندر رجوع نہ کرے یا وہ مرد مر جائے تو اس کی عدّت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے طلاق دینے والے مرد کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور اس قسم کی طلاق کو اصطلاح میں طلاق سنّت کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کا فرمان :- اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ :- طلاق عدّت اور طلاق سنّت ہر دو پر صادق ہے اور طلاق کے مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں سے طلاق سنّت کو افضل کہا گیا ہے۔

مسئلہ :- اگر مرد عورت کو مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں سے ایک طریقہ پر تین طلاقیں دے دے اور پھر عورت کے نئے شوہر کی طلاق یا موت کے بعد پھر اُسی عورت سے نکاح کر لے اور پہلے کی طرح پھر اس کو تین طلاق دیدے اور پھر عورت کے نئے شوہر کی طلاق یا موت کے بعد اس سے نکاح کرے لیکن پھر اُسی طرح اُس کو تین طلاق دے دے۔ تو اب تیسری بار طلاق بائن ہو چکنے کے بعد وہ عورت اس مرد پر حرام مؤبد ہو جائے گی اور کسی صورت میں وہ اس مرد کے نکاح میں نہ آسکے گی۔

مسئلہ :- اگر طلاق دینے والا بیک مرتبہ، تین مرتبہ طلاق کا صیغہ جاری کر دے تو وہ تین طلاقیں نہ ہونگی بلکہ طلاق صرف ایک ہو گی جو پہلی مرتبہ صیغہ جاری کرنے سے ہو گئی باقی دو دفعہ کا صیغہ لغو ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ الخ

مسئلہ :- بلاوجہ طلاق دینا مکروہ ہے اور اگر مرد و عورت کے تعلقات آپس میں اچھے نہ ہوں تو طلاق دینا سنّت ہے جبکہ اتفاق کی صورت کی بالکل کوئی اُمید نہ ہو اور گناہ میں واقع ہونے کا ڈر ہو۔

طلاق کی شرائط

مسئلہ :- طلاق میں چار چیزوں کو دخل ہے (۱) صیغہ (۲) طلاق دینے والا (۳) وہ عورت جس کو طلاق دی جائے۔

(۴) دو عادل گواہ

مسئلہ :- اگر مرد عورت کو طلاق دینا چاہے اور عورت سامنے موجود ہو تو کہے :- أَنْتِ طَالِقٌ اور اگر عورت سامنے موجود نہ ہو تو کہے :- زَوْجَتِي فَلَانَةٌ (اس کا نام لے) طَالِقٌ :- اگر اس کی عورت صرف ایک ہو تو نام لینے کی ضرورت نہیں ہے اگر خود صیغۂ طلاق جاری نہ کر سکتا ہو تو کسی صیغہ پڑھ سکنے والے کو اپنا وکیل بنائے پھر اس کا وکیل یوں کہے :- زَوْجَةُ مُوَكِّلِي فَلَانَةٌ (عورت کا نام لے) طَالِقٌ - اگر عورت اس کی صرف ایک ہو تو نام لینے کی ضرورت نہیں - اور اگر نام لے بھی لے تو حرج نہیں -

ایک زوجہ ہونے کی صورت میں بغیر نام لئے خود طلاق کا صیغہ پڑھے تو کہے :- زَوْجَتِي طَالِقٌ اور وکیل پڑھے تو کہے :- زَوْجَةُ مُوَكِّلِي طَالِقٌ -

مسئلہ :- طلاق دینے والے مرد میں چند شرائط ضروری ہیں :-

(۱) بالغ ہو، لہذا نابالغ کی طلاق صحیح نہیں ہے -

(۲) عاقل ہو، لہذا دیوانے آدمی کی طلاق صحیح نہیں ہے - مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے باپ یا دادا دیوانے آدمی کی طرف سے طلاق دے سکتے ہیں، جبکہ اس کی دیوانگی دائمی اور لاعلاج ہو - اسی طرح نابالغ بچہ بھی اگر بعد از بلوغ فاسد العقل ثابت ہو تو اس کی طرف سے بھی باپ دادا طلاق دے سکتے ہیں اور باپ دادا کی عدم موجودگی میں حاکم شرعی کو اختیار حاصل ہے -

شہید ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ گو احادیث میں یہ چیز صراحت سے مذکور نہیں لیکن فخر المحققین نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے - لہذا یہی قوی ہے بلحاظ حجیت کے -

(۳) مختار ہو - لہذا جس شخص کو طلاق پر مجبور کیا جائے اور وہ جبر و تشدد کے ڈر سے صیغہ طلاق جاری کرے - تو یہ طلاق صحیح نہ ہوگی اور تشدد اور جبر سے مراد یہ ہے کہ اس کو طلاق نہ دینے پر جانی یا مالی یا عزت کے نقصان کی دھمکی دی جائے اور دھمکی دینے والا ایسا کر بھی سکتا ہو، جانی نقصان خواہ قتل کی دھمکی ہو خواہ زد و کوب کی خواہ قید وغیرہ کی ہو اور مالی نقصان کی دھمکی خواہ تھوڑے مال کی ہو یا زیادہ کی ہو اور عزت کا نقصان خواہ اس کی ناموس پر دست درازی کی دھمکی ہو یا گالی گلوچ اور فحش کا اس کو ڈر ہو - بہر کیف وہ چیز جو شان اور حالت کے اعتبار سے اس کے لئے قابل برداشت نہ ہو -

(۴) ارادہ ہو - اگر بھول کر یا حالتِ خواب میں یا ویسے غلطی سے صیغہ طلاق منہ پر جاری کرے تو وہ طلاق شمار نہ ہوگا اسی طرح غصہ کی حالت میں اگر منہ سے طلاق کا صیغہ جاری کرے اور قصد طلاق کا نہ ہو - تو یہ بھی طلاق نہیں ہوگی - اور صیغۂ طلاق جاری کرتے وقت قصدِ انشا ضروری ہے ورنہ طلاق واقع نہ ہوگی -

مسئلہ:۔جس عورت کو طلاق دی جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ نکاح دائمی والی ہو اور اگر وہ مدخولہ غیر حاملہ ہو اور مرد بھی حاضر ہو تو ضروری ہے کہ حیض و نفاس سے پاک ہو لیکن عورت غیر مدخولہ یا حاملہ یا جس کا شوہر غائبانہ حالت میں طلاق دے رہا ہو یا اگر حاضر ہو بھی لیکن عورت کے حالات تک رسائی نہ رکھ سکتا ہو تو ایسی عورت کی طلاق میں اس کا حیض و نفاس سے خالی ہونا شرط نہیں ہے۔

مسئلہ:۔حاملہ عورت کو طلاق دی جا سکتی ہے اور اس کی عدت بچہ کی پیدائش پر ختم ہوگی خواہ کم مدت ہو یا زیادہ۔

مسئلہ:۔طلاق کا صیغہ جاری کرتے وقت دو عادل گواہوں کا موجود ہونا اور ان کا سننا ضروری ہے اور بغیر اس کے طلاق صحیح نہیں ہو سکتی۔

طلاق عقل کی روشنی میں

اسلام کے مطابق فطرت قوانین کے ناقابل تنسیخ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی مصلحتوں اور خوبیوں کے پیش نظر خالق کی طرف سے وضع شدہ ہیں کہ تاقیامت ان کا علمی پہلو اضمحلال پذیر نہیں ہو سکتا۔ من جملہ انہی قوانین کے اسلام نے مرد و عورت کے باہمی تعلقات کی ناشگفتگی کی صورت میں تعلق زوجیت کو ختم کر دینے کا حکم صادر فرمایا ہے جسے طلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اسلام نے اس قانون کی رو سے ازدواجی زندگی سے ان ناخوشگوار خدشات کا ازالہ فرما دیا ہے جو طلاق کے غیر مروج ہونے کی صورت میں مرد و عورت کو پیش آتے تھے۔ جن سے ہر دو کی زندگی انتہائی بدمزگی سے بسر ہوتی تھی اور ازدواجی تعلق ہر دو کے لئے حلق کا کانٹا بن کر جان لیوا ہو جاتا تھا۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مرد و عورت کی زندگی میں ایسی مسرت افزا اور قلب پرور روح موجود ہو کہ ان کا ہر ہر لمحہ باہمی انس اور پیار سے معمور ہو، ان کا دل باہمی تعاون کے پر خلوص جذبات کا آئینہ دار ہو اور ان کا ظرف خاطر آپس کی ہمدردی اور خیر خواہی کی بے پناہ دولت سے لبریز ہو، محبت سے اٹھنا بیٹھنا ہو اور پیار کا رہنا سہنا ہو۔ تاکہ ان کے دل و دماغ ہر قسم کی دنیاوی الجھنوں سے مطمئن ہو کر اللہ کی نعمات کا شکریہ ادا کر سکیں، مرد کا عورت کے ساتھ خلوص ایسا ہو کہ عورت خواہ ہزار ہا تفکرات و ہموم میں گرفتار ہو۔ لاکھ غم و اندوہ میں تڑپ رہی ہو لیکن جب ہی اس کی نظر مرد کے چہرہ پر پڑے تو اس کی ساری کوفت دور اور غم کافور ہو جائے اور عورت بھی ایسی صاحب وفا اور باحیا اور مرد کی غمگسار ہو کہ مرد کی دن بھر کی تھکان کو اس کی ایک سادہ سی لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ راہ گیر ملک عدم کر دے اور اسی قسم کے مضامین کی احادیث بھی خانوادہ عصمت سے وارد ہیں۔

پس اسی بنا پر اسلام نے مرد و عورت ہر دو کی آزادی اور خیر و خوشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے قفل زوجیت کو بے کلید نہیں بنایا بلکہ اگر مرد و عورت کے تعلقات میں سازگاری کی کوئی صورت نہ ہو، آپس کا باہمی رجحان مفقود ہو

اور دل سے ایک دوسرے سے بیزار ہوں تو فراخدلی اور کشادہ روئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزادانہ فضا میں بذریعہ طلاق ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں تاکہ مرد عورت کے لئے گلے کے ہار کی بجائے خار نہ بنا رہے اور عورت مرد کے لئے رُوح کی بہار کی بجائے فضائے دل فگار نہ بنی رہے۔ پس جب تک اچھا نبھا ہو سکے تو ٹھیک ورنہ ایک دوسرے کے لئے بارِ خاطر بنے رہنے سے پوری زندگی کو وبال جان بنانے سے کیا فائدہ؟

پس نکاح کے ساتھ ساتھ حکم طلاق عورت و مرد کی خوشگوار زندگی کے لئے وہ پُر از مصلحت اور سراپا حکمت قانون ہے جس میں تا ابد کوئی تزلزل آہی نہیں سکتا۔ جو لوگ صیغہ طلاق کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا اسے عورت کی توہین قرار دیتے ہیں انہیں آزادانہ طور پر یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ باہمی نفرت کی صورت میں ان کو بزوری ایک دوسرے سے میل جول رکھنے کے لئے مجبور کرنا ان ہر دو کو زندہ درگور کرنے کے مترادف نہیں؟ اور کیا باہمی محبت ایسی چیز ہے کہ مجبور کئے جانے سے واپس آسکتی ہے؟ اور کیا اس قسم کے ناخوشگوار حالات میں قیدِ نکاح ان کے لئے زنجیر غلامی نہیں؟ بلکہ جسمانی قیود سے روحانی قیود کہیں زیادہ مہلک و جان فرسا ہوا کرتی ہیں۔ وہ ممالک جہاں طلاق کو مدتِ مدید سے عورت کی توہین سمجھا جاتا رہا ہے وہ بھی ان جیسی مشکلات و مصائب کا جائزہ لیتے ہوئے آج طلاق کو قانونی شکل دینے پر مجبور ہو گئے ہیں جسے اسلام نے تیرہ چودہ سو سال پیشتر ترویج دے کر ناقابلِ تنسیخ قرار دیا تھا۔

مرد سے حقِ طلاق کو سلب کرنا، یا اس پر پابندی عائد کرنا عورت کی طرفداری اور خیر خواہی نہیں بلکہ یہ ایک ناعاقبت اندیشی اور کور دماغی ہے جسے کوئی عقلِ سلیم دامنِ قبولیت میں جگہ دینے کو تیار نہیں۔

عورت کا ایک مرد سے طلاق حاصل کر کے دوسرے کے نکاح میں جانا اس کی توہین نہیں بلکہ فطری حق ہے اور آزاد مزاجی کا مظاہرہ ہے اور اسی طرح مرد کا ناسازگار حالات میں عورت کو اپنی قیدِ نکاح سے آزاد کرنا اس کی منصف مزاجی اور فراخدلی کا ثبوت ہے اور بخلاف اس کے دونوں کو مکروہ و ناپسندیدہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرنا صرف تنگدلی ہی نہیں بلکہ ان کو اپنے فطری حقوق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

خلع اور مبارات

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ الخ۔ یعنی جب کوئی مرد عورت کو طلاق دے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ عورت کو دی ہوئی چیز حق مہر وغیرہ اس سے واپس لے لے۔

إِلَّا أَنْ يَخَافَا الخ۔ یہ پہلے حکم سے استثنا ہے یعنی ویسے تو طلاق دینے والا مرد عورت سے کوئی دی ہوئی چیز کو واپس نہیں لے سکتا۔ مگر ایک صورت میں اور وہ یہ کہ دونوں کو یقین ہو کہ وہ بغیر طلاق کے اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مراد یہ ہے کہ عورت سے نشوز یعنی مرد کی نافرمانی اور مرد کے حق میں بداخلاقی ظاہر ہو اور روایاتِ آئمہ طاہرین علیہم السلام میں ہے کہ جب عورت مرد کو کہے کہ میں تیرے اذن کے بغیر گھر سے باہر جاؤں گی اور تیری خوابگاہ پر غیر کو لاؤں گی اور تیرے لئے جنابت سے غسل نہ کروں گی۔ یا یہ کہے کہ میں تیری اطاعت نہ کروں گی یہاں تک

کہ مجھے طلاق دے دے تو ان حالات میں مرد کے لئے عورت سے فدیہ لے کر طلاق دینا جائز ہے۔

پھر اختلاف اس میں ہے کہ ایسی صورت میں مرد، عورت سے فدیہ صرف وہی چیز لے سکتا ہے جو پہلے مہر میں اس کو دے چکا ہو۔ یا اپنے دیئے ہوئے سے فدیہ زیادہ بھی لے سکتا ہے؟ تو اس میں علمائے امامیہ نے دو صورتیں بیان فرمائی ہیں :-

(۱) اگر نافرمانی صرف عورت کی طرف سے ہو اور وہ مرد کے ساتھ آباد ہونا پسند نہ کرتی ہو تو اس صورت میں مرد کے لئے اپنے دیئے ہوئے حق مہر سے زیادہ چیز وصول کرنا جائز ہے اور اس کو خلع کہا جاتا ہے۔

(۲) اور اگر بغض و ناراضگی ہر دو طرف سے ہو اور دونوں ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں اور اللہ کی حدود کو توڑنے کا دونوں سے خطرہ ہو تو اس صورت میں مرد عورت سے صرف اسی قدر وصول کر سکتا ہے جس قدر اس کو دے چکا ہے اور اس کو مبارات کہا جاتا ہے۔

مسئلہ :- خلع اور مبارات کا صیغہ جاری کرتے وقت انہی شرائط کا ہونا ضروری ہے جو طلاق کے صیغہ کے وقت معتبر ہوا کرتی ہے۔ نیز خلع اور مبارات کے صیغہ میں طلاق کا ذکر کرنا بھی لازمی ہوا کرتا ہے۔

خلع کا صیغہ

خلع کرنے والا مرد عورت کو یوں کہے :- خَلَعْتُكِ عَلٰی کَذَا (یہاں فدیہ کا ذکر کرے) فَاَنْتِ طَالِقٌ - یا کہے :- خَلَعْتُ زَوْجَتِیْ فُلَانَۃَ (نام عورت کا) علی کذا (ذکر فدیہ کرے) فَھِیَ طَالِقٌ

اور اگر مرد کی طرف سے وکیل ہو تو کہے :- خَلَعْتُ زَوْجَۃَ مُوَکِّلِیْ (فلانہ نام عورت) عَلٰی کَذَا (ذکر فدیہ) فَھِیَ طَالِقٌ -

مبارات کا صیغہ

مرد عورت کو کہے :- بَارَأْتُكِ عَلٰی کَذَا (ذکر فدیہ) فَاَنْتِ طَالِقٌ - یا کہے :- بَارَأْتُ زَوْجَتِیْ فُلَانَۃَ (نام عورت) عَلٰی کَذَا (ذکر فدیہ) فَھِیَ طَالِقٌ - مرد کا وکیل ہو تو کہے بَارَأْتُ زَوْجَۃَ مُوَکِّلِیْ فُلَانَۃَ (نام عورت) عَلٰی کَذَا (فدیہ) فَھِیَ طَالِقٌ -

مسئلہ :- خلع کی صورت میں اگر عورت فدیہ کی طرف رجوع کرے تو پھر مرد کو بھی عورت کی طرف عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اور مبارات کی صورت میں بھی یہی حکم ہے اور عدت گزر جانے کے بعد نہ عورت کو فدیہ کی طرف رجوع کرنے کا حق ہے اور نہ مرد کو عورت کی طرف رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

مسئلہ :- خلع یا مبارات کی طلاق میں عدت گزرنے کے بعد وہ مرد اس عورت کے ساتھ نکاح جدید کر سکتا ہے کیونکہ یہ طلاق ایک طلاق ہے اور اسی قسم کی تین طلاقوں کے بعد طلاق بائن ہو گی۔ پس وہ مرد اس عورت سے پھر نکاح نہ کر سکے گا

مگر یہ کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرلے اور وہ بشرائط اس کو طلاق دے دے یا مر جائے۔ تو عدت کے بعد یہ مرد اُس سے نکاح کرسکتا ہے چنانچہ بعد والی آیت میں اسی کو بیان کیا جا رہا ہے۔

شانِ نزول جمیلہ بنت عبداللہ۔ ثابت بن قیس کی زوجہ تھی اور اپنے شوہر کو ناپسند کرتی تھی چنانچہ وہ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ گو میں اپنے شوہر میں دینی یا اخلاقی کوئی عیب نہیں پاتی اور اسلام قبول کرنے کے بعد میں خدا کی نافرمانی کو ناپسند کرتی ہوں لیکن میرا شوہر چونکہ سیاہ رنگ، کوتاہ قد اور بدصورت ہے لہٰذا میں اس کے ساتھ کسی صورت میں ہمبستر ہونا گوارا نہیں کرتی (پس میرا شوہر مجھے طلاق دے دے تو ٹھیک ہے کیونکہ اس کے طلاق نہ دینے کی صورت میں مجھے خدا کی نافرمانی میں پڑنے کا ڈر ہے) ثابت دل سے اس کو طلاق دینے پر آمادہ نہ تھا۔ پس یہ آیت اتری۔ ثابت نے کہا کہ مجھے اپنا مہر واپس کردے (اور وہ ایک باغ تھا) حضرت رسول خداؐ نے جمیلہ سے دریافت فرمایا کہ تو اسے وہ باغ واپس کردے گی۔ اُس نے عرض کی کہ حضورؐ! وہ باغ بھی واپس کرتی ہوں اور کچھ زائد بھی دوں گی (بہرکیف یہ مجھے طلاق دے) آپ نے فرمایا کہ بس تو زائد نہ دے بلکہ وہی باغ واپس دے دے۔ پس عورت نے باغ واپس دیا اور ثابت نے اس کو طلاق دے دی۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔ یعنی طلاق خلع کی صورت میں عورت جس قدر بھی فدیہ دے۔ عورت اور مرد دونوں پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہے، نہ عورت کو دینے میں گناہ ہے اور نہ مرد کو لینے میں گناہ ہے۔

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں) یہاں مراد حدود سے خلع، طلاق، رجوع اور عدت وغیرہ ہیں۔

نکتہ لطیفہ جو لوگ اس امر کے قائل ہیں کہ مرد اگر بیک وقت عورت کو تین دفعہ طلاق کہہ دے تو وہ طلاق بائن ہو جاتی ہے اور مرد اس کی طرف رجوع نہیں کرسکتا جب تک کہ عورت دوسرا مرد کرکے اس سے طلاق نہ حاصل کرلے۔ آیت مجیدہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ الخ ان کے مسلک کو کھلے اور غیر مبہم بیان سے باطل کر رہی ہے۔ کیونکہ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ طلاق دو مرتبہ ہے کہ ہر مرتبہ طلاق کے بعد مرد کو رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ۔ یعنی یا تو اس کو خیر و خوبی سے اپنے پاس رکھ لے اور یا احسان و نیکی کے ساتھ جانے دے اگر ایک وقت میں تین طلاق کہنے سے طلاق بائن ہو جاتی تو رجوع کرنے کا قصہ ہی باقی نہ رہتا۔ لہٰذا فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ الخ کے ذکر کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

پس معلوم ہوا کہ تین طلاقوں کی صورت قرآن کے مطابق وہی ہے جو مذہب شیعہ نے بتلائی ہے۔ جس کی قدرے تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے اب ان دو طلاقوں کے بعد تیسری دفعہ جو طلاق دے گا۔ وہ طلاق بائن ہوگی۔ جس کو اگلی آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا

پس اگر (تیسری مرتبہ) اس کو طلاق دے تو وہ عورت اس پر پھر حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ نکاح نہ کرے کسی اور مرد سے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ

اس کے علاوہ۔ پس اگر (یہ دوسرا شوہر اپنی مرضی سے) اسکو طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کرکے نکاح کرلیں بشرطیکہ انکو تسلی ہو کہ اللہ

حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

کی حدود کو قائم کرینگے اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں جنکو بیان فرماتا ہے اس قوم کیلئے جو جانیں۔

طلاق بائن

فَاِنْ طَلَّقَهَا :- پہلے دو رجعی طلاقوں کا ذکر تھا اور یہ تیسری طلاق کا ذکر ہے یعنی اس طلاق کے بعد مرد کو عورت کی طرف نہ عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق ہے اور نہ عدت کے بعد نکاح کرنے کا حق ہے جب تک کہ کسی اور مرد کے نکاح میں نہ جائے پس وہ دوسرا مرد اگر اپنی خوشی سے اس عورت کو طلاق دے دے تو اس کی عدت کے بعد وہ عورت اگر چاہے تو پہلے مرد کے ساتھ نکاح کرا سکتی ہے۔ یہاں یَتَرَاجَعَا سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ عورت پہلے مرد پر صرف رجوع کرنے سے حلال ہو جائے گی بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کرکے نکاح جدید کرلیں تو ان کے لئے جائز ہے جب کہ اللہ کی حدود کو پورا کر سکنے پر ان کو اطمینان حاصل ہو۔

حلالہ کا طریقہ جو عام مسلمانوں میں رائج ہے اس کا بھی قرآن مجید سے کوئی ربط نہیں کیونکہ اولاً تو بیک وقت تین طلاق کرنے سے طلاق بائن نہیں ہوتی جیسا کہ اس سے پہلے ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں بلکہ صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے لہذا حلالہ کی ضرورت ہی نہیں بلکہ مرد کو عدت کے اندر بحکم خدا رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر بالفرض طلاق بائن بھی ہو تب بھی قرآن کی رو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دوسرا شوہر اپنی مرضی سے طلاق دیدے تو پہلا مرد اس عورت کو نکاح میں لے سکتا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہ دوسرے مرد کو پہلے سے ہی طلاق کا پابند کر لیا جائے جیسا کہ حلالہ کرنے والوں میں مروج ہے لہذا دوسرے نکاح کرنے والے سے پہلے شرط کر لینا کہ عورت سے ہمبستری کرکے بعد میں اس کو طلاق کرنا ہوگا۔ قرآنی فیصلہ کے خلاف ہے۔

نیز دوسرے شوہر کی طلاق کے بعد بغیر انتظار عدت گزرنے کے فوراً پہلے مرد کے ساتھ نکاح جدید پڑھا جانا غلط ہے کیونکہ قرآن مجید میں مطلقاً مطلقہ عورت پر تین طہر یا بقول حنفیہ تین حیض عدت کی انتظار واجب ہے جس طرح رکوع ۱۳

میں بیان ہوچکا ہے اور چونکہ مذہب شیعہ قرآنی احکام کی تفصیل اور آیاتِ قرآنیہ کی تشریح صرف ان پاک ہستیوں سے حاصل کرتا ہے جو قرآن مجید کے حقیقی وارث اور عالم ہیں لہذا ان کی فقہی کتب اس قسم کے بے بنیاد و شرمناک فتاوی سے پاک و منزہ ہے۔

اور جناب رسالتمآبؐ کا تاکیدی فرمان :- اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ الخ جس کو ہم نے کتاب کی جلد اوّل میں یعنی مقدمہ تفسیر میں متعدد عنوانات کے تحت فریقین کی کتابوں سے نقل کیا ہے اسی نکتہ کے ماتحت تھا کہ لوگ دامن اہلبیتؑ کو چھوڑ کر راہِ حق سے بھٹک نہ جائیں اور ظاہر ہے کہ فرمانِ نبویؐ کو پس پشت ڈال کر لوگوں نے ہر مرحلہ پر ٹھوکریں کھائیں اور جادۂ حق سے کوسوں دُور رہے اور مسئلہ طلاق وحلالہ وغیرہ میں قرآنی تصریحات کے خلاف جانا صرف اسی وجہ سے ہے کہ اہلبیت عصمتؑ اور دودمانِ رسالتؐ سے علمِ قرآن حاصل نہ کیا گیا۔

مسئلہ :- حضرت امام جعفر صادقؑ علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اگر ایک مرد عورت کو طلاق بائن دیدے اس کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے متعہ کرلے تو متعہ کی مدّت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے مرد کے نکاح میں آسکتی ہے؟

آپؑ نے فرمایا :- کہ نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا الخ یعنی اگر دوسرا مرد اس کو طلاق دے) تب پہلے کے نکاح میں آسکتی ہے اور نکاح متعہ میں چونکہ طلاق ہے نہیں لہذا یہاں دوسرے نکاح کرنے والے سے مراد نکاح دائمی ہے نہ کہ نکاح متعہ۔ تفسیر برہان میں اس مضمون کی متعدّد احادیث منقول ہیں۔

عورت کی ضرر رسانی سے باز رہنے کا حکم

مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر خداوند کریم نے پھر مرد کو بلند حوصلگی اور منصف مزاجی کے ساتھ خانگی معاملات میں اعلے کردار پیش کرنے کی دعوت دی ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق رجعی دو اور عورتیں عدّت ختم ہونے کے نزدیک پہنچ جائیں تو اب تم کو چاہیئے کہ یا تو رجوع کرکے نیکی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو اپنی زوجیّت میں رکھ لو، ورنہ ان کو چھوڑ دو یعنی ان کو عدّت گزارنے دو تاکہ اس کے بعد کوئی اور شوہر کرنے کے قابل ہوں۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی تصریح ہے۔

جاہلی رسوم کے ماتحت بعض مرد عورتوں کو بے جا تنگ کرنا ہی اپنی مردانگی تصوّر کرتے ہیں اور جذبۂ شہوانیت کی تکمیل میں بے اعتدالی اور بے راہ روی ہی ان کو اس قسم کے ظالمانہ اقدام کی دعوت دیتی ہے شریعتِ مقدسہ اسلامیہ نے انسانی جذبات کے منظم و معتدل کرنے میں جسقدر رہنمائی فرمائی یقیناً جملہ ادیانِ عالم ایسی پاکیزہ تعلیمات سے محروم ہیں جسطرح مرد کو جینے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی زندگی کا حق پہنچتا ہے اور عورت مرد کی ازدواجی زندگی چونکہ تعمیر انسانیت کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیّت رکھتی ہے لہذا اس معاملہ میں معتدلانہ روش انسانیت پر احسانِ عظیم ہے جسطرح عورت پر مرد کے جذبات کا احترام ضروری ہے اسی طرح مرد پر بھی شرعی قوانین کے ماتحت عورت کے مفاد کا ملحوظ رکھنا واجب ہے ان دونوں کا ایک دوسرے کے درپے ایذا ہونا صرف ان دونوں کے لئے ہی بربادی کا موجب نہیں ہے بلکہ اس سے ان دونوں کا وجود صحیفۂ انسانیت پر ایک بدنما داغ بن جاتا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْ

اور جب طلاق دو عورتوں کو پس عدت گزرنے) کو پہنچ جائیں۔ تو یا رکھ لو ان کو (رجوع کر کے) ساتھ نیکی کے یا چھوڑ دو

هُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ

ان کو ساتھ نیکی کے اور نہ رکھو ان کو رجوع کر کے) واسطے ضرر کے تاکہ ان پر ظلم کرو اور جو ایسا کرے گا

ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا

تو تحقیق اس نے ظلم کیا اپنے نفس پر اور نہ کرو خدا کے احکام کی بے قدری اور یاد کرو اپنے اوپر

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ

اللہ کی نعمت اور جو نازل فرمائی اس نے تم پر کتاب اور علم شریعت کو

يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

اس کے ذریعے تمہیں نصیحت فرماتا ہے اور خدا سے ڈرو اور جانو۔ کہ تحقیق اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

شانِ نزول

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ الخ۔ کہتے ہیں کہ ابتداء میں عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ عورتوں کو طلاق دے دیتے تھے اور جب اس کی عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تھی تو رجوع کر لیتے تھے اور پھر طلاق دے دیتے تھے اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتے تھے اور یہی سلسلہ متواتر جاری رکھ کر عورتوں کو بے جا اذیت پہنچاتے تھے کہ وہ نہایت ہی تلخ زندگی گزارتی تھیں پس ان آیات میں خداوندکریم نے مردوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ عورتوں کو تکلیف پہنچانے کے لئے رجوع نہ کریں بلکہ اچھے طریقہ سے رہنے سہنے کے لئے رجوع کریں۔ ورنہ ان کو آزادی سے عدت گزار کر کسی اور جگہ نکاح کرنے کا موقع دیں اور رجوع کا اختیار بھی صرف دو طلاقوں تک ہے کیونکہ تیسری طلاق بائن ہے

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا الخ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے ایک روایت میں منقول ہے۔ کہ جو شخص کسی غنی سے ملے اور اس کے غنی ہونے کی وجہ سے اس کے سامنے جھکے تو گویا اس نے اپنا دو تہائی دین ضائع کیا اور اس امت میں سے جو شخص قرآن پڑھنے کے باوجود جہنم میں جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات کی بے قدری کرتا تھا۔

(برہان)

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ

اور جب تم طلاق دو عورتوں کو ۔ پس عدت کو پہنچ جائیں تو ان کو نہ روکو ۔ اس بات سے کہ نکاح کریں

أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ

اپنے (ہونے والے) شوہروں سے جبکہ وہ آپس میں راضی ہوں ساتھ نیکی کے ان احکام کے ساتھ نصیحت کی

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ

جاتی ہے ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہوں ۔ اللہ اور روز قیامت پر ۔ یہ (قبول نصیحت) تمہارے لئے خوب تر اور پاکیزہ تر ہے

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۳۲)

اور خدا جانتا ہے (تمہاری دنیادی و اخروی بہتریوں کو) اور تم بذات خود نہیں جانتے

شانِ نزول

عاصم بن عدی نے اپنی عورت جملاء کو طلاق دی اور عدت کے گزرنے کے بعد اس سے دوبارہ نکاح کرنے کا ارادہ کیا اور عورت بھی دوبارہ نکاح کرنے پر راضی تھی لیکن عورت کے بھائی معقل بن یسار نے اپنی بہن کو دوبارہ پہلے شوہر سے نکاح کرنے سے روک دیا پس یہ آیت نازل ہوئی اور کہتے ہیں کہ اس کے بعد معقل نے اپنی بہن کا عقد پھر عاصم سے کر دیا اس بناء پر وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ کا خطاب عورت کے وارثوں اور ولیوں سے ہے کہ عدت گزارنے کے بعد اگر عورت پھر اپنے اسی شوہر سے نکاح پر راضی ہو جائے تو تمہیں حق نہیں کہ ان کو روکو ۔ بلکہ یہ چیز تمہارے لئے زیادہ بہتر اور تمہارے خانگی معاملات میں باعث پاکیزگی ہے ورنہ اگر عورت دل سے چاہتی ہو اور اس کے اولیاء اس کو منع کر دیں تو اس کے جذبات مجروح ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کر کے اپنی عاقبت بھی خراب کر لے اور خاندان کی ناموس کو بھی داغدار کرے لہذا اس کو اپنے جائز حق سے محروم نہ کیا جائے تاکہ فعل حرام کا خیال اس کے دل میں پیدا ہی نہ ہو ۔

علامہ طبرسی نے اس وجہ کو پسند نہیں فرمایا بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ کا خطاب طلاق دینے والوں سے ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت ختم ہونے کے قریب پہنچے تو تمہیں جائز نہیں کہ دوسری جگہ اس عورت کے نکاح کرنے کی رکاوٹ کے لئے اور عورت کو بے جا تکلیف پہنچانے کے لئے رجوع کر لو ۔ تاکہ وہ بیچاری بند ہو کر دوسری جگہ نکاح کے قابل نہ ہو ۔

بہرکیف ۔ آیت ہر دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے اور مقصد یہ ہے کہ نہ عورت کے وارثوں کے لئے جائز ہے کہ وہ مطلقہ ہونے کے بعد اس کے نکاح ثانی پر پابندی عائد کریں خواہ وہ اسی سابق شوہر سے کرے یا کسی نئے شوہر سے

کرے اور نہ طلاق دینے والے کے لئے جائز ہے کہ ضرر پہنچانے کے لئے رجوع کرکے عورت کو نکاح ثانی سے روکے

ناجائز رواج

ہمارے ہاں نہایت غلط اور غیرت سوز بلکہ ایمان ربا ایک رواج ہے اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان خواہ کتنے ہی تعلقات کشیدہ ہوں اور عورت باہمی اختلاف کی بناء پر خواہ سالہا سال اپنے میکے میں گزار دے تاہم مرد اس کو طلاق دینا اپنی خود ساختہ غیرت کے خلاف سمجھتے ہیں اور بعض مقامات پر اگر مرد طلاق پر آمادہ ہو بھی جائے تو عورت کے میکے والے اس میں اپنی گھٹتی سمجھتے ہوئے مرد کو طلاق نہیں دینے دیتے اور ایسی صورت میں اگر مرد طلاق دیدے تو عورت کے خاندان اور مرد کے خاندان درمیان سخت قسم کی منافرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جو بعض اوقات ناگفتہ بہ نتائج تک پہنچ جاتی ہے حالانکہ اس قسم کی غیرت قرآن کی رُو سے بدترین بے غیرتی ہے۔

قرآن کا صاف اور غیر مبہم طور پر کھلے لفظوں یہ حکم موجود ہے کہ اگر عورت اور مرد میں باہمی مصالحت و مفاہمت کی صورت نہ ہو سکتی ہو تو مرد کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی قید نکاح سے آزاد کر دے تاکہ ہر دو کی زندگی تلف نہ ہو اور باہمی کشمکش سے کہیں شریعت کی حدود شکنی ان سے نہ ہو اور مرد کا عورت کو ناموافق حالات میں طلاق دے کر آزاد نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے اور شریعت کی حد شکنی ہے اور نیز عورت کے خاندان کا دریں حالات مرد کو طلاق سے روکنا ناجائز اور حرام ہے اور شریعت کی حد شکنی ہے جو کہ گناہ عظیم ہے۔

بعض اوقات مرد عورت کو طلاق دینا بُرا نہیں سمجھتے لیکن صرف عورت کو ایذا دینے کے لئے یا اس لئے کہ عورت اس کے دشمن خاندان میں شادی کرے گی طلاق نہیں دیتے یہ صورت بھی قرآن کی ہدایت کے سراسر خلاف اور گناہ کبیرہ ہے۔

بعض اوقات مرد عورت کو طلاق دے دیتے ہیں لیکن عورت کے میکے والے عورت کو دوبارہ کہیں شادی کرنے سے روک دیتے ہیں اور اسکی دوبارہ شادی اپنی توہین سمجھتے ہیں گزشتہ آیات قرآنیہ کے ظاہر سے انکو اس قسم کی ناجائز حرکات سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے

بہرکیف طلاق کا خدائی ضابطہ گھریلو زندگی کی اصلاح و بہبود کے لئے انتہائی طور پر قرین عقل ہے اور اگر اسی قانون خداوندی کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے اور اپنی خود ساختہ غیرتوں اور شیطانی جذباتی خیالات کو خدا کی تعلیم کردہ غیرت اور قرآنی اصلاحی ہدایات کے ماتحت اپنی قوت ایمانی کے ذریعہ کچل کر شاہراہ شریعت پر گامزن ہونے کی جرأت کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی گھریلو زندگی پر کیف اور خوشگوار نہ ہو مردوں نے اپنے غلط رویئے سے عورتوں کے لئے حیوانیت کی سی بدترین اور تاریک زندگی تجویز کر کے ایک طرف قرآنی ہدایات کی خلاف ورزی کی ہے اور دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا موقعہ دیا ہے جس کے نتائج اور خطرناک ہیں۔

خداوند کریم تمام مومنین کو قرآن و شریعت کے احکام و ضوابط پر چلنے کی توفیق دے تاکہ ہر قسم کے بدنتائج سے محفوظ ہو کر دنیادی و اخروی زندگی کو سنوار سکیں۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ

اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو سال پورے (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پوری مدت دودھ پلانا چاہے

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا

اور باپ پر اُن (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا (لازم ہے) ساتھ نیکی کے (مناسب حال) نہیں تکلیف دیا جاتا (خدائی احکام میں)

وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ

کوئی شخص مگر بقدر وسعت نہ ضرر دیا جائے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے (اور باپ کی عدم

مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ

موجودگی میں) جو بچہ کا وارث ہو اس پر اسی جیسے (احکام) ہیں پس اگر دونوں (ماں باپ قبل از مدت) دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور

عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ

اور مشورہ سے تو پس ان دونوں کو کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم (ماں کے علاوہ کسی اور عورت کا دودھ) پلانا چاہو اپنے بچوں کو تو تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم دیدو

مَآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

جو تم نے دینا کیا ہے ساتھ نیکی کے (حسب حال) اور خدا سے ڈرو اور جانو کہ تحقیق اللہ اس چیز کو جو تم کر رہے ہو دیکھنے والا ہے۔

مطلّقہ کا حق رضاع اور نان و نفقہ

وَالْوَالِدٰتُ :۔ رضاع کے بیان میں ماں باپ اور بیٹے کے لئے اُم ۔ اب اور ابن کا استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ والدہ، والد اور ولد کی لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اُم کا مفہوم والدہ کے مفہوم سے عام ہے اور اب کا مفہوم والد سے عام ہے اور اسی طرح ابن کا مفہوم ولد سے عام ہے چنانچہ دادے اور دادی پر اب اور اُم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن انہیں والد، والدہ نہیں کہا جا سکتا اور پوتے پر ابن کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اسے ولد نہیں کہا جاتا۔ پس اس مقام پر چونکہ حکم کا اختصاص صرف ماں باپ اور بیٹے کے ساتھ تھا لہذا ان خاص لفظوں سے تعبیر کیا گیا۔

يُرْضِعْنَ :۔ فعل مضارع کا صیغہ ہے لیکن یہاں امر کے معنی میں ہے یعنی دُودھ پلائیں اور اس مقام پر امر استحباب کے لئے ہے کیونکہ ماں پر بچے کا دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کے لئے پہلے ماں کا حق ہے

اگر وہ نہ پلانا چاہے یا دوسری پلانے والیوں کی بہ نسبت اُجرت زیادہ طلب کرے تو پھر باپ کسی اور دایہ کی طرف رجوع کرسکتا ہے اسی طرح اگر ماں دودھ کی اُجرت طلب کرے اور کوئی دایہ مفت پلانے کیلئے مل سکتی ہو تب بھی باپ دایہ کی طرف رُجوع کرسکتا ہے۔

حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ۔ دوسال پورے یعنی چوبیس ماہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کم از کم حمل کی مدت چھ ماہ ہے کیونکہ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ حمل اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت تیس (۳۰) ماہ ہے۔ پس جب صرف دودھ پلانے کی کامل مدت دو سال ہے تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہوگی۔

اسی بناء پر یہاں اختلاف ہے کہ آیا ہر بچے کو دودھ پلانے کی مدت دوسال ہے یا دوسال کا عرصہ اُس بچے کے لئے ہے جو چھ ماہ کا پیدا ہو تاکہ حمل اور رضاع مل کر تیس (۳۰) ماہ پورے ہوجائیں۔ ابن عباس سے یہی منقول ہے کہ یہ مدت صرف اسی بچہ کے لئے ہے جو چھ ماہ کا پیدا ہو اگر بچہ سات ماہ کا پیدا ہو اس کی دودھ کی مدت تیئس (۲۳) ماہ ہوگی اور اگر بچہ نو ماہ کا پیدا ہو تو اس کی دودھ کی مدت اکیس (۲۱) ماہ ہوگی"۔

بہرکیف دودھ پلانے کی مدت اس قدر ہوگی کہ حمل کی مدت کے ساتھ مل کر تیس (۳۰) ماہ پورے ہوں۔ اسی بناء پر ہمارے علماء روایت فرماتے ہیں کہ بچے کو اکیس (۲۱) ماہ سے کم دُودھ پلانا بچہ پر ظلم ہے (کیونکہ عام طور پر انتہائی مدت حمل نو ماہ ہی ہُوا کرتی ہے لہٰذا کم از کم مدت رضاع اکیس ماہ ہونی چاہیئے اور اس سے کم کرنا بچے کی حق تلفی ہوگی) اور بعض کہتے ہیں کہ ہر بچے کی دودھ پلانے کی مدت دوسال ہے اور اس سے کمی یا بیشی ناجائز ہے لیکن لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ کے ظاہری الفاظ بتلاتے ہیں کہ دوسال کا عرصہ رضاع کی آخری حد ہے پس جو شخص پورا کرنا چاہے بے شک کرلے لیکن جو نہ پورا کرنا چاہے تو اس پر مدت کا پورا کرنا لازم نہیں ہے البتہ بچے کی مصلحت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مسئلہ:- چونکہ رضاع کی حدِ آخیر دوسال ہے لہٰذا علمائے امامیہ کے نزدیک دوسال کے بعد کی رضاعت شرعی طور پر احکام رضاع پر اثر انداز نہ ہوگی۔ لہٰذا رضاع کے لئے جو احکام حرمت نکاح کے متعلق ہیں وہ دوسال کے اندر ہونے والے رضاع کے لئے ہیں اور دوسال کے بعد کا رضاع حرمتِ نکاح کا موجب نہ ہوگا۔

اَلۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ۔ یعنی وہ شخص جس کا بچہ ہے اور وہ باپ ہی ہوتا ہے اسی بنا پر میں نے مرادی ترجمہ (باپ) ہی کیا ہے۔

رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ۔ اکثر مفسرین سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ بچہ والی عورتیں ہیں جن کو شوہروں نے طلاق دے دی ہو چنانچہ اس سے پہلے طلاق کا ذکر بھی اسی کا قرینہ ہے تاکہ بیان کے تسلسل میں فرق نہ آئے اور اس آیت کی رُو سے بچے کی تربیت کا حق زمانِ رضاعت میں ماں کو حاصل ہے لہٰذا اس مدت تک اس کا خرچہ یعنی روٹی کپڑا باپ پر واجب ہے اگرچہ عدت کے بعد مطلقہ ہونے کی حیثیت سے مرد سے اس کا نان و نفقہ ساقط تھا اور یہ دوسرا قرینہ ہے کہ یہاں ان ماؤں کا ذکر ہے جن کو اپنے شوہروں نے طلاق دے دی ہو ورنہ اگر مطلقہ نہ ہوتیں تو نان و نفقہ

کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ زوجہ کا نان و نفقہ مرد پر واجب ہے خواہ بچے کو دودھ پلائے یا نہ پلائے اور بِالْمَعْرُوفِ سے مراد ہے کہ روٹی و کپڑے میں مرد کی پوزیشن کا لحاظ رکھا جائے یعنی خوش حالی یا بدحالی کی حالت میں اپنی حیثیت کے لحاظ سے اس کو خرچہ ادا کرے۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ ترکیب کے لحاظ سے اس فقرہ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ لَا تُضَآرَّ فعل نہی کا صیغہ ہے معلوم بھی ہو سکتا ہے اور مجہول بھی ہو سکتا ہے اگر معلوم کا صیغہ ہو تو اصل میں لَا تُضَارِرْ ہو گا اور اگر مجہول کا صیغہ ہو تو اصل میں لَا تُضَارَرْ ہو گا۔ اسی طرح باء جارہ سببیت کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور زائدہ بھی ہو سکتی ہے۔ نیز یہ فقرہ گزشتہ فقرہ لَا تُكَلَّفُ الخ سے بدل بھی بنایا جا سکتا ہے چنانچہ بعض قاریوں نے اسی بنا پر لَا تُضَآرُّ رفع کے ساتھ فعل نفی مجہول کا صیغہ قرار دیکر پڑھا ہے پس آیت میں معانی کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) لَا تُضَآرَّ۔ فعل نہی معلوم کا صیغہ قرار دیا جائے اور باء جارہ کو سببیہ بنایا جائے تو معنی یہ ہو گا" نہ ضرر دے بچے کی والدہ بسبب بچے کے۔ یعنی بچے کے باپ پر ناراض ہو کر بچے کو دودھ پلانا نہ چھوڑ دے کیونکہ اس سے بچے کے باپ کو بھی ضرر ہو گی اور بچہ بھی ضرر کا نشانہ بن جائے گا اور اسی طرح مَوْلُوْدٌ لَّهٗ کے لئے بھی اس مناسبت سے فعل محذوف ہو گا یعنی لَا يُضَآرَّ اور معنی ہو گا کہ نہ ضرر دے بچے کا باپ بسبب بچے کے۔ یعنی بچے کی ماں سے ناراض ہو کر اس سے بچہ چھین نہ لے تا اس کی ماں کو ضرر پہنچے کیونکہ اس ضرر میں بچہ بھی شریک ہو گا ان دونوں صورتوں میں بچہ ضرر میں اس لئے شریک ہے کہ ماں کی شفقت سے دُور ہو جائے گا اور نیز ان صورتوں میں باب مفاعلہ کا صیغہ مبالغہ کے لئے ہے ورنہ فعلِ ضرر صرف ایک جانب سے ہے۔

(۲) لَا تُضَآرَّ۔ فعل نہی معلوم کا صیغہ اور باء جارہ کو زائدہ قرار دیا جائے۔ پس معنی یہ ہو گا کہ نہ ضرر دے ماں اپنے بچے کو کہ اس کو دودھ پلانا چھوڑ دے اور نہ ضرر دے باپ بھی اپنے بچے کو کہ ماں سے جُدا کر کے کسی اور دایہ کے حوالہ اس کو کر دے۔

(۳) لَا تُضَآرَّ فعل نہی مجہول کا صیغہ قرار دیا جائے اور باء جارہ سببیت کے معنی میں ہو۔ پس معنی یہ ہو گا کہ نہ ضرر دی جائے والدہ کو بوجہ اپنے بچے کے کہ بلاوجہ اس سے بچہ چھین لیا جائے اور کسی دوسری دایہ کے حوالہ کیا جائے اور نہ ضرر دیا جائے بچے کا باپ بسبب بچے کے کہ ماں اس کو دودھ پلانا چھوڑ دے۔

(۴) ترکیب صرفی و نحوی وہی اور معنی یہ کہ نہ ضرر دی جائے والدہ، مرد کی طرف سے ترک مجامعت کی بوجہ بچہ کے یعنی مرد عورت سے ہمبستر ہونا بچہ کی وجہ سے ترک کر دے تاکہ حمل نہ ہو جائے جس سے عورت کو ضرر ہو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے اسی طرح نہ ضرر دیا جائے مرد عورت کی جانب سے ترک مجامعت کی بسبب بچے کے یعنی عورت بچے کے لحاظ سے مرد کے پاس جانا چھوڑ دے حمل کے ڈر سے جس سے مرد کو ضرر ہو۔ تو ایسی صورت سے گریز کیا جائے اور آئمہؑ سے یہی معنی مروی ہے۔

(۵) لَا تُضَآرَّ - صیغہ نفی مجہول - ہو کہ لَا تُکَلَّفُ سے بدل ہو تو معنی یہ ہوگا کہ احکام شرعیہ میں کسی نفس کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی یعنی بچے کی پرورش میں بھی بچے کے ماں اور باپ کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی کہ بچہ کے وجہ سے ان کو ضرر حاصل ہو - یہ احتمال بیضاوی نے بیان کیا ہے چار احتمالات علاّمہ طبرسی نے بیان فرمائے ہیں اور آخر میں فرمایا ہے کہ ان احتمالات کے درمیان آپس میں کوئی منافات نہیں ہے لہٰذا آیت کو ان تمام معانی پر محمول کرلینا بہتر ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ - یعنی بچے کا باپ اگر مرجائے تو باپ کی طرح بچے کی دودھ پلانے والی کا خرچہ اور ترکِ ضرر کے احکام اس شخص پر عائد ہوں گے جو بچے کا وارث ہوگا یعنی اگر بچے پر موت آجائے تو جو شخص اس کا صحیح وارث متصور ہوگا ان چیزوں کا ذمہ دار بھی وہی ہے اور بعضوں نے وارث سے مراد مرنے والے باپ کا وارث لیا ہے اور علاّمہ طبرسی نے پہلے مطلب کو ترجیح دی ہے۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا الخ یعنی اگر میاں بیوی باہمی مشورہ و رضامندی سے دو سال سے پہلے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ ملحوظ اس میں بچے کی مصلحت ہے اور ان معاملات کو بہ نسبت باپ کے ماں اچھا سمجھ سکتی ہے اور ہر دو کا مشورہ و رضامندی بچے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے پس اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو پھر دو سال کی مدت کو پورا کیا جائے گا۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ - اگر ماں بچے کو دودھ پلانے سے انکار کردے یا دودھ کی اُجرت طلب کرے اور کوئی دوسری عورت مفت دودھ پلانے پر حاضر ہو۔ یا ماں دوسری دودھ پلانے والیوں سے زیادہ اُجرت طلب کرے، یا ماں بیمار ہو، یا اس کا دودھ نہ ہو، یا اس کا دودھ اتنا کم ہو کہ بچہ نہ پل سکتا ہو۔ تو ان حالات میں بچے کا باپ دودھ پلانے کے لئے کسی اور دایہ کی طرف رجوع کرسکتا ہے اور خداوند کریم اس کے متعلق فرماتا ہے کہ اگر تم دوسری عورتوں سے بچوں کو دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ - اس فقرہ کے کئی معانی کئے گئے ہیں۔ یعنی دوسری عورتوں سے پلواؤ۔ بشرطیکہ جس عرصہ تک بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا رہا ہے، خوش اسلوبی اور انصاف پسندی سے اس کو اس مدت کی اُجرت دے دو۔

یا بشرطیکہ تسلیم کرو بچہ جو دوسری عورت کو رضاع کے لئے دے رہے ہو ساتھ معروف کے یعنی آپس کی خوشی و رضامندی سے نہ کہ ماں کی ضرر کی خاطر ایسا کرو۔

یا بشرطیکہ - دودھ اُجرت جو تم نے دینی کی ہے خیر و خوشی اور منصف مزاجی کے ساتھ (حسب حیثیت)

مسئلہ :- ماں پر واجب ہے کہ ولادت کے بعد پہلا دودھ بچے کو ضرور پلائے اور بعض علماء نے اس کی

حد تین دن مقرر کی ہے اس وجوب کا مطلب یہ نہیں کہ ماں مفت پلائے بلکہ اگر چاہے تو مرد سے اس کی اُجرت وصول کر سکتی ہے لیکن اس دودھ کا پلانا اس پر ضروری ہے اور اس کے بعد دو سال تک بچے کو دودھ پلانا ماں پر مستحب ہے اگرچہ اس کی اُجرت وصول کر سکتی ہے۔

مسئلہ :۔ رضاع کے زمانہ میں بچے کی تربیت کا زیادہ حق ماں کو حاصل ہے اور دودھ چھڑانے کے بعد بنا بر فتویٰ مشہور کے سات برس تک لڑکی کی تربیت میں ماں کا حق مقدم ہے اور لڑکی کا سات برس کے بعد اور لڑکے کا دودھ چھڑانے کے بعد تا بلوغ باپ کا تربیت کا حق مقدم ہے اور ماں باپ کی عدم موجودگی میں دادا، اور اس کی عدم موجودگی میں بچے کا قریب ترین رشتہ دار حق تربیت میں دوسروں سے مقدم ہے۔

مسئلہ :۔ بچے کو دودھ پلانے کے لئے عاقلہ مومنہ خوشرو، خوش اخلاق اور پاک دامن عورت کا انتخاب مستحب ہے کیونکہ دودھ کا طبیعت اخلاق اور شکل پر اثر ہوا کرتا ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے اسی مضمون کی متعدد احادیث وارد ہیں۔

مسئلہ :۔ بچے کو دودھ پلانے کے ثواب کے متعلق جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ عورت کا بچے کو ایک دفعہ دودھ پلانا ایسا ہے جیسا کہ راہ خدا میں غلام آزاد کیا جائے اور جب بچے کا دودھ چھڑائے تو خدا کی طرف سے ایک منادی ندا کرتا ہے کہ اے عورت تیرے گذشتہ گناہ معاف ہو گئے۔

تنبیہ :۔ بچے پر اس کی تربیت کا کافی اثر ہوتا ہے اور خصوصاً ماں کی صورت و سیرت بچے کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں اور صرف ماں کی گود کی تربیت ہی بچے پر موثر نہیں بلکہ شکم مادر میں بھی بچہ پر ماں کے اخلاق و کردار کا کافی اثر پڑتا ہے جس طرح اچھی غذا اندرون شکم بچے کی جسمانیت پر اچھے اثرات ظاہر کرتی ہے اسی طرح غذا کی پاکیزگی اور اس کی حلیت بچے کی روحانی صلاحیتوں کے لئے سنگِ بنیاد ہوتی ہے نیز ماں کی اپنی پاکیزگی نیک کرداری، نیک چلنی اور اخلاق حمیدہ و عادات شریفہ سے آراستگی بچے کے نیک اطوار اور خوش کردار ہونے کا پیش خیمہ بنتی ہے اور بعد از ولادت جب تک بچہ کی غذا کا خزینہ اپنی ماں کا سینہ رہتا ہے لازمی طور پر بچہ پر سابق اثرات کا تواردِ تکوینی طور پر ہوتا رہتا ہے اور اس دوران میں ماں کی ظاہری طہارت بچے کی ظاہری و باطنی برتری کے لئے اساس و بنیاد ہوا کرتی ہے اور اس کے برعکس حمل اور رضاع کے زمانہ میں ماں کی غیر محتاط روش طہارت و نجاست میں لاپرواہی اور حلیت و حرمت غذا میں بے توجہی تکوینی اور وضعی طور پر بچے پر بُرے اثرات کی موجب بنتی ہے اگر اس دوران میں تربیت شکستہ ہوگی تو نتیجتہً بچے کی شکستگی طینت معرض ظہور میں آئے گی اور زمانِ رضاع کے بعد کی تربیت کا اگرچہ اولاد پر اثر ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت اکتسابی ہُوا کرتی ہے وہ قطعاً بچے کی طینت و فطرت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا خوش نصیب اس بچے کے جس کی فطری و اکتسابی صلاحیتوں کے لئے اس کے ماں باپ اچھے اثرات کے

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ

اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کو انتظار کرنی

بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا

چاہیئے اپنے نفسوں میں۔ چار ماہ اور دس دن پس جب پہنچیں اپنی مدت کو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس چیز

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

کے بارے میں جو وہ کریں اپنے نفسوں کے حق میں ساتھ نیکی کے (یعنی جائز طریقہ سے نکاح) اور خدا اس چیز سے جو تم بجالاتے ہو آگاہ ہے۔

موجب بنیں رضاع کے شرائط اور اس کے باقی احکام اپنے مناسب مقام پر حسب ضرورت بیان ہوں گے۔

عدّتِ وفات کا بیان

مسئلہ:۔ جس عورت کا شوہر مرجائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے خواہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ ہو صغیرہ ہو یا یائسہ۔ اور اگر عورت حاملہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ دس دن گذرنے سے پہلے وضع حمل ہو جائے یعنی بچہ اس مدت سے پہلے پیدا ہو جائے تو عدت اس کی یہی مدت ہے یعنی چار ماہ اور دس دن اور اگر اس مدت کے اندر عورت کا وضع حمل نہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہوگی۔

مسئلہ:۔ وفات کی عدت کے زمانہ میں عورت پر سرمہ کاجل سُرخی لگانا اور گھر سے باہر جانا حرام ہے۔
اسی طرح عمدہ لباس پہننا تیل، خوشبو لگانا، مہندی لگانا، زیور سنگار کرنا پوڈر ملنا وغیرہ یعنی جن چیزوں کو زینت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ان پر سب حرام ہیں۔

ہاں اگر زینت کے علاوہ ان چیزوں میں سے کسی کا استعمال کسی خاص ضرورت کے ماتحت کرے تو اسی قدر جائز ہے جس سے وہ ضرورت پوری ہو جائے نیز جسم کی صفائی۔ غسل۔ کنگھی۔ مسواک۔ ناخن تراشی یا بچوں کا بناؤ سنگار حرام نہیں ہے۔

علمی وعقلی تنبیہ: بیوہ عورتوں کے متعلق مختلف اقوام نے جو دستور العمل تجویز کئے ہوئے تھے وہ عقلی واصولی طور پر انسانیت کے لئے قطعاً ناقابلِ برداشت تھے ہندوؤں میں ستی کی رسم کو اہمیت حاصل تھی یعنی بیوہ عورت کو اپنے متوفی شوہر کے ساتھ نذر آتش کر دیا جاتا تھا اور عربوں میں زمانہ جاہلیت میں بیوہ عورت کی عدت ایک سال تھی اور بعض اقوام کے نزدیک بیوہ عورت کا شادی کرنا بالکل ناجائز تھا۔ پس اسلام نے زندگی کے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ

اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں کہ اشارہ (کنایہ) سے کرو خواستگاری (عدت والی) عورتوں کی یا پوشیدہ رکھو

أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُو

اپنے دلوں میں۔ خدا جانتا ہے کہ تحقیق تم عنقریب ان (عورتوں) کا ذکر کرو گے۔

نَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا

لیکن ان سے (صاف نکاح کا) وعدہ نہ لو چپکے چپکے (عدت ختم ہونے سے پہلے) مگر یہ کہ کہو اچھے طریقہ سے (بطور

مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ

کنایہ کے) اور نہ قصد کرو نکاح کا۔ یہاں تک کہ پہنچ جائے (حکم) قرآن اپنی

أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ

(مقررہ) حد (عدت) کو اور جانو تحقیق خدا جانتا ہے وہ جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے ڈرو

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾ ع

اور جانو تحقیق خدا بہت بخشنے والا، علم کرنے والا ہے

ہر شعبے میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ حصہ دار قرار دے دیا۔ یعنی جس طرح مرد کو بیوی کے مرنے کے بعد شادی کرنے کا حق ہے اسی طرح عورت بھی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد عدت گزرنے کے بعد شادی کر سکتی ہے۔

عدت کے اندر پیغام نکاح کی ممانعت

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ الخ۔ عورتوں کے عدت کے زمانہ میں اس کو صاف طور پر کھلے لفظوں میں نکاح کا پیغام دینا ممنوع ہے البتہ اشارے اور کنائے سے اپنی خواہش کا اظہار جائز ہے یعنی عورت کو سنا کر ایسے الفاظ کہے کہ وہ سمجھ جائے کہ میرے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہے۔

وَلَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا۔ اس کا ایک ترجمہ تو وہی ہے جو تحت اللفظ موجود ہے اور دوسرا یہ کہ سر کا معنی علیحدگی اور خلوت کرنے کا وعدہ نہ لو کیونکہ یہ چیز برائی کی طرف دعوت دیتی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ سر کا معنی زنا ہو۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا

نہیں گناہ تم پر اگر طلاق دو عورتوں کو جبکہ تم نے ان سے مَس (جماع) نہ کیا ہو یا مہر ان کا مقرر

لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ

نہ کیا ہو　اور فائدہ پہنچاؤ ان کو خوش حال اپنی حیثیت سے اور تنگدست اپنی حیثیت سے

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ

فائدہ ساتھ نیکی کے (حسب حال) یہ واجب ہے اوپر فرض شناس لوگوں کے　اور اگر طلاق دو ان کو قبل مس (جماع) کرنے

أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

کے درانحالیکہ مقرر کر چکے ہو تم ان کے لئے مہر تو پس آدھا حصہ مہر مقرر کا (ان کو دے دو) مگر یہ کہ وہ معاف کر

إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا

دے یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں گرہ نکاح کی ہے اور تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ

أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

قریب ہے اور مت بھلاؤ آپس میں فضل واحسان کرنا۔ تحقیق اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔

یعنی ان سے زنا کا وعدہ نہ لو اور سِتر کا معنی جماع کیا گیا ہے۔ بہرکیف عدّت والی عورت سے صراحتاً نکاح وشادی کا ذکر کرنا یا علیحدگی وخلوت میں اس قسم کی باتیں کرنا ناجائز ہے۔ وَلَا تَعْزِمُوا۔ الخ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عدّت ختم ہونے سے پہلے ان سے نکاح نہ کرلو بلکہ نکاح کا عقد عدت کے بعد ہی ہو سکتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ عدّت کے بعد نکاح کرنے کا دوران عدّت میں ارادہ بھی نہ کرو کیونکہ اَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ۔ کے الفاظ صاف بتلاتے ہیں کہ ختم عدّت کے بعد نکاح کا ارادہ ابھی سے جائز ہے۔ مسئلہ:۔ عدّت کے اندر عورت سے اگر نکاح کیا جائے تو نکاح باطل ہے اور جان بوجھ کر ایسا کرنے سے وہ عورت اس مرد پر حرام مؤبد ہو جاتی ہے۔

رکوع ۱۵

غیر مدخولہ عورت کی طلاق

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ گویا وہم پڑتا ہے کہ شاید عورت کو قبل دخول طلاق دینا ممنوع ہو۔ پس ارشاد فرمایا کہ ایسا نہیں۔

بلکہ اگر مرد چاہے تو قبل دخول کے اپنی عورت کو طلاق دے سکتا ہے اسی طرح جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا ہو اس کو بھی طلاق دے سکتا ہے لیکن اس کو کچھ نہ کچھ (حسب حیثیت) فائدہ پہنچانا ضروری ہوگا۔ تفصیل اس کی یوں سمجھئے کہ جس عورت کو طلاق دے رہا ہے وہ مس شدہ (مدخولہ) ہے یا غیر مس شدہ (غیر مدخولہ) ہے اور ہر دو صورتوں میں اس کا مہر مقرر ہے یا مہر مقرر نہیں۔

(۱) اگر مدخولہ ہے اور مہر مقرر شدہ ہے تو اس کی طلاق کے لئے وہ ہی شرائط ہیں جو گذر چکی ہیں اور ایسی مطلقہ پورے مہر کی حقدار ہوتی ہے مہر کے علاوہ اس کو کچھ دینا واجب نہیں ہے۔

(۲) اگر مدخولہ ہو اور مہر اس کا مقرر شدہ نہ ہو تو طلاق کی شرطیں وہی ہیں لیکن خاندان، عمر، شکل و صورت و دیگر اوصاف کے لحاظ سے اس جیسی عورتوں کے لئے جسقدر حق مہر ہونا چاہیئے وہ اس کو دینا پڑے گا۔

(۳) اگر غیر مدخولہ ہو اور مہر مقرر ہو تو طلاق میں باقی شرطیں ضروری ہیں صرف حیض سے پاک ہونا عورت کا ضروری نہیں بلکہ غیر مدخولہ کو حالتِ حیض میں بھی طلاق دی جا سکتی ہے اور مقرر شدہ مہر کا نصف عورت کو دینا واجب ہے مگر اس صورت میں کہ عورت اپنا نصف مہر کا حق معاف کر دے یا اُس کا ولی معاف کر دے۔

(۴) اگر غیر مدخولہ ہو اور مہر مقرر نہ ہو تو طلاق میں حسبِ سابق اس کا حیض سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے اور مرد پر اس کو متعہ (فائدہ) پہنچانا واجب ہے اور یہ فائدہ مرد کی حیثیت کے لحاظ سے ہے پس اگر غنی ہو تو گھوڑا یا بلند قیمت کپڑا یا دس دینار دے اور اگر متوسط طبقہ کا آدمی ہو تو پانچ دینار دے اور اگر غریب ہو تو ایک دینار، یا سونے کی انگوٹھی یا چاندی کی انگوٹھی دے دے اور مرد کا غنی یا فقیر یا متوسط طبقہ سے شمار ہونا۔ زمان۔ مکان اور پوزیشن کے لحاظ سے عام عرف کے تابع ہے اسی طرح علماء نے ذکر فرمایا ہے۔

اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَةُ النِّکَاحِ۔ غیر مدخولہ عورت جس کا مہر مقرر ہو اس کو طلاق دینے کی صورت میں مرد پر اس کا نصف مہر ادا کرنا واجب ہوا کرتا ہے مگر یہ کہ عورت اپنا حق یعنی نصف مہر معاف کر دے یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور اس سے مراد عورت کا ولی ہے اور علمائے امامیہ کے نزدیک باکرہ غیر بالغہ لڑکی کا ولی صرف باپ یا دادا ہی ہو سکتے ہیں پس اگر بالغہ ہوگی تو معاف کرنا یا وصول کرنا اس کے اپنے اختیار میں ہے اور نابالغہ ہوگی تو اس کے ولی کو اختیار ہے

مسئلہ:۔ غیر مدخولہ مطلقہ کا ولی پورا نصف مہر معاف کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ بعض حصہ معاف کر سکتا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر لڑکی اپنے ولی (باپ دادا) کے تصرفِ معافی پر ناراض ہو تو اس کا کوئی اثر نہیں بشرطیکہ ولی نے اس کی مصلحت کے لئے ایسا کیا ہو۔

مسئلہ:۔ مطلقہ غیر مدخولہ عورت کی کوئی عدّت نہیں ہوا کرتی بلکہ طلاق کے بعد فوراً اس کا نکاح دوسری جگہ جائز ہے

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۴۰﴾

پابندی کرو نمازوں پر خصوصًا درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے لئے دُعا مانگتے ہوئے

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا

پس اگر تمہیں ڈر ہو تو پس پیدل یا سوار ہو کر (جیسا ممکن ہو نماز پڑھو) پھر جب امن میں ہو جاؤ تو خدا کو

اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۴۱﴾

یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں تعلیم فرمائی اس چیز کی کہ جسے تم نہیں جانتے تھے

نمازِ وسطیٰ کی تاکید

شانِ نزول مجمع البیان میں زید بن ثابت سے مروی ہے کہ جناب رسولِ خدا ظہر کی نماز اوّل وقت میں ادا فرماتے تھے اور یہ نماز تمام باقی نمازوں سے صحابہ پر شاق و دشوار تھی چنانچہ اس نماز میں آپ کے پیچھے ایک یا دو صف نمازیوں کی ہوا کرتی تھی۔ پس آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس نماز میں شریک نہیں ہوتے ان کے گھر جلا دوں۔ پس یہ آیت اتری۔

وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ۔ اس سے مراد اکثر روایاتِ آئمہ میں نماز ظہر ہے اور شانِ نزول کی روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے اگرچہ روایت عامی ہے اور اس کو وُسطیٰ یعنی درمیانی اس لئے کہا گیا ہے کہ دن کے تقریبًا درمیان میں واقع ہوتی ہے ایک روایت میں ہے کہ اس وقت آسمان کے دروازے کھلے ہوتے ہیں یہانتک کہ نماز ظہر ادا کی جائے اور اس وقت دعا مستجاب ہوتی ہے بعض لوگ نمازِ عصر مراد لیتے ہیں کیونکہ دن کی دو نمازوں اور رات کی دو نمازوں کے درمیان ہے بعض لوگ نماز مغرب مراد لیتے ہیں کیونکہ یہ دن اور رات کے درمیان میں واقع ہے اور بعض لوگ نماز عشا مراد لیتے ہیں کیونکہ قصر نہ ہونے والی دو نمازوں کے درمیان میں ہے اور بعض لوگ نماز صبح مراد لیتے ہیں کیونکہ رات اور دن کی دو دو نمازوں کے درمیان ہے کہ وہ دو دو ایک وقت میں ہیں اور یہ تنہا ایک وقت میں ہے اور یہ سفیدی اور سیاہی کے درمیان میں واقع ہے یہ تمام اقوال علامہ طبرسی نے اپنی تفسیر میں نقل فرمائے اور ہر قول کی تائید میں قائلین نے جو حدیثیں پیش کی ہیں انہوں نے وہ بھی ذکر کی ہیں۔ لیکن تفسیر اہلبیت سے صرف پہلا قول ثابت ہے اور وہ یہ کہ نماز ظہر ہی نماز وسطیٰ ہے اور چونکہ آلِ محمدؐ ہی قرآن کے حقیقی مفسر ہیں لہٰذا ان کے فرمان کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول کی کوئی وقعت نہیں ہے چنانچہ ابو بصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ نماز وسطیٰ نماز ظہر ہے اور یہی نماز پہلے پہل حضرت رسالتمآبؐ پر اتری۔ اسی طرح تفسیر برہان میں متعدد روایات مذکور ہیں۔

نماز وسطیٰ کی تاویل

ہم نے کتاب کی جلد اول یعنی مقدمۂ تفسیر میں کئی عنوانات کے تحت میں اشارۃً وصراحتاً اس مطلب کو ظاہر کیا ہے کہ تمام اعمال کی اصل معرفت ہے اور معرفت کے بغیر اعمال شرفِ قبولیت کو نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ مفضل بن عمر کی روایت کے آخری فقرات یہ ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ معرفتِ امام اصل ہے اور جملہ عبادات اس کی فرع ہیں یا یوں سمجھئے کہ معرفتِ امام باطن اور تمام عبادات اس کا ظاہر ہیں۔ پس فرع اور ظاہر کے بغیر اصل اور باطن سے تمسک پکڑنا سراسر غلط بلکہ شرک ہے اور دشمنِ نبیؐ و امامؑ تمام برائیوں کی اصل ہے اور تمام برائیاں اس کی فرع ہیں پس جو شخص اصل سے نفرت کرتا ہو اور برائیوں سے نفرت نہ کرے جو اس کی فروعات اور اس کی پیداوار ہیں۔ تو وہ جھوٹا ہے کیونکہ دشمنِ امام سے نفرت کرنا اصل اور باطن ہے اور تمام برائیوں سے نفرت کرنا اس کی فرع اور ظاہر ہے اور اصل کی پہچان فرع سے ہی ہوا کرتی ہے۔ ہاں یہ بات کہ معرفت حاصل کرلو اور جو جی چاہے کرو۔ درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ امام کی معرفت حاصل کر لینے کے بعد جتنی نیکی کرو مقبول ہے خواہ کم ہو یا زیادہ اور بجز معرفت کے کوئی نیکی نیکی ہی نہیں۔ انتہیٰ۔

پس جب معلوم ہوا کہ معرفت ہر عبادت اور عملِ خیر کی روح ہے اور بغیر اس کے کوئی عبادت عبادت ہی نہیں خواہ وہ نماز ہو یا کوئی اور شے ہو تو اسی بناء پر قرآن مجید میں جس قدر اعمالِ خیر کا ذکر ہے ان کا باطن اہلبیت اطہارؑ کی محبت قرار دینا بالکل درست ہے۔

چنانچہ مقدمہ تفسیر مراۃ الانوار میں بصائر الدرجات سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ قرآن کی دو تہائی ہمارے اور ہمارے شیعوں کے حق میں ہے پس جہاں بھی خیر کا ذکر ہے وہ ہمارے اور ہمارے شیعوں کے لئے ہے اور باقی تہائی میں دوسرے لوگ ہمارے ساتھ شریک ہیں اور جہاں بھی شر کا ذکر ہے وہ ہمارے دشمنوں کے لئے ہے۔

اور اسی کتاب میں کافی سے منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کیا قرآن بولتا بھی ہے؟ آپ نے سائل سے فرمایا کہ ہاں! نماز بھی بولتی ہے اس کی شکل وصورت بھی ہے وہ امر بھی کرتی ہے اور نہی بھی کرتی ہے سعد خفاف راوئ حدیث کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی میرا رنگ فق ہو گیا۔ پس میں نے عرض کی کہ آپ نے ایسی بات فرمائی ہے جس کا اظہار میں لوگوں میں نہیں کر سکتا۔ آپ نے فرمایا۔ لوگ تو ہمارے شیعہ ہی ہیں پس جو شخص نماز کی معرفت نہیں رکھتا۔ وہ ہمارے حق کا منکر ہے پھر فرمایا۔ اے سعد! خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (پ ۲۱) تحقیق نماز

نہی کرتی ہے فحشاء اور منکر سے اور اللہ کا ذکر اکبر ہے)

پس نہی کرنا کلام ہی ہے اور فحشاء و منکر سے مراد کئی لوگ ہیں اور ہم ذکر اللہ ہیں اور ہم اکبر ہیں۔ نیز اسی کتاب میں علل سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ایک مرتبہ صحن کعبہ سے گذر فرما رہے تھے کہ ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور اس کی نماز کو اچھا پایا۔ پس فرمانے لگے۔ اے شخص! کیا تو اپنی نماز کی تاویل کو جانتا ہے؟ اس نے عرض کی۔ اے سید کائنات کے برادر! کیا عبادت گذاری کے علاوہ نماز کی کوئی دوسری تاویل بھی ہے؟ آپ نے فرمایا! اے شخص! جان۔ تحقیق اللہ تبارک و تعالےٰ نے جناب رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث نہیں فرمایا! ساتھ کسی ایسے امر کے جس کی تشبیہ اور تاویل اور تنزیل نہ ہو اور یہ سب کچھ اطاعت کے ماتحت ہے پس جو شخص اپنی نماز کی تاویل کو نہیں سمجھتا تو اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے (صاحب مقدمہ اس کی توجیہہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تاویل سے مراد باطن اور تنزیل سے مراد ظاہر ہے۔)

مقصد یہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ جس قدر اوامر ظاہریہ لائے ہیں ان کی تشبیہ اور مثال ضرور ہے جو باطن کے لحاظ سے مامور اور واجب العمل ہے اور ان ہر دو پر ایمان لانا ضروری ہے پس جو شخص نماز کے باطن کو نہ پہچانتا ہو جس سے مراد امام اور اس کی اطاعت ہے تو اس کی نماز ظاہریہ ناقص ہے۔

باقی تمام عبادات بدنیہ میں سے نماز افضل عبادت ہے اور اس اہم عبادت کو محمدؐ و آل محمدؐ کے علاوہ کسی نے بھی کامل طریق پر ادا نہیں کیا۔ کیونکہ نماز ان کی جان تھی اور یہ نماز کی جان تھے۔ شب و روز میں ایک ہزار رکعت نافلہ کا ادا کرنا انہی کا کام تھا۔ نماز میں مشغول ہو کر اس قدر محو ہو جاتا کہ لوگ سمجھیں دنیا سے گزر گئے گویا نماز اور یہ کالب و جان تھے اور ان کے خدو خال ان کے رنگ ڈھنگ، ان کے گفتار و کردار اور ان کی رگ و پے میں نماز کے آثار ظاہر و ہویدا تھے ان کے جسم کا بال بال، خون کا قطرہ قطرہ، بدن کی رگ رگ نماز و جملہ عبادات الٰہیہ کا مجسمہ تھا۔ ابتداءً دنیا میں تشریف لائے تو گود مادر میں مقام نہ کیا جب تک پہلے سربسجود نہ ہوئے اور جب دنیا کو آخری الوداع کہا تو نماز کے لباس میں۔ پس اس کمال قرب کی وجہ سے گویا یہ نماز کا وجود تھے اور نماز ان کا وجود تھی۔

نیز نماز بلکہ جملہ عبادات کی مقبولیت کے لئے ان کی ولاء و محبت شرط ہے اور اس کے بغیر اعمال کی مقبولیت مشکل بلکہ محال ہے کیونکہ انہی کی ولاء درحقیقت نماز کا درس دیتی ہے اور نماز کا طریقہ سکھاتی ہے اس مطلب کو میں نے جلد اوّل میں ایک مستقل عنوان کے ماتحت قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے پس انہی وجوہات کی بناء پر باطن قرآن میں نماز سے مراد یہی ہیں۔

مقدمہ تفسیر میں باب الصاد میں بعض کتب امامیہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے راوی حدیث داود بن کثیر سے فرمایا! اے داود! اللہ کی کتاب میں نماز ہم ہیں، زکوٰۃ ہم ہیں، روزہ ہم ہیں، حج ہم

ہیں۔ شہر حرام ہم ہیں۔ بلدالحرام ہم ہیں۔ کعبۃ اللہ ہم ہیں۔ قبلۃ اللہ ہم ہیں اور وجہ اللہ ہم ہیں۔ الخبر۔

نیز حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّهَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ کی تاویل میں منقول ہے کہ صبر سے مراد جناب رسالتمآبؐ ہیں اور صلوٰۃ (نماز) سے مراد میری ولایت کا قائم کرنا ہے اسی بناء پر تو خدا نے نماز کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ بھاری ہے اور اس کی طاقت صرف خشوع کرنے والوں کو ہوگی اور خاشعین ہمارے شیعہ ہی ہیں اور صبر کو بھاری نہیں کہا گیا (کیونکہ رسالت کا قائل تو ہر مسلمان ہے)

بروایت عیاشی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ لَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِکَ کی تاویل یہ ہے کہ علیؑ کی ولاء کا ابھی اعلانیہ بیان نہ کرو۔ یہانتک کہ میرا حکم آئے اور لَا تُخَافِتْ بِهَا کی تاویل یہ ہے کہ اس کو بالکل چھپاؤ نہیں بلکہ علیؑ کو اس کی خبر دے دو۔

نیز امام علیہ السلام سے آیت زیر بحث کی تاویل یوں منقول ہے کہ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ میں صلوات سے مراد حضرت رسالتمآبؐ اور حضرت امیرالمومنینؑ اور حضرت فاطمہؑ اور حضرت حسنؑ اور حضرت حسین علیہم السلام ہیں اور نماز وسطیٰ سے مراد صرف حضرت امیرالمومنینؑ ہیں اور قَانِتِیْنَ سے مراد ہے آئمہ کی اطاعت کرنے والے مقصد باطنی طور پر یہ ہوا کہ محمدؐ و آل محمدؐ کی ولاء اور محبت کو اپنے پاس محفوظ رکھو۔ خصوصاً ولائے علیؑ اور اللہ کے سامنے ان کی اطاعت کرتے ہوئے اور ان کے نقش قدم پر گامزن ہوتے ہوئے پیش ہوا کرو۔

اقول حضرت علیؑ کے متعلق زیادہ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں میں اختلاف اسی بزرگوار کی وجہ سے پیدا ہونا تھا اس لئے خدا نے اس کو خصوصیت سے بیان فرمایا۔ ورنہ ان سب کی محبت و ولاء ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ جہنمیوں کا جواب کہ ہم نمازی نہیں تھے۔ کی تاویل میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہ کہیں گے چونکہ ہم آئمہ کی اطاعت نہیں کرتے تھے اس لئے جہنم میں ڈال دیئے گئے ہیں۔

پس ان تمام احادیث کے نقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئمہ طاہرینؑ عبادات ظاہریہ کا باطن ہیں۔ اور نماز وسطیٰ جس کی تاکید کی گئی ہے ظاہر میں گو نماز ظہر ہے لیکن باطن کے لحاظ سے ولائے امیرالمومنین مراد ہے اور اسی پر چونکہ تمام نمازوں کی مقبولیت کا دارومدار ہے لہذا اس کو خصوصی تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔ لیکن ابتداً میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان سے نقل کیا ہے کہ صرف ولائے اہلبیتؑ کا دعوےٰ کرکے عبادت ظاہریہ سے منہ پھیرنا ناجائز ہے ولاء اہلبیتؑ اصل ہے اور عبادات اس کی فرع ہیں اور اصل بغیر فرع کے نہیں ہوتی اور ظاہر و باطن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور اس مطلب کی مزید تفصیل کتاب کی جلد اوّل میں "قرآن" کے

ظاہر و باطن کے عنوان میں اور تادیل قرآن اور عبادات ظاہریہ کے عنوان میں موجود ہے ملاحظہ فرمائیے۔

دعائے قنوت کا بیان

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ۔ تفسیر مجمع البیان میں ابو رجاء العطاردی سے مروی ہے کہ ہمیں ابن عباس نے مسجد بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اس میں رکوع سے پہلے قنوت بھی پڑھا اور رفع یدین بھی کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے کہ یہی وہ نماز وسطیٰ ہے جس میں قنوت پڑھنے کا حکم ہے نیز تفسیر ثعلبی سے بروایت انس بن مالک نقل کیا گیا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ ہمیشہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھا کرتے تھے یہانتک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور قَانِتِيْنَ کا معنی ابن عباس سے یہی منقول ہے یعنی نماز میں بحالت قیام دعا مانگنا۔

صحیح بخاری جلد ۱ سے منقول ہے کہ راوی حدیث کہتا ہے۔ میں نے انس بن مالک سے قنوت کے متعلق دریافت کیا۔ تو انس نے جواب دیا کہ قنوت پڑھا جایا کرتا تھا" میں نے پھر پوچھا۔ کہ رکوع سے پہلے یا پیچھے۔ تو اس نے جواب دیا کہ پہلے۔ میں نے کہا۔ کہ مجھے کسی آدمی نے تیرے متعلق بتایا ہے۔ کہ تو رکوع کے بعد قنوت کہتا ہے۔ انس نے کہا جس نے یہ کہا ہے۔ وہ جھوٹا ہے کیونکہ جناب رسالتمآبؐ نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت پڑھا ہے۔ یعنی اس کے علاوہ وہ ہمیشہ رکوع سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔

قرآن مجید کے اس فرمان پر مذہب شیعہ ہی پورے طور پر عامل ہے اور اہلبیتؑ طاہرین علیہم السلام سے قنوت کے متعلق روایات تواتر سے منقول ہیں۔ حتے کہ فروع کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص قنوت کو بے توجہی کرتے ہوئے چھوڑ دے تو اس کی نماز نماز نہیں۔

وفیہ :۔ بروایت زرارہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس شخص کو دعائے قنوت نماز میں بھول جائے اور گھر جاتے ہوئے راستہ میں یاد آ جائے تو وہیں قبلہ رُخ کھڑے ہو کر پڑھ لے" پھر فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص سنت رسولؐ سے بے توجہی برتے یا اس کو چھوڑ دے۔

وفیہ :۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ قنوت میں [illegible] دعا کا پڑھنا کافی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ ۔ نیز آپ نے ایک اور روایت میں فرمایا کہ قنوت ہر نماز کے لئے ہے خواہ فرض ہو خواہ نافلہ ہو۔

وفیہ :۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ قنوت ہر نماز میں دوسری رکعت کے رکوع سے پہلے ہے۔

مسئلہ :۔ نماز جمعہ میں دو قنوت مستحب ہیں ایک پہلی رکعت میں رکوع سے پہلے اور دوسرا دوسری رکعت

میں رکوع کے بعد۔

مسئلہ :۔ نمازِ وتر ایک رکعت ہوتی ہے لہٰذا اس میں قنوت قبل رکوع پڑھا جاتا ہے۔

مسئلہ :۔ نمازِ عیدین میں نو نو قنوت ہوا کرتے ہیں۔ پہلی رکعت میں پانچ اور دوسری رکعت میں چار۔
(احادیث کو اختصار کے پیشِ نظر ترک کر دیا ہے)

نمازِ خوف کا بیان

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا۔ کافی باب صلوٰۃ خوف۔ عبدالرحمٰن بن ابی عبداللہ روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت مجیدہ کے متعلق سوال کیا۔ کہ نماز کس طرح پڑھے۔ اور کیا پڑھے۔ درحالیکہ چور یا درندہ کا خطرہ ہو۔ آپ نے فرمایا۔ تکبیر الاحرام کہے اور پھر اشارہ سے پڑھتا جائے نیز بروایت ابو بصیر آپ نے فرمایا کہ اگر تم خوفناک زمین میں ہو اور چور یا درندہ کا ڈر ہو تو ایسی حالت میں سواری کے اوپر نماز پڑھ لیا کرو۔

نیز بروایت علی بن جعفر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے۔ راوی نے سوال کیا۔ ایک شخص کے سامنے درندہ آجائے اور نماز کا وقت ہو اور درندہ کے ڈر سے کہیں جا نہ سکتا ہو اگر نماز پڑھتا ہے تو رکوع و سجود میں درندہ کے حملہ کا خطرہ ہے اور درندہ بھی قبلہ کے خلاف جانب میں ہے اگر قبلہ کی طرف منہ کرتا ہے تو درندہ سے ڈرتا ہے پس وہ شخص ان حالات میں کیا کرے؟

آپ نے فرمایا۔ کہ وہ درندہ کی طرف متوجہ رہے اور نماز شروع کر دے اور قیام کی حالت میں ہی ساری نماز پڑھے۔ رکوع و سجود کے لئے اشارہ کرتا رہے۔

پس قرآن مجید کے اس فرمان کا مطلب معلوم ہو گیا۔ کہ فرماتا ہے کہ اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سوار جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لیا کرو"

خداوندکریم نے احکامِ شرعیہ میں انسان کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں رکھا۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتا ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (تحقیق خدا تمہاری آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہاری تنگی نہیں چاہتا)

پس اگر امن کی حالت ہو تو باقاعدہ پورے خشوع و خضوع سے عبادت کو تمام شرائط کے ساتھ بجا لانا ضروری ہے

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً

اور وہ لوگ جو تم میں سے مرجائیں اور چھوڑ جائیں بیویاں وہ وصیت کر جائیں اپنی بیویوں

لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا

کے لئے فائدہ (نان ونفقہ ومکان) کی سال تک کے لئے کہ گھر سے نکال نہ دی جائیں۔ پس اگر خود چلی جائیں

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ

تو تمہیں کوئی گناہ نہیں کہ وہ جو کچھ کریں اپنے نفسوں کے لئے اچھے طریقہ سے اور اللہ تعالیٰ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى

غالب حکمت والا ہے اور طلاق شدہ عورتوں کے لئے فائدہ پہنچانا ساتھ نیکی کے (اچھے طریقہ سے) واجب

الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

ہے متقی لوگوں پر اسی طرح واضح فرماتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تم سمجھو

جیسا کہ خود فرما رہا ہے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ الخ۔ کہ جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ۔ تو خدا کو اُسی طرح یاد کرو جس طرح اُس نے تمہیں تعلیم دی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو جس قدر ممکن ہو اور جیسے ممکن ہو اپنے فرائض کو ادا کرو۔

طلاق شدہ عورتوں کے بعض احکام

وَصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ۔ یہاں فعل محذوف مانا گیا ہے جو وَصِيَّةً کا ناصب ہے یعنی فَلْيُوْصُوْا وَصِيَّةً۔

تفسیر برہان میں تفسیر عیاشی سے بروایت معاویہ بن عمار مرسلاً مروی ہے کہ یہ آیت چار ماہ اور دس روز کی عدت بتلانے والی آیت سے منسوخ ہے اور نیز آیت میراث بھی اس کی ناسخ ہے۔

اور مجمع البیان میں حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پہلے یہ دستور تھا کہ جب ایک شخص مرجاتا تھا تو اس کی بیوہ پر ایک سال تک اسی متوفی کے مال سے خرچ کیا جاتا تھا اور پھر میراث دیئے بغیر اس کو گھر سے نکال دیا جاتا تھا پس اس حکم کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ کی میراث والی آیت نے منسوخ کر دیا۔ پس اب عورت کا خرچ اپنے

حصہ میراث سے ہوگا۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ الخ۔ طلاق شدہ عورت کے حقوق کی تفصیل گذر چکی ہے۔ متعہ (فائدہ پہنچانا) صرف اس مطلقہ کے لئے واجب ہے جو غیر مدخولہ ہو۔ اور اس کا مہر مقرر نہ ہو ورنہ غیر مدخولہ جس کا مہر مقرر ہو اس کو طلاق کے بعد نصف مہر دیا جائے گا۔ اور مدخولہ مطلقہ کو اگر مہر مقرر ہو تو سالم مہر ورنہ مہر مثل دیا جائے گا۔ یعنی مطلقہ کی ان تینوں قسموں کے لئے مذہب امامیہ میں متعہ نہیں ہے۔

بِالْمَعْرُوْفِ ط۔

خداوند حکیم نے ان احکام میں معروف کے لفظ کو بار بار دہرایا ہے اور انہی آیات میں اسی لفظ کا بارہ دفعہ تکرار کیا ہے۔ اس سے مقصود نکاح۔ طلاق اور ان سے متعلقہ جملہ احکام کی اہمیت کو واضح کرنا ہے اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بناتے ہوئے ہر پہلو میں خوش اسلوبی کے برتاؤ کی تاکید ہے اور معروف کی لفظ مقتضائے عقل، حکم شرع اخلاقی فرائض اور بلند کرداری ہر ایک کی رعایت کو شامل ہے۔

نسوانی زندگی پر اسلام کا احسان

عورت کی حیثیت متمدن اور غیر متمدن اقوام میں ہمیشہ جداگانہ رہی ہے لیکن مجموعی طور پر اسے انسانی زندگی کے حقوق سے محروم ہی رکھا گیا ہے۔ بعض ملکوں میں عورت کی حیثیت عام پالتو حیوان کی سی تھی۔ مرد کو کلی اختیار تھا کہ اس کو فروخت کرے یا عاریۃً کسی کو دے دے۔ اسی طرح اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لئے حیوانات کا سا سلوک ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ گھر کے تمام کاروبار کا بوجھ اسی کے سر پر رہتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر حسب ضرورت اس کو ذبح کر کے کھا لینا بھی معیوب نہ تھا بلکہ مرسوم تھا۔

اور بعض ملکوں میں شوہر کی موت عورت کے لئے بدترین طریقہ پر پیغام اجل تھی کیونکہ یا تو اسے نذر آتش یا زندہ درگور کیا جاتا تھا اور یا پھر انتہائی بدحالی، کس مپرسی اور ذلت شعاری کی زندگی کے لمحات گذارنے اس کو نصیب ہوتے تھے۔ عورت کے ساتھ کھانا مرد اپنی توہین سمجھتے تھے عرب لوگ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے پر فخر محسوس کرتے تھے اور جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا بھی ہو جاتی تو شرمساری سے اس کا سر جھک جاتا اور منہ سیاہ ہو جاتا۔ ہاں لڑکوں کی پیدائش پر بڑی خوشی محسوس کرتے اور ان کی کثرت پر ناز کیا کرتے تھے خواہ حلال طریقے سے پیدا ہوئے ہوں یا حرام طریقے سے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ ایک لڑکے کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے متعدد لوگ دعویدار ہو جایا کرتے تھے اور آخر کار قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوا کرتا اور جس کو لڑکا مل جاتا اس کے

گھر خوشی ہوتی اور اس کو تہنیتی پیغامات پہنچتے تھے۔

لڑکی کو زندہ درگور کرنے کی ابتداء بنی تمیم نے کی تھی۔جس کی وجہ یہ ہوئی کہ نعمان بن منذر بادشاہِ عرب کے ساتھ ایک مرتبہ ان کی ٹکر ہوئی جس میں ان کی شکست ہوئی اور نعمان بن منذر نے ان کی بہت سی لڑکیوں کو اپنی اسیری و کنیزی میں لے لیا جس کا انہیں بڑا درد ہوا۔پس اس کے ردّ عمل میں انہوں نے اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کیا اور رفتہ رفتہ ان کی اس بدرسم نے روئی کی آگ بن کر عرب کے دیگر قبائل کو بھی اپنی لپیٹ لے لیا۔

غرضیکہ اسلام سے قبل عورت کی زندگی عمومی طور پر حیواناتی زندگی تھی۔اسلام جو ایک فطری دین ہے۔اس نے عورت کے حقوق کی پامالی پر مبصّرانہ تنقید کرتے ہوئے انسان کو عدل و انصاف کی دعوت دی اور صنفِ نازک کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے انسانی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کیا اور فطرت کے اصولوں پہ مرد و عورت ہر دو کو انسانیّت کی تعمیر و تخریب میں برابر کا ذمّہ دار ٹھہرایا۔پس ابتدائے عالم سے آج تک کی تمام غلط رسوم اور انصاف کش نظریات پر قلمِ نسخ پھیر دیا اور صنفِ نسواں کو حیوانیّت کے تاریک و نحس دور سے نکال کر انہیں انسانیّت کی پاک اور روشن فضا میں رہنے کو جگہ دی۔نیز مردوں کو ان کی اہمیت کی طرف متوجہ فرما کر انہیں ان کا برابر طور پر شریکِ زندگی قرار دیا۔

پیدائشی مساوات

قرآن نے صاف طور پر اور کھلے لفظوں میں اعلان فرمایا کہ ہم نے تم کو نر و مادہ سے پیدا کیا ہے۔یعنی مرد و عورت عالمِ وجود میں انسانی مشینری کے دو اہم پُرزے ہیں اور جس مادہ و عنصر سے مرد کی تخلیق ہوئی ہے، عورت کی پیدائش بھی اسی سے ہے لہذا پیدائشی حق میں عورت مرد کے ساتھ برابر کی حصّہ دار ہے۔

عبادت میں مساوات

قرآن نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ خدا عورت یا مرد میں سے کسی کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا اور نیز ارشاد فرمایا۔کہ اللہ کے نزدیک مکرّم وہ ہے جو اس سے زیادہ تقوٰی کرے۔پس خدا نے اپنے قرب کا معیار تقوٰی کو قرار دے کر عورت و مرد کو برابر طور پر اس کی طرف دعوت دی۔بنابریں منازلِ عرفان و ایقان اور مراتبِ اعمال و افعال میں آگے بڑھنے کے لئے عورت کو مرد کے دوش بدوش چلنے کا حکم دیا۔پس وہ عورت جو ایمان میں راسخ، عمل میں کامل، علم و دانش میں سابق اور حسنِ اخلاق میں بلند ہو وہ اسلامی نقطہ نظر سے ان مردوں سے افضل و ارفع ہے جو ان صفات سے تہی دامن ہوں۔

پس جس طرح مرد ترقی کر سکتا ہے اسی طرح عورت کے لئے بھی یہ راہیں مسدود نہیں۔جنّت کی بشارت میں مرد و عورت دونوں کو یکساں خطاب ہے اور جہنّم کی عقوبت بصورتِ نافرمانی مرد و عورت دونوں کے لئے برابر ہے اور قرآن نے عربوں کی اس رسم کی بھی پُر زور مذمّت فرمائی۔جس کے ماتحت وہ معصوم لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے تھے

بہرکیف اللہ کے نزدیک اطاعت گذار کی قدر و منزلت ہے خواہ مرد ہو یا عورت اور اس کی بارگاہ قرب اور ساحتِ عزّ و شرف سے دُور بلکہ اس کے قہر و غضب کا مورد وہ ہے جو نافرمانی کرے خواہ مرد ہو یا عورت ہو۔

مسلمانوں میں اپنی سابقہ جاہلی رسوم میں سے بعض رسمیں تاحال موجود ہیں۔ مثلاً خداوند کریم کے نزدیک زناکاری گناہ کبیرہ ہے اور اس جُرم کے مرتکب کے لئے سنگساری کی سزا ہے اور عورت و مرد دونوں اس سزا میں شریک ہیں۔ لیکن رسم جاہلی کے ماتحت زنا میں صرف عورت کو مجرم سمجھا جاتا ہے اور مرد کو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا۔ عورت کی زناکاری خاندان کے لئے شرمساری کی موجب سمجھی جاتی ہے اور بخلاف اس کے مرد کی زناکاری پر پورے خاندان میں اگر افتخار کا اظہار نہ بھی ہوتا تاہم شرمساری کا تو نام و نشان ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ عرب کی جاہلی رسم کا ایک شرمناک مظاہرہ ہے۔

تمدنی مساوات

قرآن نے انسانی تمدن میں عورت کو مرد کے ساتھ برابر کا حصّہ دار قرار دیا ہے۔ خورد و نوش اور تمام لوازم زندگی میں جس طرح مرد کمانے کا حق رکھتا ہے اسی طرح عورت بھی حقدار ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ مردوں کے لئے اپنا کمایا اور عورتوں کیلئے اپنا کمایا۔ مرد اگر عورت کا وارث ہے تو عورت بھی مرد کی وارث ہے۔ ہاں ایک طرف اگر وراثت میں مرد کو عورت سے دُگنا دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مصارفِ زندگی میں عورت پر اخراجات کی ذمّہ داری کا کوئی بوجھ نہیں رکھا جاتا۔

پس قرآن نے احکام عبادات و شرائع میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ برابر کا شریک کیا ہے۔ سوائے بعض خصوصی موارد کے جن سے عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جن کا تعلق ان کی صنفی کمزوری و معذوری سے ہے۔ اور اسی طرح صنفی موزونیّت کے ماتحت بعض احکام عورتوں سے ہی اختصاص رکھتے ہیں اور ان سے مرد مستثنیٰ ہیں۔ بالجملہ خداوند کریم نے ہر لحاظ سے عورت کو حیوانیّت کی پست زندگی سے نجات دے کر اسلام کے ذریعہ سے اس کو انسانیّت کی بلند سطح پر قرآن کی روشنی میں قدم آگے بڑھانے کی اجازت دی ہے اور اس کی صنفی اور وضعی بعض کمزوریوں کے پیشِ نظر اس کو بعض ایسے امور میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے جو اس کی وضع کے منافی ہیں جس طرح جنگ و جہاد اور حکومت و قضا وغیرہ اور بعض امور کی پابندی اس پر خصوصیت سے عائد کردی ہے جو اس کی صنفی وضع کے لئے انتہائی طور پر موزوں و مناسب ہیں۔ مثلاً پردہ داری، اطاعتِ شوہر اور تربیتِ اولاد وغیرہ

مسئلہ مساوات کی مزید توضیح

حقوق میں عورت و مرد کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ ہر معاملہ میں عورت مرد کے برابر قرار دی جائے۔ مثال کے طور پر بچّہ، بوڑھا اور جوان سب کی حیثیت یکساں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانی فرائض کی بجاآوری میں بچّہ جوان اور بوڑھا سب کی حیثیت

یکساں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جسمانی ساخت اور مناسب قوتِ برداشت کو ملحوظ رکھ کر ہر ایک کو تمدن میں حصّہ دیا جائے یعنی حِصّہ بقدر جُثّہ۔ اسی طرح فطری احساسات اور جبلّی رجحانات کے موزوں و مناسب تقاضے عورت اور مرد کو تمدنی زندگی میں تقسیم کار پر مجبور کرتے ہیں۔ پس عورت فطری طور پر اپنی مناسب شان سے جس گوشۂ زندگی میں رہنے کی حقدار ہے اُسے اس حد سے پیچھے ہٹانا تفریط اور آگے بڑھانا افراط ہے اور مرد قدرتی طور پر اپنی موزوں اقدار کے ماتحت زندگی کے جس میدان میں قدم رکھنے کا سزاوار ہے اس کا اس حد سے پیچھے رہنا فرض ناشناسی اور کوتاہ اندیشی ہے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرنا حدود سے تجاوز اور اقدارِ الٰہیہ سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

- مرد کی ساخت خشونت آمیز ہے اور اس کے مقابلہ میں عورت کی وضع لطافت و نزاکت کا مرقع ہے۔
- مرد قوّت و توانائی کا مظہر ہے اور بخلاف اس کے عورت کمزوری و ناتوانائی کا مجسمہ ہے۔
- مرد میں چُستی و ہوشیاری اس کی نوعی خصوصیّت ہے اور عورت میں سستی اور تساہل شعاری اس کی صنفی اقتضاء ہے
- مرد کو دل و گردہ مضبوط دیا گیا ہے جو مصائب و آلام میں کوہِ گراں کی طرح جم کر گردشِ دہر کے طوفانی بگولوں کو سر سے گذار سکتا ہے اور انتہائی کڑی اور سنگین منزلوں میں پوری دل جمعی سے حوادثِ زمانہ کا ثباتِ قدم کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے لیکن عورت کے قلب و جگر میں یہ تاب کہاں؟ وہ تو معمولی سے معمولی گھریلو معاملات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانا تو درکنار اُلٹا ان کے الجھاؤ کا موجب بنتی ہے اور تارِ عنکبوت کی طرح انہیں اپنی گردن کا پھندا بنا کر اپنی زندگی بھر کے لمحات کو نیم مُردنی حالت میں تبدیل کر لیتی ہے اور ایک ادنیٰ ترین مصیبت کی چوٹ اس کے جگر کو پاش پاش کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اگر اس کے دل کا غبار اور جگر کا دھواں سحابِ غم بن کر آنکھوں سے برس نہ پڑتا تو ذرہ سی مصیبت اس کے لئے جان لیوا ہو جاتی اور ہر مصیبت و تکلیف ناقابلِ برداشت ہو کر اس کے حرکتِ قلب کے بند ہو جانے کا بہانہ بن جاتی۔
- مزاج کے لحاظ سے مرد میں قوّتِ مفکرہ اس کو بلند کرداری کی دعوت دیتی ہے۔ لہٰذا وہ اصلاح و تسخیرِ عالم میں اپنی قوتوں کو صرف کر کے عالم میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے لیکن عورت کی قوتِ مفکرہ کا محیطِ نظر اور اس کی سوچ بچار کی آخری منزل جسمانی نمائش ظاہری حسن، سحر آفرین وضع قطع اور جاذبِ نظر شکل و صورت تک محدود ہوا کرتی ہے جس کا پس منظر صرف تسخیرِ قلوب اور عمومی نتیجہ تعمیرِ قصرِ محبت و شہوت اور تخریبِ منزلِ معرفت و مروّت ہوتا ہے۔ بالجملہ مرد کا نتیجۂ فکر ہے دین یا دنیا میں سرفرازی یا نام و نمود میں سربلندی اور عورت کا نتیجۂ فکر ہے۔ محبّت بازی اور فریب نگاہی۔ پس اس کے لئے سرِ پرآرائی زیبا اور اس کے لئے حسن آرائی موزوں تر ہے۔

نیز مرد میں خود اعتمادی، خود داری اور احساسِ برتری کا جوہر اس کا فطری نشان ہے لیکن بخلاف اس کے

عورت ان صفات سے یکسر محروم ہے۔ بلکہ عورت کی صنفی پوزیشن ان صفات سے منافی اور متصادم ہے۔
اس قسم کے بے حد وحساب فطری امتیازات موجود ہیں جو مطالعہ قدرت سے زن و مرد کے باہمی تفاوت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر صفاتِ نفس میں آپ غور فرمائیں گے تو بعض صفات جو مردوں میں موجب کمال ہیں وہ عورتوں میں نقص شمار ہوتے ہیں اور اس کے برعکس بعض صفات جو مردوں میں باعثِ نقص ہیں وہ عورتوں میں موجب کمال شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ فطری طور پر عورت و مرد میں کمال کا معیار الگ الگ ہے۔ ہاں بعض مردوں میں اُن کے شایانِ شان صفات کا فقدان اور نامناسب رجحانات کا وجود یا بعض عورتوں میں مردوں کی سی بعض صفاتِ کمال کا ظہور ان کے باہمی صنفی تفاوت پر اثر انداز نہیں ہوسکتا لہٰذا نوعِ انسانی کے فلاح و بہبود کے لئے وضع شدہ قواعد کلیہ اور ضوابطِ عامہ اس قسم کے جزوی اور شاذ و نادر افراد کی خاطر نہ نظر انداز کئے جاسکتے ہیں اور نہ قابلِ تخصیص یا ترمیم ہوسکتے ہیں۔ مسئلہ مساوات کی مکمل وضاحت ہماری کتاب "اسلامی سیاست" میں ملاحظہ فرمادیں۔
بنابریں نوعِ انسانی کی نشوونما اور بقاء ارتقاء کے لئے جب زن و مرد کا باہمی اختلاط صنّاعِ فطرت کے حکیمانہ تدبّر نے ضروری قرار دیا۔ جس کا قرآن مجید نے بطور ارشاد کے اعلان فرمایا ہے تو تمدنی اور معاشرتی اصول کے ماتحت حاکم و محکوم کے تعین اور افسر و ماتحت کے فرق کا انہی فطری اقدار کے ماتحت بطور ضابطہ کے قرآن کی زبان سے کھلے لفظوں میں اعلان فرمادیا کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (مرد عورتوں پر حاکم ہیں) اس میں نہ عورت کی حق تلفی ہے اور نہ مرد کی پاسداری۔ بلکہ یہ فطری اور مناسب تقسیم کار میں ایک اصولی اور برمحل انتخاب ہے اور اعلانِ خالق صرف ارشاد کے طور پر ہے ورنہ عقل سلیم خود عورت کو اس کی فطری پوزیشن کے ماتحت مرد پر حاکمانہ تسلط عطا کرنا انسانیت کی توہین بلکہ موت سمجھتی ہے۔

سلسلۂ نکاح

اسلام نے عورت و مرد کی باہمی آمیزش اور قلبی آویزش کو منظم و مرتب کرنے کے لئے حدبندی کے طور پر سلسلۂ نکاح کا اجراء فرمایا اور اس کے لئے ضروری حدود معین کردیں تاکہ افراط و تفریط کی راہیں مسدود ہوجائیں۔ نکاح کی پابندی میں متعدد خوبیوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جن کا کما حقہٗ احصا اور اس کی مصالح کا واقعی استقصاء فہم بشر سے بالاتر ہے چونکہ انسان کو عالم موجودات میں دستار کرامت کا حامل قرار دیا گیا ہے لہٰذا اس کے عنصری و مادی وجود کو جوہر عقل سے نوازا گیا جو اس ظلمانی ڈھانچے میں علم و معرفت کا روشن چراغ اور نورانی قندیل ہے اگر موجوداتِ عالم کے عام نر و مادہ کے آوارہ جنسی تعلقات کو انسان کے لئے جائز قرار دیا جاتا۔ تو انسان کا طرۂ امتیاز خاک میں مل کر رہ جاتا۔ نیز عقل کا وجود کالعدم ہوتا اور لوحِ انسانیت انسان کے امتیازی نقوش سے خالی رہ جاتی۔
جملہ حیوانات، انسانوں کی طرح جسم و روح کا مجموعہ ہیں۔ ان میں ارادہ۔ شوق۔ غضب شہوت وغیرہ قوتیں

موجود ہیں وہ حواس ظاہریہ اور حواس باطنیہ کے بھی حامل ہیں۔ البتہ صرف جوہر عقل سے وہ محروم ہیں ان میں باہمی جنسی تعلق کا سلسلہ ہے لیکن حواسِ ظاہریہ و باطنیہ کی موجودگی کے باوجود اُن میں جنسی تعلقات کی تنظیم کا شعور نہیں وہ محرم و نامحرم کے احساس سے خالی ہیں۔ ماں، بہن، بہو، بیٹی کی تمیز وہ نہیں کر سکتے۔ نسلی امتیاز ان کی فہم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح وہ اپنی و بیگانی جائز و ناجائز کا فرق نہیں کر سکتے۔ وہ اعتدال و بے اعتدالی کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ ان میں حیا و بے حیائی، شرم و بے شرمی، مروّت و بے مروّتی، عزّت و بے عزّتی۔ شرافت و کمینگی۔ حلال و حرام اور نکاح و زنا کی کوئی تمیز نہیں، لہٰذا ان کی اولاد نہ حلال زادہ ہے نہ حرام زادہ، کیونکہ حلال زادے اور حرام زادے کا فرق تو اس جگہ ہے جہاں حلال و حرام میں فرق بھی ہو۔ لیکن جہاں حلال و حرام میں کوئی امتیاز تک نہ ہو وہاں حلال زادہ یا حرام زادہ کا کوئی معنی ہی نہیں رہتا۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ ان کے پاس عقل موجود نہیں۔ پس اگر انسان جوہر عقل کی موجودگی میں ان مذکورہ بالا معانی کو سمجھنے کے باوجود ان کے وجود و عدم اور اثبات و نفی میں عملی فرق نہ کرے یعنی حلال و حرام، عزّت و بے عزّتی شرافت و کمینگی، محرم و نامحرم، اپنی و بیگانی، اور نکاح و زنا کو سمجھنے کے بعد بھی عملی طور پر حیوانات کی طرح بے تمیزی کا رہنا سہنا برداشت کر لے۔ تو انسان کا وجود صحیفۂ عالم میں کلنک کا ٹیکہ ہوگا جو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے قابل ہو جائے گا۔ پس انسان کا فطری شعور اور طبعی احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے امتیازی نشان کو برقرار رکھتے ہوئے سلسلۂ تولید کو منظم و مرتب طریق سے جاری کرے۔ تاکہ نسلِ انسانی کا سلسلہ آوارگی سے محفوظ رہ سکے اور حلال زادہ و حرام زادہ میں فرق ہو جائے اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے والا انسان بھی وہی ہے جو قیود نکاح کے اندر رہ کر نسلِ انسانی کو حلال طریق سے آگے بڑھائے ورنہ اس میں اور حیوان میں صرف برائے نام ہی فرق ہوگا اور اس کا اپنے تئیں اشرف المخلوقات کہنا صرف لقلقۂ لسانی اور دعوئے زبانی ہوگا۔ ورنہ درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک حیوانات سے بھی بدتر ہوگا کیونکہ حیوان بے چارے تو دولتِ عقل سے محرومی کی بدولت حلال و حرام کی تمیز سے ناآشنا ہیں لہٰذا وہ قابلِ مواخذہ نہیں۔ لیکن اگر انسان تمیز رکھنے کے بعد بھی بدتمیزی کا مرتکب ہو تو ظاہر ہے کہ وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہوگا۔ پس موجوداتِ عالم میں انسان کے لئے پہلا امتیازی نشان ہے سلسلۂ تولید و تناسل کی تنظیم اور زن و مرد کے جنسی تعلقات کا انضباط جس کو زبان شرع میں نکاح کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

تعددِ نکاح

چونکہ فطری طور پر مرد و عورت میں سے ہر ایک اپنی اولاد میں برابر کا شریک ہے جس طرح وہ اولاد مرد کی ہے اسی طرح عورت کی بھی ہے لیکن مرد کی فطری حاکمانہ پوزیشن اور عورت کی فطری محکومانہ زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ جس طرح جملہ معاملات میں ملکیتی پہلو مرد کی طرف منسوب ہوا کرتا ہے مثلاً یہ گھر فلاں کا ہے یہ زمین فلاں کی ہے حالانکہ مرد و بیوی دونوں انتفاع میں برابر کے شریک ہوا کرتے ہیں بلکہ بہ نسبت مرد کے عورت

انتفاع زیادہ حاصل کرتی ہے کیونکہ گھر میں مرد کم رہتا ہے اور عورت زیادہ رہتی ہے اسی طرح تمام خانگی منفعت کی چیزوں میں گو ملکیت مرد کی طرف منسوب ہے لیکن موقع پر زیادہ سے زیادہ فائدہ عورت ہی اٹھا سکتی ہے کیونکہ وہ گھر سے کم باہر نکلتی ہے۔ پس اسی مناسبت سے اولاد کو بھی باپ کی طرف ہی منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں ماں باپ اُن میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

بنابریں عورت کے لئے بیک وقت متعدد نکاح مردوں میں اولاد کے پیشِ نظر نزاع و فساد کا پیش خیمہ تھے جو نوعِ انسانی کے لئے موجب خطر ہے لیکن مرد کے لئے متعدد نکاح اس خطرہ سے باہر ہیں کیونکہ ملکیتی پہلو ہی اسی کی طرف منسوب ہے نیز پہلی صورت میں نسلی امتیاز قطعاً موجود نہیں رہ سکتا اور دوسری صورت میں نسلی امتیاز یقیناً موجود ہے نیز عورت کی محکومانہ پوزیشن اور خانگی امور کی ذمہ داری اور بچوں کی تربیت و نگہداری بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کے لئے اس کو قطعاً اجازت نہیں دیتی۔ بخلاف مرد کے۔ کیونکہ وہ فطری حاکمانہ حیثیت کے ماتحت ان ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہے۔

علاوہ ازیں مرد پیدائشی طور پر تعداد میں عورت سے کم ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ عام ملکوں کی مردم شماری کے اعلانات صاف بتلاتے ہیں کہ عورتیں تعداد میں مردوں سے زیادہ ہیں۔ پس قدرتی نظام اس امر کا متقاضی ہے کہ مرد کے لئے بیک وقت متعدد نکاح کی اجازت ہو۔ ورنہ انسانی عمومی نظام کنٹرول سے باہر ہو جائے گا

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مرد کو جسمانی ساخت قوت و توانائی و جملہ اوصافِ مردانہ کے ماتحت جہادِ دُشمن کا سامنا بھی ہوا کرتا ہے اور عورت سے یہ فریضہ اس کی فطری وضع کے ماتحت ساقط ہے لہذا مردوں کا ایسے مواقع میں مارا جانا خلافِ توقع نہیں اور اگر جنگ نہ بھی ہو تب بھی حفاظتِ مال، جان اور ناموس کے سلسلہ میں مردوں کو متعدد دفع جان پر کھیلنا پڑتا ہے۔ بہرکیف قتل و غارت میں صرف مردوں کا ہی حصہ ہے اور عموماً عورت ان حالات سے بری ہوتی ہے لہذا مرد کیلئے متعدد نکاح اگر جائز نہ ہوتے تو نظامِ انسانی میں ہرج مرج واقع ہو جاتی اور ایک عورت کیلئے بیک وقت متعدد نکاح تو جلتی پر تیل کا کام دیتے پس معلوم ہوا کہ تعدد ازدواج مرد کا فطری حق ہے جس کی قرآن کریم نے ترجمانی فرمائی ہے اس کو مرد کو بے راہ روی یا عورت کی حق تلفی پر محمول کرنا فطری اقدار کا مقابلہ اور قدرتی نظام سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟

مسئلہ عدلِ اسلامی

اور چونکہ ازدواجی زندگی کی بناء اتحاد و تعاون اور اصلاحِ تمدن پر ہے لہذا اس بارے میں تشدد اور زبردستی خواہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی جانب سے ہو۔ انسانیت پر ظلم عظیم ہے ابتدائے عقد میں اگر تشدد یا زبردستی کو عمل میں لایا گیا تو سرے سے عقد ہی فاسد ہے اور ایسے عقود کو قرآنی عدلیہ قطعاً ناقابل تسلیم قرار دیتا ہے اور عقد کے وقوع کے بعد باہمی ازدواجی دَور میں اگر خلاف عدل کوئی بات مرد یا عورت کی جانب سے وقوع پذیر ہو تو شرعی طور پر جُرم عظیم ہے۔ صرف مرد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ عدل

کا مظاہرہ کرے بلکہ جس طرح مرد پر عورت کے حقوق سے عہدہ برآری ضروری ہے۔ اسی طرح عورت پر بھی مرد کے حقوق کی پاسداری واجب ہے جو لوگ مرد کے لئے تعدد ازدواج کے مسئلہ کی تردید کرتے ہیں۔ وہ ظاہراً یہی آڑ لے کر شرعی قانون سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ مرد پر عورتوں کے درمیان عدل کی حدود کیا کیا ہیں اور آیا اس صورت میں عورتوں پر بھی کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں ؟

جہاں تک شرعی ذمہ داری کا تعلق ہے مرد پر عورتوں کے نان ونفقہ اور مکان رہائش کا انتظام ضروری ہے۔ مرد پر یہ ضروری نہیں کہ اپنی تمام منکوحہ عورتوں کے نان ونفقہ اور مکان رہائش میں بھی ہر حیثیت سے مساوات رکھے۔ البتہ اس پر مجموعی طور سے اُن کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے جو ان کے مناسب حال ہو اور سب کے لئے ایک صنف کا کپڑا۔ ایک نوع کا کھانا اور ایک قسم کا مکان وغیرہ خود ساختہ مسائل میں سے ہے جس کی شریعت ذمہ دار نہیں ہے اور اسی طرح مرد پر واجب ہے کہ عورتوں پر شب باشی کو تقسیم کرے اور اس بارہ میں کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ البتہ مباشرت وہمبستری میں مساوات ضروری نہیں۔ نیز محبّت و چاہت میں بھی برابری ضروری نہیں کیونکہ یہ ایک قلبی چیز ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک سے محبّت زیادہ ہو اور دوسری سے کم۔ جس طرح کہ حضرتِ عائشہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آنحضورؐ کی ان سے زیادہ محبّت تھی ہاں ظاہری حقوق واحکام ومعاملات میں شرعی متعینہ حدود سے باہر قدم نہ رکھا جائے اسی طرح عورتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مرد کی مرضی سے قدم آگے نہ بڑھائیں اگر وہ مرد کو خواہ مخواہ تنگ کریں۔ بات بات پر مرد سے نبرد آزمائی اپنا شیوہ بنالیں، معمولی معمولی باتوں میں اُلجھ کر جھگڑا کرنے کی عادت بنالیں۔ ہر معاملہ میں مرد کو موردِ طعن وتشنیع قرار دیں۔ اور اس کی عدالت وانصاف پر نکتہ چینی کریں تو شرعی قانون عورتوں کی اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں اور شر پسندیوں سے ہرگز گردن زدنی نہیں ہو سکتا۔

عورت پر پردہ داری، امور خانہ داری، بچّوں کی پرورش ونگاہ داری وغیرہ کی ذمہ داری ہے جو کہ اس کی جسمانی ووضعی ساخت اور فطری پرداخت سے عین موزوں ومناسب ہے اور اس کے مقابلہ میں مرد حاکمانہ حیثیت سے عورت کے جملہ اخراجاتِ ضروریہ کا ذمہ دار ہے۔ نیز محکومانہ حیثیّت سے وُہ عدل وانصاف کے پیش نظر خانگی منافع سے بہرہ اندوز ہونے کا حق رکھتی ہے اور مرد حاکمانہ حیثیّت سے خانگی، کُلّی وجزئی امور میں مالکانہ اختیارات کا حامل ہے۔

وقوعِ نکاح میں اگرچہ طرفین کی رضامندی ضروری ملحوظ رکھی گئی ہے۔ لیکن مرد کی حاکمانہ پوزیشن کے ماتحت ازدواجی سلسلے کے توڑنے کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے کیونکہ مرد کی ذہنی صلاحیتیں عورت کی ذہنی صلاحیتوں

سے کہیں زیادہ ہیں اور ازدواجی مصالح کو جس طرح مرد سمجھ سکتا ہے، عورت نہیں سمجھ سکتی۔ اسی لئے یہ فیصلہ مرد کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ ہاں بعض نااہل مردوں کی طرف سے قانونِ شرع کی توہین کے مظاہرات قانون کی خرابی کے موجب نہیں ہو سکتے۔

وراثت میں عورت کو مرد سے نصف دیا جاتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں عورت کا خرچہ مرد پر عائد کیا گیا ہے طلاق کے بعد جس طرح مرد کے لئے دوسری عورت سے نکاح جائز ہے اسی طرح عورت کے لئے دوسرا شوہر جائز ہے۔

عدّت کی مصلحت

طلاق یا موت کی صورت میں عورت کو عدّت کا پابند کیا گیا ہے تاکہ عورت کی حیثیت عام حیوانات کی طرح نہ سمجھی جائے کہ ایک ملکیّت کے زائل ہونے کے بعد فوراً دوسری ملکیّت کا پھندا اس کی گردن میں ڈال لیا جائے۔ نیز اس کی محکومانہ زندگی کے پیش نظر اس کو سوچنے کا موقعہ دیا گیا ہے کہ سابقہ تجربات کے ماتحت جدید شوہر کے انتخاب میں اپنے مستقبل کی بہبود کا خیال رکھے اور اندھا دھند دوسرے شوہر کے انتخاب میں عجلت سے کام نہ لے۔ بخلاف اس کے مرد کی چونکہ حاکمانہ پوزیشن ہے لہٰذا اس کو اتنی مدّت کی انتظار کا پابند نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ناخوشگواری کی صورت میں طلاق سے اس کی گلو خلاصی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ بخلاف عورت کے کہ بے سوچے سمجھے نکاح کر لینے کے بعد ناخوشگوار حالات کے رونما ہونے کی صورت میں مرد سے اُس کا طلاق کی خواہش کرنا اس کے وقار کے منافی ہے اور اس کی عفت و پاکدامنی کے لئے مورد طعن ہے۔ کیونکہ مرد کا عورتوں کو بار بار طلاق دینا اتنا معیوب نہیں جتنا کہ عورت کا مردوں سے متواتر طلاق حاصل کر کے ایک کے بعد دوسرے کے نکاح میں جانا معیوب ہے کیونکہ یہ عورت کی خست مزاجی اور گستاخانہ ذہنیت کی دلیل ہے لہٰذا شریعتِ مقدسہ نے ایک مرد سے آزاد ہو جانے کے بعد عورت کو عدّت کا عرصہ آزادانہ طور پر سوچنے کے لئے عطا فرمایا کہ وہ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کو خوب سوچ کر شوہر سابق سے عملی تجربہ جو اُسے ہو چکا ہے اس کے ماتحت پوری طرح غور و خوض کر کے عقدِ جدید کا فیصلہ کرے اور بہر امکانی طریقہ سے ایسی ناخوشگوار فضا میں دیدہ دانستہ کُود پڑنے سے گریز کرے۔ جس کا نتیجہ اختلاف و افتراق ہو اور ظاہر ہے۔ کہ عدّتِ وفات یا عدّتِ طلاق میں عورت کے لئے وقار کا جو پہلو مضمر ہے وہ بلا تاخیر ایک مرد سے دوسرے مرد کی طرف منتقل ہونے میں نہیں ہے اور علاوہ بریں عورت میں حمل کا احتمال بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کو ایک شوہر سے فراغ کے بعد ایک مدت تک آزاد رہنا چاہیئے اور بعض مقامات پر حمل کے نہ ہونے کا یقین ایک کلیہ قاعدہ اور عام قانون کے لئے باعثِ تخصیص نہیں ہو سکتا۔ بالجملہ وفات یا طلاق کے بعد عورت کا عدّت کی انتظار کرنا اور مرد کا انتظار نہ کرنا عورت کی حق تلفی یا مرد کی پاسداری پر مبنی نہیں۔ بلکہ

فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے۔

قانونِ نکاح کی خلاف ورزی کرنے میں جس طرح عورت مجرم ہے اسی طرح مرد مجرم ہے اور ہر دو برابر طور پر سزا کے مستحق ہوا کرتے ہیں اور توبہ کا دروازہ بھی ہر دو کے لئے یکساں کھلا ہے و علیٰ ہذا القیاس۔

خلاصہ بحث

پس معلوم ہوا کہ عورت و مرد حقوق میں برابر ہیں جس طرح مرد کو جینے کا حق ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہے اور اسلام سے قبل عورت جن جن مصائب اور بدترین مظالم کا شکار تھی اسلام نے اس کو اُن سے پوری طرح محفوظ کر لیا۔ لہٰذا عورت و مرد یکساں طور پر میدانِ عمل میں قدم رکھ سکتے ہیں اور خداوند کریم کی بارگاہ میں جس طرح مرد شرفیاب ہو سکتا ہے اسی طرح عورت بھی ہو سکتی ہے۔ نیز اخروی نعمات مرد و عورت دونو کے لئے یکساں ہے اور قربِ خداوندی کے لئے تقویٰ ہر دو کے لئے یکساں طور پر معیار قرار دیا گیا ہے اور علم و معرفت کے دروازے بھی ہر دو کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں اور احکام فروعیہ میں بھی دونوں برابر کے مکلف ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ فطری جداگانہ ساخت اور صنفی باہمی تفاوت کے پیش نظر بعض احکام میں اختلاف ان کی یکسانیت کے اتلاف کا موجب نہیں ہو سکتا۔

پس دینی و دنیاوی ترقی کے لئے عورت و مرد دونوں برابر طور پر آگے قدم بڑھانے کے حقدار ہیں لیکن عورت اپنے فطری راستے پر اور مرد اپنے موزوں طریقہ پر، عورت اپنی مخصوص ذمہ داریوں کی پاسبانی کرتے ہوئے اور مرد اپنے عہدہ کی نگہداشت کرتے ہوئے اور حقوق زندگانی میں مساوات اسی کا نام ہے۔ مرد کا عورت کے حقوق پر دست درازی کرنا یا عورت کا مرد کے حقوق پر ہاتھ ڈالنا اور مرد کا اپنے حقوق سے کوتاہی کرنا، یا عورت کا اپنے حقوق سے غفلت شعاری کر کے اپنی حدود کو پھاندنا افراط و تفریط ہے اسے مساوات کی مقدس لفظ سے تعبیر کرنا انصاف کا خون ہے۔ عورت کا مرد کے دوش بدوش میدانِ عمل میں قدم بڑھانا اگر اپنے اپنے مناسب و موزوں طریق سے ہو اور اپنی اپنی متعینہ حدود کے اندر ہو تو یہی ہے۔ فطرت کا مقرر کردہ سیدھا راستہ جس کو اسلام نے پیش کیا ہے اور اسی کا نام ہے آزادی۔ پس عورت بھی آزادی سے اپنے مقصد کی طرف بڑھے اور مرد بھی آزادانہ اپنے مقصد کی طرف اقدام کریں اور ایک دوسرے کے دوش بدوش دینی و دنیوی ترقیاتی سکیموں کو عملی جامہ پہنائیں لیکن اپنی اپنی حدود کے اندر رہ کر اور یہی ہے اسلامی آزادی و فطری مساوات۔

اشتراکیت کا پس منظر

انسان کے مدنی الطبع ہونے کے پیش نظر اجتماعی زندگی کے اصول کی تشکیل میں نظریات ہمیشہ سے متصادم رہے ہیں اور ہر دور کے عقلاءِ انسانی تمدن میں اصلاح و فلاح کے لئے قوانین مرتب کر کے اجتماعی نظام کی بھلائی کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں لیکن روزِ اوّل سے لے کر قیامت تک کے لئے اسلام نے اجتماعی زندگی کا جو نظام پیش کیا ہے وہ عقلائی تدابیر اور

امکانی مصالح پر حادی ہے۔
اشتراکیت کا ڈھونگ بھی من جملہ انہی نظریات کے ہے جو سیاست مدنیہ اور اجتماعی نظام کی خوبی کے لئے منظر عام پر آئے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے ہر ایک کے لئے ہے اور ہر چیز میں ہر فرد برابر کا شریک ہے۔ اس نظریئے میں صرف انسان کے حیواناتی پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کے امتیازی نشان کو سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ ہر شئے کا ہر ایک کے لئے ہونا مسلّم طور پر حیوانی تخیلات میں سے ہے حیوان کے نظریئے میں زمین کی کسی پیداوار میں ملکیتی رنگ ناجائز تصرّف ہے وہ ماکول و مشروب اور ازدواجی تعلقات میں تخصیصات کے دشمن ہیں۔ لیکن بخلاف اس کے انسان میں عقل و ادراک کا جوہر جو حیوانی زندگی میں اشتراکی نظریئے کے مقاصد کو سمجھتا ہے۔ اُس نے ملکیتی نظریہ اپنایا۔ اور عقولِ انسانی اسی نظریئے کے ماتحت تمدّن و اجتماع کی اصلاح کے لئے ہمیشہ قوانین مرتب کر کے نافذ کرتے رہے لیکن انسان بحیثیت ممکن کے ہزار دانا ہو اور لاکھ دانشمند ہو۔ انسانی اجتماعی زندگی کی جملہ خوبیوں پر محیط نظر اور حادی مطالعہ تو رکھ نہیں سکتا اور نہ تمام مصالح و مفاسد پر عبور اس کے حیطۂ امکان میں ہے یہی وجہ ہے کہ عقلاً زمانہ کے وضع کردہ قوانین ہر دَور میں تنسیخ و ترمیم کی زد میں آتے رہے ہیں اور ایک دور میں جو قانون انتہائی سوچ بچار کے بعد مبنی بر اصلاح قرار پا کر نفاذ پاتا ہے فوراً کچھ عرصہ بعد اس کے مفاسد سامنے آ کر اس کی تنسیخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور قوانین تمدّن میں یہ جوڑ توڑ ہمیشہ سے رہا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہر مقنن اپنے ذاتی جذبات و رجحانات کے ماحول میں تمدّن کی اصلاح سوچتا ہے اور متعدد افراد کے جذبات و خواہشات میں وحدت و یکسانگی نہایت مشکل ہے پس ایک دَور میں جب یک گونہ جذبات میں اکثریت رونما ہو جائے تو اقلیتی جذبات اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ پس اکثریتی رجحان کے ماتحت اجتماعی قانون پاس ہو جاتا ہے اور تھوڑا عرصہ بعد جب اقلیتی فرقہ اپنی تحریک میں اکثریت کا رنگ حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ اس قانون کے مقابلہ میں بغاوت کا علم بلند کر کے دوبارہ مجلس مشاورت کے انعقاد کی دعوت دیتا ہے اور حسب موقعہ اپنی خواہشات کے ماحول میں قانون کو نیا لباس پہنا کر اپنی ذہنی فتح اور دماغی کامیابی پر فخر و مباہات کرتا ہے اور یہی سلسلہ جاری و ساری رہا کرتا ہے۔ بس قانون تمدّن جذبات کے اکثریتی میلان کا نام ہے۔ اس میں فرق نہیں۔ جمہوریت ہو یا شخصیت۔ قانون سازی کی رفتار یہی ہے اور لطف یہ کہ ہر قانون میں ذاتی مفاد کے لئے اور اپنے تئیں اس کی زد سے بچانے کے لئے بعض شقیں ایسی رکھ دی جاتی ہیں۔ جو بوقتِ ضرورت کام میں لائی جا سکیں۔ اسی وجہ سے عوام میں ایک مقولہ مشہور ہے کہ قانون چھوٹے طبقہ پر سوار ہوتا ہے اور بڑا طبقہ قانون پر سوار ہوتا ہے۔
اسلامی قوانین چونکہ خالق کائنات کی طرف سے وضع شدہ ہیں جو عالمی مصالح پر حادی بھی ہیں اور جذبات و خواہشات کے ماحول سے بلند و بالا بھی۔ ان میں یہ امکان نہیں کہ کسی قانون میں کوئی مصلحت عمداً جذباتی طور پر یا سہواً اور

لاعلمی کے رنگ میں نظر انداز کر دی گئی ہوگی۔ تاکہ ترمیم یا تنسیخ کو اس میں سراغ مل سکے۔ البتہ رفتارِ زمانہ اور گردشِ دہر کے پیشِ نظر بعض مصالح عامہ میں تبدیلی ناگزیر ہے جو قانون میں ترمیم و تنسیخ کو دعوت دیا کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادیانِ گذشتہ یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتے رہے اور دورِ اسلام تک نوبت پہنچی۔ اب اس دین کے بعد خدا کی طرف سے کسی نئے دین نے قدم رکھنا نہیں۔ لہٰذا اس کے قوانین میں وہ پختگی و دوام ملحوظ رکھ دیا گیا کہ ادوار و ازمنہ کا تفاوت ان کی مصالح میں تبدیلی پیدا کر کے اُن کو قابلِ نسخ نہ بنا سکے۔

چونکہ خدائی قوانین میں شخصی و انفرادی جذبات و خواہشات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور نہ ان میں برسرِ اقتدار طبقہ کے لئے بعض شقیں ایسی رکھی گئی ہیں کہ بوقتِ ضرورت اُن سے فائدہ اٹھا سکیں بلکہ ان میں تو وہ یکسانیت ملحوظ ہے کہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور فقیر سے لے کر شہنشاہ تک سب کے سب برابر طور پر اس کی زد میں آتے ہیں اور کسی کی ذرّہ بھر رعایت نہیں ہوتی۔

لہٰذا ہر دَور میں انسانوں کا اکثریتی طبقہ اسلامی نقطہ نگاہ سے باغی رہا ہے اور تمدّنی قوانین میں اپنی رائے کو استعمال کرتا چلا آیا ہے تاکہ حکمران طبقہ کے جذبات کا احترام ہو سکے اور کوئی قانون ان کی خواہشات کو کچل نہ سکے جس کا لازمی نتیجہ یہی سامنے آتا رہا ہے کہ قانون نت نئے جنم لیتا ہے اور قانون سازی کی مشین نت نئے پُرزے تیار کرتی ہے اور انسانیت کو کبھی اطمینان و سکون کا سانس نصیب نہیں ہو سکا اور نہ تمدّن و اجتماع میں اصلاح کا پروگرام مرتب ہو سکا بلکہ ہر نیا دن نئے خطرے کا الارم لے کر آیا اور دنیا روز افزوں ترقّی سے بے اطمینانی اور بے چینی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ہلاکت کے قریب سے قریب تر ہوتی گئی اور بایں ہمہ خدائی قانون اور اسلامی نظریہ اپنانے کی جرأت تک نہیں کی گئی کیونکہ اس میں جذبات کا اُلّو سیدھا نہیں ہوتا اور دوسری طرف خود ساختہ قوانین اپنی داخلی بیماریوں اور اندرونی کمزوریوں کے پیشِ نظر تمدّن کی اصلاح اور امنِ عامہ کی بحالی سے خود قاصر ہیں۔ لہٰذا انسانوں کا ایک امن پسند طبقہ اُٹھا اور انہوں نے اشتراکیت کا جھنڈا بلند کر دیا کہ انسانوں کو اپنی موجودہ حیثیت سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیوانی ماحول میں پلٹ جانا چاہیئے ممکن ہے کہ وہاں کچھ اطمینان و سکون نصیب ہو جائے۔ گویا انتہائی مطمحِ نظر اور محطّ فکر صرف یہی نکتہ ہے کہ جذبات و خواہشات کو بھی ٹھیس نہ لگے اور تمدّن کی راہیں بھی ہموار رہیں۔ حالانکہ یہ اجتماعِ ضدین ہے کیونکہ انفرادی جذبات اور شخصی خواہشات کا باہمی اختلاف تضاد بلکہ تصادم تک پہنچ کر اشتراکیت میں بھی چین نہیں لینے دے گا اور نظریۂ اشتراکیت میں بھی صرف بڑے بڑوں کے جذبات کا احترام ہوگا چھوٹے چھوٹوں کے لئے وہی ظلم و تشدّد کے آہنی شکنجے تیار رہیں گے، اچھے محل، عمدہ بیویاں، خوبصورت لباس اعلےٰ مشروبات، نفیس کھانے آرام دہ سواریاں اور قیمتی سامان یہ سب کچھ صرف صاحبان اقتدار کے لئے اور انہی لوازمِ زندگی میں سے ردی و ناقص اشیاء عوام طبقہ کے لئے مخصوص ہوں گی اور بایں ہمہ زبان

پر بلا تامل اشتراکیت کی رٹ جاری ہے کہ ہر شے ہر فرد کے لئے ہے۔

بہر کیف تمدّنی قوانین کے متعلق یہ نظریئے ہیں جو عمومی اجتماعی زندگی سے وابستہ ہیں اور ان کا تعلق صرف اسی فانی اور چار روزہ زندگی سے ہی ہے اور بس۔ ان اجتماعی قوانین میں قطعًا اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ کہ اس دورِ فانی کے بعد انسان کا کوئی اور ٹھکانا بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ہمیں اس کے لئے کیا کرنا ہے۔

اسلامی قوانین کی نظر چونکہ صرف اسی فانی دور تک محدود نہیں بلکہ اس کی نظر اخروی دور پر بھی ہے بلکہ اخروی دور ہی درحقیقت اس کا مطمح نظر ہے یعنی اسلامی نگاہوں میں دُنیاوی زندگی صرف عبوری دَور ہے اور اخروی زندگی قیام وسکون کی حقیقی منزل ہے۔ لہذا اسلام اس فانی زندگی کی اصلاح اُس باقی اور غیر فانی زندگی کے لئے کرتا ہے بنا بریں وہ اس زندگی کی خواہشات و جذبات کو پنپنے کی کھُلی اجازت نہیں دیتا مگر اس حد تک کہ بغیر اس کے گذارہ نہ ہو سکے اور اسلام سے باغی ذہنیتیں چونکہ حیاتِ اخروی کے مفہوم سے نا آشنا ہیں اور وہ مآلِ زندگی اسی چند روزہ قیام کو قرار دیتی ہیں اور جذبات وخواہشات کی تکمیل کے لئے ان کی نظر میں کوئی دوسرا محل مناسب تو ہے نہیں۔ لہذا وہ کسی قیمت پر اپنے جذباتِ تعیش کو کچلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے اور حصولِ اقتدار کو تکمیل جذبات اور تتمیم شہوات کا زینہ قرار دے کر اس کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار ہوتے ہیں اور اس کے بعد اشتراکیت وملوکیت کے نظریئے اور عمومی اصلاح و فلاح کے قوانین اور اجتماعی وتمدّنی زندگی کے ضوابط صرف اقتدار کی بحالی کے حیلے اور حربے ہیں اور درحقیقت تسکینِ خواہشات اصل مقصد ہے کیونکہ اس دور فانی کے بعد وہ کسی ایسی زندگی کا تصوّر نہیں کرتے جو سکون واطمینان کی زندگی ہو یا اگر اس زندگی غیر فانی کا تصوّر کرتے بھی ہیں تو عقیدہ اتنا ناقص ہوتا ہے کہ اُس اُخروی زندگی کے مفاد کو اس فانی زندگی پر ترجیح نہیں دے سکتے اور نہ اس کے حصول کے لئے اس عبوری دَور کی خواہشات وجذبات کی قربانی کر سکتے ہیں۔

لیکن اسلام چونکہ اُسی حیاتِ جاودانی کے پُرسکون و پُراطمینان ماحول میں ابدیت اور لازوال انتفاع کی خوشخبری سناتا ہے لہذا اس زندگی کی تعمیر کو اُس زندگی کی تعمیر کا زینہ بناتا ہے۔ پس اسلام کی نظر میں یہ زندگی عبوری دَور ہے اور آخرت مقصد سفر ہے لہذا اجتماعی زندگی کی بھلائی کے ساتھ ساتھ اسلام نے نفسی اصلاح اور خانگی بہبود کے لئے بھی قوانین وضوابط پیش کئے ہیں۔ نفسی اصلاح وفلاح کے ضوابط کا نام ہے علم الاخلاق اور خانگی اصلاح کے قواعد وضوابط کا نام ہے۔ تدبیر منزل اور زن و مرد کے باہمی تعلقات اور ازدواجی زندگی کے اصول وفروع اور اس کی فلاح وکامیابی کے ضوابط تدبیر منزل کے ماتحت ہیں۔

اسلام سے برسرِپیکار طبقہ چونکہ اُخروی حیثیّت کو ملحوظ نہیں رکھتا اور صرف ظاہری تمدّن ان کے سامنے ہے لہذا وہ عورت کے لئے تحریکِ آزادی صرف ظاہری تعیش اور اسی فانی سکون و آرام کی خاطر کرتے ہیں

اور اسی میں تمدن کی بھلائی سمجھتے ہیں اور اشتراکیت کا پس منظر بھی یہی ہے اور چونکہ صرف یہی ظاہری پہلو ان کا مطمح نظر ہے لہذا عفت و پاکدامنی، عصمت و شرافت اور غیرت و حمیت وغیرہ فاضلہ صفات ان کی نگاہوں میں فضول اور بے فائدہ ہیں اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا صرف لذت اندوزی اور تعیش مزاجی کے لئے ہے۔ اور کامیاب انسان وہ ہے جو لذتِ زندگی سے جی بھر کر سیر ہو سکے۔ پس حیاء، شرافت اور عفت وغیرہ یہ صفات ان کے نزدیک مفادِ زندگی سے متصادم ہیں لہذا وہ ان کو راستے سے ہٹا کر ظاہری زندگی کو صاف اور پُر لطف بنانے کے درپے ہوتے ہیں اور عورت کی تحریک آزادی کا صرف یہی مطلب ہے لیکن اسلام چونکہ اس دنیا کو عبور گاہ قرار دیتا ہے۔ جیسے کشتی پر سوار انسان۔ کیونکہ کشتی اس کیلئے منزل نہیں بلکہ منزل کشتی کے ساحل پر پہنچنے کے بعد آتی ہے اور حقیقی زندگی وہی ہے جو اس عبوری دور کے بعد نصیب ہو گی۔ لہذا عورت کے لئے حیاء، شرافت اور عفت وغیرہ تمام صفات حسنہ گو اس فانی دَور میں تعیش مزاجی کے لئے سدِ راہ ہیں لیکن یہی فاضلہ صفات اس کی اخروی زندگی کا پیش خیمہ ہیں بنا بریں اسلام نے عورت و مرد کی ازدواجی زندگی کے لئے عام اجتماعی و تمدنی قوانین کے علاوہ خصوصی احکام بھی مرتب فرمائے ہیں تاکہ انسانی زندگی کے ہر دو پہلو دنیوی و اخروی سلجھے ہوئے ہوں نہ اس کے لئے ظاہری ترقی کی راہیں مسدود ہوں اور نہ اخروی ترقی کے راستے بند۔ لیکن چونکہ یہ زندگی دائمی نہیں لہذا اس زندگی کے لئے اسی قدر محنت کرنے کی ضرورت ہے جس قدر ناگزیر ہو اور باقی ماندہ تمام وقت اس زندگی کی اصلاح کے لئے وقف کرنا چاہیئے جو دائمی اور باقی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تدبیر منزل کے قوانین جس طرح اصلاح منزل کے لئے ہیں اسی طرح اس کے ضوابط اصلاح آخرت کے لئے بھی ہیں۔ مثلاً مرد کی حاکمانہ حیثیت اور عورت کی محکومانہ زندگی یا مرد پر اخراجات خانگی کا وجوب اور عورت پر بچوں کی ذمہ داری اسی قسم کے جملہ احکام اصلاح دنیا و آخرت ہر دو کے لئے ہیں۔ پس عورت کی تحریک آزادی کا نظریہ صرف آخرت سے ہی چشم پوشی نہیں بلکہ ظاہری شریفانہ زندگی کے لئے بھی سم قاتل ہے اور اشتراکیت جس میں عورت کو حیا و عفت سے بیگانگی کی تعلیم دی گئی ہے صرف جذبات و شہوات کی تکمیل کا بہانہ ہے اس کو تمدن کی اصلاح میں دخیل کرنا یا اجتماعی نظام میں مؤثر کہنا صرف سادہ لوح طبقہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے پس انسان کی حیوان سے ممتاز اور کامیاب زندگی کا مدار صرف اسلامی قوانین کی پیروی ہے اور بس اور ازدواجی زندگی کے لئے اسلام نے جو نظریات پیش فرمائے ہیں۔ عورت و مرد ہر دو کے لئے اس سے بہتر نہ کوئی لائحہ عمل ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور بالخصوص نظریہ طلاق جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ باقی ادیانِ عالم میں سے صرف اسی مقدس دین کا طرّہ امتیاز ہے اور ازدواجی زندگی کو خوش سے خوش تر اور خوب سے خوب تر بنانے اور زن و مرد کے باہمی تعلقات کو انتہائی خوشگوار رکھنے کے لئے جہاں مرد کے لئے عدل و انصاف اور عورت کے

لئے اطاعت شعاری اور مرد پر اخراجات و مصارف کا وجوب اور عورت پر خانگی تربیتی معاملات کا بوجھ تقسیم کار کے طور پر عائد کئے گئے ہیں تاکہ باہمی اختلاف و انتشار کا سدباب ہو سکے وہاں اختلاف و انتشار باہمی کا آخری حل طلاق قرار دیا گیا ہے تاکہ اختلاف باہمی کے لاعلاج ہونے کی صورت میں زن و مرد کے لئے ازدواج وبالِ جان نہ بنا رہے۔ بلکہ خیر و خوشی سے آزادانہ طور پر بذریعہ طلاق ایک دوسرے سے الگ ہو کر نئی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہو سکیں۔

آج دنیا کی مہذب قومیں جن کے مذہب میں طلاق نہ تھی۔ تنگ آ کر نئے نزاعات و فسادات سے تنگ آ کر ازدواجی زندگی میں طلاق کے لئے جگہ تلاش کر رہے ہیں جس کو اسلام نے آج سے پونے چودہ سو سال پہلے ضروری قرار دیا تھا۔ پس جذبات و خواہشات کی تکمیل میں انتہا پسندی اور افراط ہے ملوکیت۔ یا آمریت۔ اور اس میں آوارگی اور تفریط کا نام ہے۔ نظریۂ اشتراکیت اور ان کے بین بین نقطۂ اعتدال پر جم کر رہنا۔ یعنی ان دونوں نظریوں میں حدودِ ضروریہ کی پابندی اور میانہ روی کے نظریہ کا نام ہے اسلام۔ چنانچہ جملہ اسلامی فروعی ضوابط و احکام کا محور و مدار صرف یہی اصولی نظریہ ہے اور یہی ہے تعمیر انسانیت کا آخری پروگرام اور تکمیل نظام زندگی کا آخری کورس جو ہر شعبۂ زندگی میں راہبری کے فرائض کی انجام دہی کر سکتا ہے۔ مسئلہ کی تفصیل "اسلامی سیاست" میں ملاحظہ فرمائیں

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ

کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو اپنے گھروں سے نکلے ہزاروں کی تعداد میں موت

حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ

کے ڈر سے ۔ پس فرمایا ان کو اللہ نے کہ مرجاؤ (تو وہ مرگئے) پھر ان کو زندہ کیا ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

تحقیق اللہ صاحب فضل ہے اوپر لوگوں کے ۔ لیکن اکثر لوگ (اس کا) شکر ادا نہیں کرتے

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور تم لڑو اللہ کی راہ میں — اور جانو تحقیق اللہ سننے جاننے والا ہے

موت کے بعد زندگی اور پھر موت

چونکہ کتب امامیہ میں بکثرت رجعت کے اثبات میں آئمہ طاہرینؑ سے احادیث منقول ہیں اور یہی شیعی عقیدہ ہے کہ حضرت قائم آل محمدؑ عج کے ظہور کے زمانہ میں خالص مومنین اور خالص اعدائے دین کو زندہ کیا جائے گا۔ اس پر مخالفین کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے کہ موت صرف ایک دفعہ ہے اور اس کے بعد زندگی صرف قیامت کی زندگی ہے۔ دنیا میں دو دفعہ موت خلاف قرآن ہے تو ان لوگوں کی تردید میں قرآن کی ذیلی فرمائش کافی ہے کہ اگر خدا چاہے تو مردوں کو دوبارہ اسی دنیا میں زندہ کر سکتا ہے جیسا کہ یہ آیت صاف طور پر بتلا رہی ہے۔

قصّہ :- مجمع البیان میں منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے ان کو لڑائی کا حکم دیا پس وہ لڑنے سے بزدل پڑ گئے اور بہانا بنایا کہ وہاں وباء ہے جبتک وباء ختم نہ ہوگی ہم نہ جائیں گے تو خدا نے ان پر موت کو نازل کیا جب موتیں ان میں زیادہ ہوئیں تو وہ موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے ۔ پس اس بادشاہ نے ان پر بددعا کی اور وہ سب مر گئے جب آٹھ دن گذرے تو ان کے جسم پھول گئے اور بدبودار ہوگئے ۔ لوگ ان کے دفن کرنے سے چونکہ عاجز تھے لہذا درندوں سے حفاظت کے لئے ایک گہرا گڑھا کھود کر ان کو اس میں ڈال دیا اسی حالت میں عرصہ گذر گیا۔ ان کی لاشیں بوسیدہ ہوگئیں۔ اسی اثناء میں حضرت حزقیلؑ پیغمبر کا وہاں سے گذر ہوا۔ تو متعجب ہوئے اللہ کی جانب سے وحی ہوئی کہ کیا میں تجھے اپنی نشانی دکھاؤں کہ کس طرح میں مردوں

کو زندہ کرتا ہوں تو پیغمبر نے عرض کی۔ ہاں! پس خداوند کریم نے ان کو زندہ فرمایا۔

ایک روایت ہے کہ وہ حضرت حزقیلؑ کی قوم تھی جب ان پر موت آئی تو وہ ان کی تلاش میں نکلے جب ان کو مردہ پایا تو رو دیئے اور عرض کی۔ اے اللہ! یہ میری قوم کے لوگ تیرے حمد گزار اور تسبیح خوان تھے اب ان کے بعد میں تنہا رہ گیا ہوں خدا نے وحی کی کہ میں نے تجھے اُن کے زندہ کرنے میں اختیار دے دیا ہے تو حضرت حزقیلؑ نے فرمایا:۔ احیوا باذن اللہ ۔ یعنی خدا کے اذن سے زندہ ہو جاؤ۔ پس وہ زندہ ہو گئے۔

حمران بن اعین نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا یہ لوگ زندہ ہوئے اور لوگوں کے دیکھ لینے کے بعد مار دیئے گئے یا دنیا میں پلٹ کر دوبارہ آباد ہوئے؟ تو آپ نے فرمایا:۔ نہیں۔ بلکہ وہ گھروں میں کھاتے پیتے رہے شادیاں کیں اور ایک وقت تک زندہ رہے پھر ان کو وقت مقرر پر موت آئی۔

تفسیر برہان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ لوگ شام کے شہروں میں سے ایک شہر کے رہنے والے تھے اور وہ ستر ہزار گھرانے تھے اور ان میں طاعون کی وبا پڑتی تھی پس غنی لوگ شہر چھوڑ کر باہر چلے جاتے اور غربا بوجہ تنگدستی کے کہیں نہ جا سکتے تھے پس یہ لوگ طاعون کا شکار ہو جاتے اور ان میں موت واقع ہوتی اور اس پر غنی لوگ یہ سمجھتے تھے اگر ہم نے شہر نہ چھوڑا ہوتا تو ہم میں موت زیادہ واقع ہوتی اور غربا کہتے تھے کہ اگر ہم بھی باہر چلے گئے ہوتے تو موت سے بچ جاتے پس انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر اب طاعون آیا تو ہم سب شہر چھوڑ کر باہر چلے جائیں گے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اثنائے سفر میں وہ ایک اجڑی ہوئی بستی میں پہنچے جس کو طاعون نے ہی برباد کر دیا تھا۔ پس یہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے۔

اللہ نے اُن پر موت کو بھیج دیا۔ پس وہ سب مر گئے وہ چونکہ ایک سڑک کے قریب تھے لہٰذا گذرنے والوں نے ان کی لاشوں کو رستہ سے دور علیحدہ ایک جگہ پر جمع کر دیا۔ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر حضرت حزقیل کا وہاں سے گذر ہوا تو ان کی بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھ کر رو دیئے اور عرض کی۔ اے اللہ! جس طرح تو نے ان کو موت دی ہے اسی طرح تو زندہ بھی کر سکتا ہے پس وہ تیرے شہروں کو آباد کریں گے۔ تیری مخلوق بڑھے گی اور تیرے دوسرے عبادت گذاروں کی طرح یہ بھی عبادت کریں گے۔

ارشاد باری ہوا۔ کیا تو یہی چاہتا ہے؟ عرض کی! ہاں۔ اے پالنے والے۔ پس خدا نے ان پر اسم اعظم کی وحی فرمائی تو حضرت حزقیلؑ نے وہ اسم اعظم ان پر پڑھا۔ پس ان کے سامنے ان کی ہڈیاں گوشت پوست وغیرہ آپس میں ملنے لگ گئیں اور وہ زندہ ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے خدا کی تسبیح و تکبیر و تہلیل کو زبان پر جاری کیا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا

کون ہے جو قرض دے اللہ کو ۔ قرض حسن پس خدا اس کو بڑھا کر دے کئی گنا

کَثِیْرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

زیادہ اور اللہ ہی تنگی اور فراخی عطا کرتا ہے اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے

راہِ خدا میں خرچ

مَنْ ذَا الَّذِیْ الخ ۔ تفسیر مجمع البیان میں آیت مجیدہ کا شان نزول یوں مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے صدقہ کا ثواب بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صدقہ دے اس کو جنّت میں اس کا دگنا عطا ہوگا تو ایک شخص ابوالدحداح انصاری نے عرض کی ۔ یارسول اللہؐ! میرے دو باغ ہیں ۔ اگر ان میں سے ایک کو صدقہ میں دے دوں تو کیا جنّت میں مجھے اس کا دگنا ملے گا ؟ فرمایا ہاں ! اس نے عرض کی کہ میرے بیوی بچے بھی میرے ہمراہ ہوں گے فرمایا ۔ ہاں ! پس اس نے ان دو باغوں میں سے بہترین باغ بطور صدقہ کے جناب رسالتمآبؐ کے حوالہ کر دیا (مستحقین پر تقسیم کرنے کے لئے) تو یہ آیت نازل ہوئی ۔ جب ابوالدحداح واپس آیا تو اس کے بیوی بچے اسی باغ میں گئے ہوئے تھے ۔ جس کو وہ صدقہ میں دے چکا تھا ۔ فوراً باغ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اپنی بیوی کو بلایا اور کہا کہ میں نے یہ باغ صدقہ میں دے دیا ہے اور اس کے بدلہ میں باغ جنت خرید لیا ہے جس میں میرے بیوی بچے بھی میرے ہمراہ ہوں گے ۔ اس نیک بخت بیوی نے جواب دیا ۔ خدا تیرے سودا کو مبارک کرے ۔ پس وہ سب اس باغ سے نکل آئے ۔ اور باغ حضورؐ کے حوالہ کر دیا ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیْرٌ مِّنْھَا ۔ یعنی جو نیکی کرے پس اس کو اس کی بہتر جزا ملے گی ۔ تو جناب رسالتمآبؐ نے عرض کی ۔ اے پروردگار اور زیادہ عطا فرما ۔ پس یہ آیت نازل ہوئی مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا ۔ یعنی جو نیکی کرے گا ۔ اس کو اس کی دس گنا جزا ملے گی ۔ آپ نے عرض کی اے پروردگار ! اس سے بھی زیادہ عطا فرما ۔ پس یہ آیت مجیدہ نازل ہوئی کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ الخ ۔ جو بھی اللہ کو قرض دے یعنی راہ خدا میں صدقہ وخیرات کرے گا تو اس کو اس کی جزا بہت زیادہ بڑھا کر دی جائے گی ۔ تو آپ نے فرمایا :۔ کہ بہت زیادہ کا مطلب ہے کہ اس کو اس کی جزا اتنی ملے گی کہ حساب وشمار سے باہر ہوگی ۔

عنوان الکلام میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ صدقہ کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) ایک کے بدلہ میں دس گنا ثواب اور وہ صدقہ یہ ہے جو ایک فقیر مومن کو دیا جائے جس کے اعضاء صحیح اور سالم ہوں۔

(۲) ایک کے بدلہ میں ستر گنا کا ثواب۔ یہ وہ صدقہ ہے جو ایسے مومن کو دیا جائے جو خود کما کر اپنے اخراجات کو نبھانے سے عاجز ہو۔

(۳) ایک کے بدلہ میں سات سو گنا کا ثواب، یہ وہ صدقہ ہے جو مومن فقیر رشتہ دار کو دیا جائے۔

(۴) ایک کے بدلہ میں ستر ہزار گنا کا ثواب، یہ وہ صدقہ ہے جو والدین پہ کیا جائے (یا والدین کے لئے کیا جائے)

(۵) ایک کے بدلہ میں ایک لاکھ گنا کا ثواب، اور یہ وہ صدقہ ہے جو مستحق مومن علم دین طلب کرنے والے کو دیا جائے۔

سلسلہ عزاداری سید الشہداء علیہ السلام میں خرچ کرنے کے متعلق وارد ہے کہ حضرت موسٰے علیہ السلام کو ذات پروردگار کی جانب سے ارشاد ہُوا کہ اگر کوئی بندہ نبی مصطفٰے حضرت خاتم الانبیاء کے نواسہ کی محبت میں اپنے مال سے کسی کو کھانا کھلائے گا۔ یا اس سلسلہ میں کوئی درہم یا دینار خرچ کرے گا۔ تو اس کو دنیا میں اس کا ستر گنا عطا کروں گا۔ اور آخرت میں اس کا مقام جنت ہوگا۔ اس کے تمام گناہ بخش دوں گا۔ مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم اگر کسی مرد یا عورت کی آنکھ سے عاشورا یا کسی اور دن میں اس کی مصیبت پر ایک قطرہ آنسو جاری ہوگا۔ تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک سو شہید کا ثواب درج کروں گا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ

کیا تم نے نہیں دیکھا طرف سرداران بنی اسرائیل کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے

إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ

جبکہ انہوں نے کہا اپنے ایک نبی کو۔ کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ

اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا

میں لڑیں فرمایا نبی نے شاید اگر تم پر لڑنا فرض ہو جائے۔ تو تم نہ لڑو۔ انہوں نے

تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا

جواب دیا۔ ایسا کب ہو سکتا ہے کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں (حالانکہ حکم جہاد کے علاوہ یہ دکھ بھی تو ہے) کہ ہم کو

مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا

اپنے گھروں سے نکال دیا گیا اور بیٹوں سے (جدا کیا گیا) پس جب ان پر فرض کیا گیا لڑنا۔ تو سب پھر گئے

قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۲۴۶﴾

سوائے چند آدمیوں کے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے

طالوت کا قصّہ اور معیار انتخاب خداوندی

اَلَمۡ تَرَ۔ تفسیر برہان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد بنی اسرائیل نافرمانیوں میں پڑ گئے دینِ خدا کو تبدیل کر ڈالا اور اللہ کے حکم سے سرکش ہو گئے۔ ان کو نبی ہدایت کرتا تھا لیکن اس کی اطاعت نہ کرتے تھے اور ایک روایت میں وہ نبی حضرت ارمیاء علیہ السلام تھے پس خدا نے ایک قبطی بادشاہ جالوت نامی کو ان پر مسلط کر دیا کہ اس نے ان کو ذلیل و خوار کیا ان کے مردوں کو قتل و جلا وطن کر دیا مال چھین لئے اور ان کی عورتوں کو قید کر کے کنیزی میں رکھ لیا۔ بنی اسرائیل کا یہ دورِ غلامی اس قدر سخت تھا کہ وہ تمام شعبہ جاتِ زندگی میں استقلال کی دولت سے یکسر محروم کر دیئے گئے تھے آخر مصائب و آلام کے وفور نے ان کو ایک دفعہ خوابِ غفلت سے چونکنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان میں تحریکِ آزادی کی حس بیدار ہوئی اور بہت جلد وہ اپنی تحریک آزادی کی تنظیم کے لئے

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ؕ

اور فرمایا ان کو اپنے نبی نے کہ تحقیق اللہ نے تم پر طالوت کو نبی مقرر فرمایا ہے۔ (وہ چیں بجبیں ہوکر)

قَالُوٓا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ

کہنے لگے وہ کیسے ہمارے اوپر حکومت کر سکتا ہے؟ حالانکہ ہم اس کی بہ نسبت حکومت کے زیادہ

مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ

حقدار ہیں۔ اور اس کے پاس وسعتِ مال بھی نہیں ہے۔ فرمایا (نبی نے) کہ تحقیق اللہ نے تم پر اس کا انتخاب فرمایا

عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللَّهُ يُؤْتِي

ہے اور اس کو بڑھایا ہے وسعتِ علمی اور کمالِ جسمی کے لحاظ سے ° اور اللہ جس کو

مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ؕ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۷﴾

چاہتا ہے ملک عطا فرماتا ہے اور اللہ ہی صاحبِ وسعت و علم ہے۔

اپنے نبی سے قائد اور صدر کے انتخاب کے خواہاں ہوئے اور نبی نے بحکم خداوندی طالوت کو نامزد فرما دیا جو باوجود ان کے ریخ پا ہونے کے معزول نہ ہو سکا۔

مجمع البیان میں ہے کہ اس نبی کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ شمعون بن صفیہ تھے جو لاوی بن یعقوب کی اولاد سے تھے بعض نے اس کا نام یوشع بن نون بتلایا ہے جو حضرت یوسفؑ کی اولاد سے تھے اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس کا نام اشمویل منقول ہے کہ زبان عربی میں اس کو اسماعیل کہا جاتا ہے اور مروی ہے کہ جب اشمویل کو خدا نے مبعوث فرمایا تو چالیس برس تک تو وہ اچھی حالت میں رہے پھر اس کے بعد جالوت اور عمالقہ کا معاملہ درپیش ہوا۔

تفسیر برہان کی سابقہ روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں نبوت ایک خاندان میں (لاوی بن یعقوب کی اولاد میں) اور بادشاہت دوسرے خاندان میں (حضرت یوسف کی اولاد میں یا یہودا کی اولاد میں) چلی آرہی تھی اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ کے پاس لشکر کم ہوا کرتا تھا اور نبی ہی اس کے معاملہ کو مضبوط کیا کرتا تھا۔ پس اس نبی نے بحکم خدا ان کا بادشاہ مقرر کیا اور جب جہاد واجب ہوا تو وہ لوگ ثابت قدمی کے عہد سے پھر گئے اور تھوڑے ثابت قدم رہے اور تفسیر برہان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ تھوڑے بھی ساٹھ ہزار تھے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ الخ۔ جب بنی اسرائیل نے نبی سے بادشاہ کے تقرر کی خواہش کی تو نبی نے فرمایا ایسا نہ ہو کہ جہاد فرض ہو جانے کے بعد تم پھر جاؤ۔ کہنے لگے ایسا ہرگز نہ ہو گا کیونکہ ہمیں اپنی جلاوطنی قتل و غارت اور بیوی بچوں کی قید کا بھی درد ہے ہم ضرور جان توڑ کر لڑیں گے اور ثابت قدم رہیں گے۔ پس نبی نے فرما دیا کہ خدا کی طرف سے طالوت تمہارا بادشاہ ہے۔ طالوت نہ خاندانِ نبوت (لاوی کی اولاد) سے تھے اور نہ خاندانِ شاہی (یوسف یا باختلاف یہودا کی اولاد) سے تھے بلکہ وہ بنیامین کی اولاد میں سے تھے اور سقائی یا باختلاف رنگریزی کا کام کرتے تھے۔ لمبی قد کی وجہ سے ان کو طالوت کہا جاتا تھا (بعضوں نے کہا ہے کہ بعد میں یہ مبعوث بنبوّت بھی تھے۔

قَالُوْا اَنّٰی يَكُوْنُ الخ۔ رل مل کر انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ خاندانِ نبوّت و مملکت ہم سے ہم ہیں اور وہ ایک معمولی پیشہ کا آدمی ہے لہٰذا وہ خاندانی لوگوں سے کیسے سبقت لے سکتا ہے البتہ اگر وہ مالدار ہوتا تو اس ذریعہ سے ہمارے خاندانی شرف کا مقابلہ کر سکتا یا حکومتی معاملات کو سنبھال سکتا۔ پس بنی اسرائیل نے جذباتی رنگ میں آکر سات زبردست غلطیاں کیں۔

(۱) خدائی انتخاب پر حرف زنی کی جو قطعًا ناجائز ہے۔
(۲) علمِ خداوندی کے مقابلہ میں اپنے قیاسات کو پیش کیا۔
(۳) محض اس کی غربت و افلاس کے پیشِ نظر اس کو خاندان میں گھٹیا قرار دیا۔ حالانکہ وہ بھی انہی کے خاندان سے تھا اور اولادِ یعقوب میں سے تھا۔
(۴) نبی کی نص کے بعد بھی اس کے خلاف اجماع کا ڈھونگ رچایا۔
(۵) اپنے زعمِ باطل میں پیسہ کی فراوانی کو خاندانی شرف کے مقابلہ میں لے آئے۔ یعنی جس کے پاس پیسہ ہو خواہ وہ پست قوم میں سے ہی ہو۔ وہ خاندانی شرف کا مقابلہ کر سکتا ہے۔
(۶) معیارِ انتخابِ خداوندی بھی انہوں نے اپنے غلط نظریہ کے ماتحت کثرتِ مال و دولت کو سمجھا ہوا تھا۔
(۷) لوگوں میں ہر دلعزیزی اور ان کا نظم و نسق اور ان پر حکومتی کنٹرول وغیرہ ان چیزوں کا دارومدار بھی ان کے نزدیک پیسہ تھا۔

اور نبی نے مندرجہ وجوہات سے سب کو رد کر دیا۔ تمہارے اعتراضات، قیاسات اور اجماعات وغیرہ انتخابِ خداوندی کے مقابلہ میں لغو و بے معنی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ۔ تحقیق اللہ نے ہی اس کا انتخاب کیا ہے۔ پس جس کو اللہ چن لے تو کسی نبی کے صحابی اس کے انتخاب پر ہزار اعتراض کریں، لاکھ قیاس آرائیاں کر کے اس کے خلاف اجماعی پروگرام قائم کریں۔ تاہم وہ اللہ کے انتخاب کو اپنے مقام سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں کر سکتے۔

بنی اسرائیل نے اگرچہ اپنے نبی سے یہ خواہش کی تھی کہ آپ خود ہمارے لئے بادشاہ کا تقرر فرمائیں۔ لیکن نبی

نے ان کے جواب میں فرمایا۔ کہ خدا نے طالوت کو مقرر فرمایا ہے گویا وہ نبی اپنے صحابہ کو یہ ذہن نشین کرا رہے تھے کہ تمہارا مجھ سے اس انتخاب کی خواہش کرنا بے محل ہے اور انتخاب کا حق صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے۔ کیونکہ وہ ہر شخص کے ظاہر و باطن کی جملہ خوبیوں یا برائیوں سے مطلع ہے لہذا اس کے انتخاب میں غلطی کا امکان نہیں ہوگا۔ پس اس مقام پر بنی اسرائیل کے نبی حضرت اشمویل ہوں یا حضرت ارمیاء۔ انہوں نے اس امر کا انکشاف بھی فرمایا ہے کہ نبی کا کام خدائی فرامین و انتخابات کا اعلان کرنا ہے اور بس۔ چنانچہ پہلی دفعہ فرمایا کہ خدا نے اس کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔ جب انہوں اپنا اجماع اس کے خلاف پیش کیا اور بزبان اعتراض اپنے قیاسی مواد کو دہرایا۔ تو پھر بھی نبی نے اپنی طرف سے کچھ پیش کرنے کی بجائے سرداران بنی اسرائیل سے یہی فرمایا:۔ کہ حضرات! بس اللہ نے اسی کو چنا ہے۔ لہذا تمہاری چون و چرا اور قیل و قال سب بے ہودہ ہے۔

پس وہ نبی اپنی طرز کلام و لہجۂ جواب سے ان کے ذہن نشین یہی بات کرا رہے تھے کہ تمہاری میرے اوپر اس معنی میں ناراضگی بے سود ہے اور مجھ سے اس معاملہ میں نظرثانی کی درخواست یا اس کے انتخاب کی منسوخی کی خواہش اور جدید انتخاب کی آرزو سب فضول ہے کیونکہ نہ میں پہلے سے اس قسم کے انتخاب کا مجاز تھا اور نہ اب اس کے نسخ و ترمیم کا مجاز ہوں۔ پہلے بھی اللہ نے انتخاب کر کے مجھ سے اعلان کروایا تھا اور اب اس کی منسوخی، یا ترمیم، یا نظرثانی کا حق بھی اسی کو حاصل ہے گویا اللہ کے علاوہ صحیح انتخاب نہ کوئی کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا حق حاصل ہے پس نبی کو نہ اس کے جوڑنے کا حق ہے اور نہ توڑنے کا اختیار ہے۔

نیز نبی نے ان کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر خدا سے نظرثانی کی اپیل بھی نہیں کی۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انتخاب خداوندی بغیر مصلحت کے ہو نہیں سکتا۔ اور جب مصلحت سے انتخاب ہوا ہے تو اس پر نظرثانی کی اپیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خلاف مصلحت کرنے کے لئے عرض کی جائے اور یہ فعل ایک نبی سے نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲) آپ نے فرمایا:۔ کہ خدا نے اُن کو علمی وسعت عطا فرمائی ہے۔ پہلے جواب میں صرف خدا کے انتخاب کا ذکر کیا جو ان کے تمام اعتراضات اور قیل و قال پر حاوی تھا۔ اس جواب میں ان کو اپنی اصولی غلطی پر تنبیہ فرمایا ہے کہ علم و جہل کے مقابلہ میں ہر حال میں علم کو ترجیح ہے۔ علم جہل پر حاکم ہے جس طرح روشنی تاریکی پر حاکم ہے جہلا کی قیاس آرائیاں عالم کے وقار علمی میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتیں اور چند جہلا کا مل جل کر شور و غوغا کر کے اجماعی صورت بنا کر ایک غلط جمہوریت کی آواز بلند کرنا ایک عالم کے متعلق خدائی انتخاب کو رد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اجماعی و جمہوری انتخاب کا مطلب یہ ہے کہ ع

(جمہوریت اک راج ہے اقبال کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے)

○ انہوں نے غربت و افلاس کو معیارِ نا اہلیت قرار دیا تھا۔ خدا نے جہالت کو نا اہلیت و ناموزونیت کا معیار قرار دیا ہے۔

○ انہوں نے پیسہ کی فراوانی کو معیار انتخاب قرار دیا تھا۔ خدا نے علمی وجاہت کو مدار و محورِ حکومتِ الٰہیہ قرار دیا ہے۔

○ انہوں نے مالداری کو خاندانی شرف کے مقابلے میں پیش کیا تھا۔ خدا نے علمی برتری کو خاندانی شرافت پر فوقیت دینے کا اعلان فرمایا۔

○ انہوں نے صاحبِ افلاس و غربت کو حکومتی نظام سنبھالنے کے لئے اَن فِٹ قرار دیا تھا۔ اور خدا نے صاحبِ جہل کو عوامی نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے ناموزوں قرار فرمایا ہے۔

○ انہوں نے صاحبِ زر کو رعایا پر کنٹرول رکھنے کا اہل سمجھا تھا۔ اور خدا نے صاحبِ علم کو اس عہدہ کے لئے موزوں قرار دے کر منتخب فرمایا۔

پس عالم بوریانشین تخت دسا پر بیٹھنے والے جاہل سے افضل ہے لہٰذا اگر کوئی غنی ہو تو اپنے مقام پر ہوا کرے۔ لیکن اللہ کے نزدیک نہ اس کے خاندانی جاہ و جلال کی کوئی وقعت ہے اور نہ اس کے مالی کرّ و فر کی کچھ قدر و قیمت ہے پس وہ حکومتِ الٰہیہ اور رعایا کے صحیح نظام کو قائم رکھنے کیلئے یقیناً نااہل اور غیر موزوں ہے اور ایسے کا انتخاب دامنِ انتخابِ الٰہی پر ایک بدنما داغ ہے۔

اس کے برعکس اگر کوئی عالم ہے خواہ وہ فاقہ مست اور خاک نشیں ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پیوند دار ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اللہ کے نزدیک عالم کی فاقہ مستی جاہل کی شکم پُری سے بہتر۔ عالم کی فقیری جاہل کی امیری سے بہتر۔ عالم کی فروتنی جاہل کی سج دھج سے افضل اور عالم کی خاک نشینی، جاہل کی سریر آرائی سے محبوب تر ہے۔ لہٰذا وہی انتخابِ خداوندی کے لئے موزوں اور حکومتِ الٰہیہ کے نظام کے سنبھالنے کے لئے سزاوار تر ہے۔

(۲) اس کے بعد اس نبی نے ان کو ایک اور غلطی کی طرف متوجہ فرمایا۔ تاکہ ان کو مصلحت و حکمتِ انتخابِ قدرت سے کسی حد تک آگاہی ہو جائے اور وہ یہ کہ دشمن کے مقابلہ میں صف آرائی کے لئے غنی اور مالدار ہونا کافی نہیں بلکہ وہاں جسمانی قوت کی ضرورت ہے اور اس میں طالوت تم سب سے زیادہ ہے۔ پس خدائی انتخاب کا تعلق ظاہری جذبات سے نہیں بلکہ حقیقی مصالح سے ہے جہاں دشمن سے جہاد کرنے کی ضرورت ہو وہاں سپاہ کی سرکردگی کے لئے وہ ہی موزوں تر ہو سکتا ہے جو شجاع اور مردِ میدان ہو خواہ ظاہری نگاہوں میں فقر و فاقہ کی وجہ سے نظر انداز ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو؟ اور یقیناً ایسے مقام پر ایسے شخص کا انتخاب جو مردِ میدان

نہ ہو۔ خواہ مالدار وغنی ہوا کرے ۔ ناقابلِ عفو عقلی و روایتی غلطی ہے کیونکہ دشمن پر فتح یابی حاصل کرنے کے لئے بہادری اور قوتِ جسمانی کی ضرورت ہے نہ کہ دولتمندی اور تونگری کی۔

سوال :۔ طالوت کو بھی علم و جسمانی قوت اللہ کی عطا کردہ ہے اگر یہی چیزیں ان کو عطا فرما دیتا تو کیا حرج تھا جیسا کہ خداوندکریم نے طالوت کو عطا فرمائیں اور ان کو سرے سے ان چیزوں سے محروم رکھا تو پھر معیارِ انتخاب ان چیزوں کو قرار دینا ہی سب یکطرفہ سودا ہے ؟

جواب :۔ اسی سوال کا جواب وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ ۔ الخ سے دے دیا ہے یعنی مشیّت خداوندی پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ۔ کیونکہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ بھی اس کی مشیّت ہے ۔

الحاصل ۔ بنی اسرائیل کی طرف سے طالوت پر دو اہم اعتراض تھے ۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ وہ شاہی خاندان سے نہیں ہیں اور اس کی تعبیر انہوں نے اپنے استحقاق کے اظہار میں کی کہ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ ۔ مقصد یہ ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہم حکومت کا استحقاق رکھتے ہیں اور اس میں ضمنی طور پر طالوت کا عدم استحقاق اور اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ مالی حیثیت میں کمزور ہیں پس ان کے اعتراض کا جواب تو اس طرح دے دیا گیا کہ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ ۔ کہ اللہ نے چن لیا ہے گویا خاندانی استحقاق اس کے چناؤ کے مقابلہ میں کوئی وقعت و اہمیت نہیں رکھتا اور دوسرے اعتراض کا جواب اس طرح دیا کہ نظام مملکت کا سنبھالنا مالداری پر موقوف نہیں بلکہ وہ حسن تدبیر اور جوہر شجاعت کا مرہونِ منت ہے اور جوہر شجاعت ، قوت و توانائی کا محتاج ہے اور طالوت میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں لہذا انتخاب خداوندی بجا اور برمحل ہے ۔

پہلے جواب میں جب یہ ارشاد ہوا ۔ کہ اس کو اللہ نے چُن لیا ہے تو یہ شائبہ پیدا ہوتا تھا کہ بلا وجہ اور بغیر استحقاق کے حکومت کو شاہی خاندان سے نکال کر دوسرے کے حوالے کرنے میں کیا حکمت ہے ؟ پس خداوندکریم نے دوسرے جواب میں حکمت کا تذکرہ فرما دیا ۔ اور اعلان کر دیا ۔ خدائی انتخاب کا تعلق اگرچہ اس کی اپنی مشیّت سے ہے لیکن پھر بھی خالی از حکمت نہیں اور وہ حکمت یہ ہے کہ جس کو چُنا جا رہا ہے وہ عالم بھی ہے اور شجاع بھی اور بادشاہت کے لئے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں ۔ لیکن یہ مطلب چونکہ قدرے معرضِ خفا میں سے تھا ۔ لہذا پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے صاف اور کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا ۔ وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ ۔ کہ کسی کو ملک کا عطا کرنا خدائی مشیت ہے ۔ وہ جسے چاہے دے دے ۔

وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۔ اس فقرہ میں پھر اسی شبہ کا ازالہ ہے کہ گو ملک کا کسی کو عطا کرنا میری مشیت

سے ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ مشیت خالی از حکمت ہوتی ہے بلکہ اللہ کا مشیتی فعل بھی حکمت کے ماتحت ہی ہوتا ہے لفظ وَاسِعٌ میں قدرت اور مشیت کے دائرہ کی وسعت کو بیان کرنا مقصود ہے اور عَلِیْمٌ کی قید اس کی مشیت کی وسعتوں میں حکمت وعلم کے دخل کی طرف اشارہ کرتی ہے جس طرح کہ صاحبانِ ذوق پر مخفی نہیں ہے۔

سوال:۔ اگر بنی اسرائیل نے نبی وخدا کے انتخاب پر اعتراض کرنا تھا تو پہلے اپنے میں سے ایک کو چُن لیتے۔ اور بادشاہ بنا لیتے۔ نبی سے اس چناؤ کی درخواست کیوں کی؟

جواب:۔ اس صورت کے بغیر ان کا اپنا چناؤ کسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ تمام سرکردہ افراد اور سرداران قوم اپنا نام امیدواروں کی فہرست میں گنوا دیتے اور اس صورت میں تمام قبیلوں کی آپس میں سر پھٹول ہو جاتی اور بدترین نتیجہ برآمد ہوتا۔ لیکن جب اُن کے سامنے ایک ایسے شخص کا انتخاب ہوا۔ جس کو وہ سب نہ چاہتے تھے تو اس کے خلاف ہنگامہ آرائی کر کے باہمی طور پر کسی ایک پر جمع ہو جانا ممکن تھا۔ کیونکہ اسی صورت میں جذبات کا اُبھار چونکہ ایک معین شخص کے خلاف شدت کی صورت میں ہوتا ہے لہذا یہ قربانی کرنا آسان ہوتا ہے کہ چلو میں نہ سہی کوئی دوسرا برادری کا آدمی سہی بہرکیف وہ نہ ہو جس کو ہم متفقہ طور پر نہیں چاہتے۔

نصیحت وعبرت قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات اور حکایات صرف ظاہری دلچسپی کے لئے نہیں دہرائے گئے بلکہ چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے موعظہ بھی ہے اور دستور العمل بھی لہذا اس کے تمام قصص وحکایات تا قیامت امتِ مرحومۂ اسلامیہ کے لئے دعوتِ عمل ہیں۔ ایک نبی کا واقعہ اور ان کی امت کے ساتھ گفت وشنید اعتراضات وجوابات اور ان سب کا ردّ عمل یہ باتیں صرف کانوں کی ہوس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ درس حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

پس آیاتِ زیرِ بحث میں جہاں مقابلۂ دشمن میں ثبات قدمی کی دعوت دی گئی ہے اور بزدلی کی مذمت کی گئی ہے۔ وہاں ساتھ ساتھ اس اہم مطلب کے چہرہ سے بھی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ عہدہ حکومتِ الٰہیہ کے لئے عہدہ دار کا انتخاب صرف اللہ تعالٰے کے ہاتھ میں ہے جس کا اعلان کرنے کا نبی کو حق حاصل ہے۔ اور اُمت کو نہ اس پر اعتراض کرنے کی اجازت ہے اور نہ اس معاملہ میں ان کا اجماع کوئی وقعت رکھتا ہے۔ اب مسلمان ذرا سوچیں کہ ہمارے نبی نے بھی ہمارے اُوپر کوئی حاکم مقرر کیا ہے یا وہ ہم کو اندھیرے میں چھوڑ کر چلے گئے تو اس کا جواب کتب فریقین سے بتواتر ملتا ہے۔ کہ نبی نے ہمیں بار بار بتایا۔ گھر میں بتایا۔ سفر میں بتایا۔ مسجد میں بیان کیا۔ جنگوں کے مواقع پر بیان کیا۔ فرداً فرداً سنایا۔ اور کھلے جلسوں میں ببانگ دہل اعلان فرمایا۔ پہلے پہل دعوتِ ذوالعشیرہ میں اپنی تصدیق کرنے والے کے لئے اپنے بعد کے لئے

خلافت کی پیش کش فرمائی۔

اور سب سے آخر میدانِ غدیر میں ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں کھلے الفاظ میں خلافت کا اعلان فرمایا اور صرف یہ نہیں بلکہ دستار بندی بھی کرائی اور صحابہ سے بیعت بھی کرائی اور صحابہ کرام نے بخٍ بخٍ لک کے گرانقدر الفاظ سے علی کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔

ان کے علاوہ حدیث مواخات - حدیث طیر - حدیث منزلت وغیرہ میں صاف طور پر علی کی خلافت کو بیان فرمایا اور حدیث الثقلین کو کئی بار دہرا دہرا کر تمام مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش فرمائی۔ کہ میرے بعد سوائے میری آل کے تمہارے لئے کوئی قرآنی مسائل کو حل کرنے کے لئے اہل نہیں ہے - یہی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن اُن کے ساتھ ہے اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہ ہوں گے۔ یہاںتک کہ وہ تمہیں حوضِ کوثر پر میرے پاس لے آئیں گے۔

لیکن افسوس کہ امتِ اسلامیہ نے گذشتہ واقعات کو صرف کانوں تک ہی محدود رکھا اور قرآن نے گذشتہ اقوام و امم کے جس جس کردار کو غلطی اور بے راہ روی سے تعبیر کیا تھا مسلمانوں نے صرف زبان سے قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر لی لیکن عمل وہی کیا جو گذشتہ امتیں کر گذریں - حضرت رسالتمآبؐ کے مقرر کردہ خلفاءؑ کو پیچھے ہٹانے اور دوسروں کو آگے بڑھانے میں وہی بہانے تجویز کئے جو گذشتہ امتوں نے کئے تھے جن کو قرآن نے رد کر دیا تھا اور باوجودیکہ معیار قرآنی کے مطابق حضرت علیؑ انتخابِ حکومتِ الٰہیہ کے لئے تمام سے موزوں تر تھے اور خدا کی طرف سے منتخب بھی تھے - پوری اُمت میں نہ اُن سے بڑھ کر کوئی عالم تھا اور نہ ان سے زیادہ کوئی شجاع تھا - دیگر اوصاف کمالیہ میں بھی وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے لیکن امت کا رویہ وہی رہا جس کو تاریخ گذشتہ کے طور پر قرآن نے عبرت حاصل کرنے کے لئے دہرایا تھا - اس مقصد کی مزید وضاحت ہماری کتاب "اسلامی سیاست" میں ملاحظہ فرمائیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ

اور ان کو اپنے نبی نے بتایا کہ تحقیق اس کے بادشاہ بننے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس

التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

تابوت آئے گا جس میں تسکین ہے (تمہارے لئے) تمہارے رب سے اور بقیہ (تبرکات) ان چیزوں سے جو

آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي

چھوڑ گئے حضرت موسیٰ و ہارون ۔ کہ فرشتے اس کو اٹھالائیں گے ۔ تحقیق اس میں

ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ ع ۱۶

تمہارے لئے نشانی ہے ۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو ۔

تابوت بنی اسرائیل

وَقَالَ لَهُمْ ۔ گویا انہوں نے اپنے نبی سے طالوت کی بادشاہت کی نشانی طلب کی اور نبی نے یہ فرمایا کہ تمہارے پاس تابوت آئے گا اور برہان میں حضرت باقرؑ سے مروی ہے کہ یہ وہی تابوت تھا جس میں حضرت موسیٰ کو اپنی والدہ نے بند کرکے دریا میں ڈال دیا تھا اس میں تورات کی الواح اور موسیٰ کی زرہ اور دیگر تبرکات بند تھے بنی اسرائیل اس کی تعظیم کرتے تھے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد وہ ان کے وصی یوشع کے پاس تھی ۔ پس کچھ عرصہ بعد انہوں نے اس کی تعظیم چھوڑ دی ۔ حتیٰ کہ بچے اس کے ساتھ رستوں میں کھیلا کرتے تھے جب تک انہوں نے تابوت کی عزت کی وہ خود بھی عزت میں رہے اور جب وہ گناہوں میں پڑکر تابوت کی عزت سے کنارہ کش ہوئے تو مبتلائے مصائب ہوگئے اور مروی ہے کہ ان کے دشمن جب ان پہ غالب ہوئے تو ان کے باقی سامان لوٹنے کے ساتھ ان سے وہ تابوت بھی چھین لئے گئے تھے ۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ تابوت حضرت آدم پر اترا تھا اور اس میں تمام انبیاء کی تصویریں تھیں اور ورثہ بورثہ بنی اسرائیل تک پہنچا تھا اور امام موسیٰ کاظم سے مروی ہے کہ اس کا طول تین ذراع اور عرض دو ذراع تھا (برہان) لڑائی کے وقت اس کو لشکر کے سامنے رکھتے تھے اور اس سے آواز پیدا ہوتی تھی اور چل پڑتا تھا اور فوج اس کے پیچھے پیچھے چلتی تھی جب وہ ٹھیر جاتا تو وہ بھی ٹھیر جاتے تھے ۔

فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ ۔ اس کے مطلب میں اختلاف ہے بعض روایات میں ہے کہ تابوت سے جنت کی ہوا نکلتی تھی اور وہی سکینہ تھی اور علامہ طبرسی نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ سکینہ کا معنی امن و اطمینان ہو کیونکہ اس تابوت میں بھی بنی اسرائیل کے لئے سکون قلب و اطمینان ہوتا تھا ممکن ہے کہ اس سے مراد آثار علم کا بقیہ اور تبرکات انبیاء ہوں۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سکینہ کا معنی دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ اللہ کی پیدا کردہ روح تھی جو بولتی تھی اور جب اُن کو آپس میں اختلاف درپیش ہوتا تو وہ ان کے ساتھ کلام کرتی تھی اور خبر دیتی تھی (برہان)

اٰلُ مُوْسٰی وَاٰلُ ھٰرُوْنَ ۔ اس مقام پر آل موسیٰ و آل ہارون سے مراد خود موسیٰ و ہارون ہیں اور عرب میں آل فلاں بول کر خود وہ شخص مراد لینا عام ہے اور کہتے ہیں کہ اس تابوت میں حضرت موسےٰ کی نعلین اور حضرت ہارون کا عمامہ بھی تھا۔

تَحْمِلُہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ۔ فرشتوں کے اٹھالانے کا مطلب بعضوں نے تو یہی بیان کیا ہے کہ جانب آسمان سے فرشتے اٹھا کر لائے۔ چنانچہ ابن عباس سے یہی قول مروی ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل کے دُشمن ان پر غالب آئے اور ان سے تابوت چھین لیا۔ اور انہوں نے تابوت کو اپنے بتخانہ میں لے جا کر رکھ دیا۔ پس تابوت کے پہنچتے ہی تمام بُت منہ کے بل گر گئے۔ تو انہوں نے تابوت کو وہاں سے نکال کر شہر کے باہر کہیں رکھ دیا۔ پس ان لوگوں کی گردنوں میں درد پیدا ہو گیا اور جہاں تابوت رکھتے تھے وہاں وباء اور موت عام ہو جایا کرتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اس کو یہیں سے نکال دینا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو دو بیلوں پر مضبوط کس کر باندھ دیا۔ اور ان دو بیلوں کو ہانک دیا۔ پس ملائکہ ان کو بنی اسرائیل کے پاس لائے اس روایت کے اعتبار سے تَحْمِلُ کا معنی صرف لانا ہو سکے گا نہ کہ اٹھا لانا۔

مقدمۂ تفسیر مراۃ الانوار میں ہے کہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبرکاتِ انبیاء مثلاً الواح اور عصا موسیٰ اور ان کے علاوہ باقی چیزیں آئمہ معصومین علیہم السّلام کے پاس موجود تھیں اور تابوت بھی ان کے پاس تھا۔ کیونکہ یہ چیزیں اسی میں تھیں اور بعض زیارات کے کلمات میں ہے کہ تم وہی ہو جن کے پاس تابوتِ سکینہ پہنچائی گئی اور بعض زیارات میں ہے کہ تم وہ ہو کہ خدا نے تم کو اپنی حکمت کا تابوت قرار دیا ہے اور اسی کتاب میں مناقب ابن شہر آشوب سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد حضرت جبرئیلؑ اہلبیتؑ کو پرسا دینے کے لئے آیا اور سلام دیا یہانتک کہ اس نے کہا جَعَلَکُمُ اللّٰہُ تَابُوْتَ عِلْمِہٖ وَاَوْرَثَکُمْ کِتَابَہٗ ۔ یعنی تم کو خدا نے اپنے علم کا صندوق و تابوت بنایا ہے اور تمہیں اپنی کتاب کا وارث بنایا ہے۔

بعض مفسّرین نے اس مقام پر سکینہ سے مراد رُوح سکون لیا ہے جو خداوند کریم مومنین کو عطا فرماتا ہے اور اس کو سکینہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے دل و دماغ میں سکون و اطمینان آجاتا ہے اور احادیث جو سکینہ کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان کی تاویل بھی اسی معنی کے مطابق کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ

پس جب روانہ ہوا طالوت فوج لے کر تو کہا کہ تحقیق اللہ تمہارا امتحان کرنے والا ہے۔

بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ

ایک نہر سے پس جو اس سے پئے گا وہ میرا نہ ہوگا اور جو اس سے نہ پئے گا وہ میرا ہوگا مگر وہ جو اپنے ہاتھ

مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا

سے ایک چلو لے لے (اس پر حرج نہیں)۔ پس سب نے اس سے پیا۔ سوائے ان کے تھوڑے آدمیوں

قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا

کے۔ پس وہ جب وہاں سے گذر گئے بمعہ ان لوگوں کے جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے وہ کہنے لگے

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ

کہ آج ہماری طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کریں ان لوگوں نے کہا جو یہ سمجھتے تھے کہ ہم

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اللہ سے ملنے والے ہیں کہ بسا اوقات تھوڑی جماعتیں فتح پا لیا کرتی ہیں بڑی جماعتوں پہ بحکم خدا

طالوت و جالوت کی لڑائی کا قصہ

فَلَمَّا فَصَلَ۔ گویا بنی اسرائیل نے نشانی طلب کی اور وہ تابوت اسی بیان کردہ صفت کے ساتھ ان کے پاس آیا۔ تو انہوں نے طالوت کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ اور اسی ہزار یا ستر ہزار کی تعداد میں باختلافِ روایت فوج لے کر جہاد کے لئے روانہ ہوئے۔ پس خدا نے ان کے صبر کا امتحان لیا تاکہ سچے ایماندار اور جھوٹے کا فرق معلوم ہو جائے۔ جب نہر کے کنارے پہنچے تو طالوت نے ان کو امتحان کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان تھی اور بعض کا خیال ہے کہ وہ نہر فلسطین تھی۔

احتجاج سے مروی ہے کہ طاؤس یمانی نے حضرت امام محمد باقرؑ سے دریافت کیا کہ وہ کون سی چیز ہے۔ جس کا تھوڑا حلال ہے اور زیادہ حرام ہے آپ نے فرمایا وہ نہر طالوت ہے جس کا ایک چلو حلال اور زیادہ پینا حرام تھا۔

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ

اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے اور جب نکلے جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے تو یہ

قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا

دعا مانگی۔ اے ہمارے رب ہمیں صبر کی توفیق دے اور ہمیں ثابت قدمی عطا کر اور کافر قوم پر

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

ہماری نصرت فرما

اِلَّا قَلِيْلًا۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ تین سو تیرہ تھے کہ بعضوں نے ایک چلو پیا تھا اور بعضوں نے کچھ بھی نہ پیا تھا اور بعض کہتے ہیں وہ کل چار ہزار تھے لیکن ان میں سے باقی منافق ہو گئے اور صرف تین سو تیرہ ثابت قدم رہے اور کہتے ہیں۔ طالوت نے نافرمانوں کو واپس کر دیا اور صرف ایمان والوں کے ساتھ نہر کو عبور کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بصراحت موجود ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جنہوں نے چلو پیا تھا وہ سیر ہو گئے اور جنہوں نے حرص زیادہ کیا۔ ان کی پیاس بڑھ گئی اور ہونٹ بھی سیاہ ہو گئے (حاشیہ مقبول)

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا۔ چونکہ ان کی تعداد کم تھی اور ادھر جالوت کے پاس بہت کافی فوج تھی۔ اس لئے بعض لوگ گھبرا کر یہ بات کہنے لگے جو قرآن میں ہے۔

طالوت کا ایمان

قرآن مجید کے الفاظ سے طالوت کا مومن یا کافر ہونا واضح نہیں ہوتا لیکن اشارات و کنایات کی رُو سے اُن کے مومن ہونے کا پہلو زیادہ روشن ہے چنانچہ بعضوں نے ان کی نبوت کا قول بھی کیا ہے جیسا کہ صفحہ ۱۱۴ پر گزر چکا ہے البتہ تاریخ سے اس کے مومن نہ ہونے کے قول کو تقویت پہنچتی ہے چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ اعلان جنگ کے بعد طالوت نے اپنی فوج میں اعلان کیا تھا کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس کو اپنی لڑکی کا رشتہ بھی دوں گا اور اس کے نام کا سکہ بھی جاری کر دوں گا جب حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کیا تو اس نے حسب وعدہ داؤد کو لڑکی بیاہ دی اور ان کے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا اور حضرت داؤد نے اپنی خداداد استعداد سے جب لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تو اُن کی مقبولیت عامہ سے گھبرا کر طالوت نے اپنے اقتدار کی بحالی کیلئے ان کو اپنے راستہ سے ہٹانے کی ٹھان لی اور اسی قلبی کدورت کو عمل میں لانے کیلئے اس نے بنی اسرائیل کے کافی علماء مروا ڈالے تاکہ اس بہانہ سے کسی وقت حضرت داؤد کو بھی قتل کروا دیا جائے لیکن اللہ نے اس کے ارادۂ فاسدہ کو پہنچنے نہ دیا چنانچہ ایک آنے والی جنگ میں طالوت خود دشمن کے ہاتھوں مارا گیا اور حضرت داؤد جو نائب السلطنت کے عہدہ پر پہلے فائز تھے حکومت کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا اور وہ طالوت کے بعد مملکت اسرائیل کے مطلق فرماں روا ہو گئے۔

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاٰتٰىهُ

پس انہوں نے ان کو شکست دے دی باذن خدا اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا کیا اس کو

اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ

اللہ نے ملک اور علم شریعت ۔ اور اس کو سکھایا جو چاہا اور اگر نہ ہوتا خدا کا دفع

اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ

کرنا بعض (مفسد) لوگوں کا بذریعہ بعض دوسرے لوگوں کے تو زمین فساد سے بھر جاتی ۔ لیکن

اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ

اللہ صاحب فضل ہے اوپر عالمین کے یہ اللہ کی آیات ہیں

نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

جن کو ہم آپ پر حق کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں

حضرت داؤد کی شجاعت

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوْتَ ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے نبی کو یہ وحی ہوئی تھی کہ جالوت کو وہ شخص قتل کریگا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زرہ فٹ ہوگی اور وہ شخص لاوی بن یعقوب کی اولاد سے ہے جس کا نام داؤد ہے اور دنبیاں چراتا ہے اور اس کے باپ کا نام ایشا ہے (اسی) ایشا کے دس فرزند تھے اور حضرت داؤد سب سے چھوٹے تھے پس جب طالوت کے پاس لشکر جمع ہوا ۔ تو انہوں نے ایشا کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنے بیٹوں کو لائیں پس جب وہ حاضر ہوئے تو حضرت موسےٰ کی زرہ باری باری سے ہر ایک کو پہنائی لیکن وہ کسی پر فٹ نہ آئی بلکہ کسی سے بڑی اور کسی سے چھوٹی ہوتی تھی تو طالوت نے دریافت کی کہ ان کے علاوہ آپ کا کوئی فرزند بھی ہے ؟ انہوں نے جواب دیا ۔ کہ ہاں ! ان سب سے چھوٹا ایک ہے جس کو دنبیوں کی حفاظت کے لئے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ پس ان کو طلب کیا گیا ۔ جب ان کو پیغام پہنچا تو وہ غلیل مارنے کی ایک کمان (فلاخن یا گوپھن) اپنے ساتھ لئے وہاں سے روانہ ہوئے ۔ رستہ میں تین پتھروں نے یکے بعد دیگرے آواز دی

کہ ہمیں اسے داؤد اپنے ساتھ لیتے جایئے۔ کہ تیرے کام آئیں گے پس انہوں نے ان کو اپنے توبرہ میں رکھ لیا اور وہ فیروزہ کے پتھر کی قسم سے تھے اور حضرت داؤد تنومند بہادر اور قوی ہیکل جوان تھے۔ پس جب طالوت کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کو حضرت موسیٰ کی زرہ پہنائی جوان کو پوری طرح فٹ آئی۔

پس القصہ جب طالوت کا لشکر جالوت کے لشکر کے مقابلہ میں آیا۔ تو جالوت کی شجاعت کا بڑا چرچا سنا۔ حضرت داؤد نے ان سے کہا کہ جس کے بارے میں اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ خدا کی قسم ایک بار مجھے دکھا دو۔ اُسے ضرور قتل کروں گا۔ حضرت داؤد کا کہنا تھا کہ پورے لشکر میں اُن کے جرأت مندانہ کلام کی آواز مشہور ہوئی اور اُن کو طالوت کے سامنے لایا گیا۔ طالوت نے دریافت کیا کہ آپ کی قوتِ بازو کی کیا حد ہے اور آپ نے کس حد تک اپنی طاقت کو آزمایا ہے (کہ اسقدر جرأت آمیز دعوے کرتے ہو۔) تو انہوں نے کہا کہ میری قوت بازو یہ ہے کہ شیر جب میری دُنبیوں پر حملہ آور ہوتا تھا۔ تو میں اس کو پکڑ لیتا تھا اور اس کے سر کو قابو کر کے اس کی ڈاڑھیں کھول کر اپنی دُنبی وغیرہ اس کے مُنہ سے چھڑا لیتا تھا۔ تب طالوت اور لشکریوں کو اطمینان حاصل ہوا۔

پس جب صُبح کو دونوں لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے تو جالوت اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آیا۔ بقول صاحب عمدۃ البیان تقریباً انیس ۱۹ من لوہا بوزن ہندی کے برابر اس کے جسم پر ہتھیار تھے اور تقریباً چھ من وزن کا اس کے سر پر خود تھا۔ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے سر پر ایک تاج تھا اور پیشانی پر ایک یاقوت تھا جو چمکتا تھا اس کا لشکر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

حضرت داؤد نے فلاخن میں ان تین پتھروں سے ایک پتھر رکھ کر لشکر جالوت کے میمنہ (دائیں حصہ) پر مارا۔ جب وہ پتھر ان پر گرا۔ تو وہ بھاگ گئے۔ پھر دوسرا پتھر لشکر جالوت کے میسرہ (بائیں حصہ) پر مارا تو پتھر کے پڑنے سے وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے پس تیسرا پتھر سیدھا جالوت کو نشانہ بنا کر مارا تو وہ پتھر اس کی پیشانی پر ٹھیک اسی یاقوت والے مقام پر پڑا۔ جو اس کے سر کو پھوڑ کر دماغ تک جا پہنچا اور ہاتھی کی پشت سے دھڑام زمین پر گر پڑا۔

لوگوں میں حضرت داؤد کی شجاعت کا ڈنکا بج گیا اور اس واقعہ کے بعد حضرت داؤد کو بادشاہت کے لئے منتخب کیا گیا اور بنی اسرائیل نے ان کی حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ اہل تفاسیر نے اس واقعہ کو اسی طرح ہی بیان کیا ہے اگرچہ کئی تفسیروں کے مختلف بیانات کو میں نے یک جا کر دیا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ۔ اس فقرہ کا ایک معنی تو وہ ہے جو تحت اللفظ موجود ہے اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے اس کا معنی یوں منقول ہے کہ اگر نہ ہوتا خدا کا معاف کرنا اور درگذر کرنا۔ بعض گنہگار لوگوں سے بتصدق دوسرے بعض نیک لوگوں کے۔ تو تمام اہل ارض عذابِ خداوندی کی وجہ سے درہم برہم ہو چکی ہوتی۔ لیکن اللہ تمام جہانوں پر صاحبِ فضل و کرم ہے چنانچہ حضرت صادق علیہ السلام سے بطرق مختلفہ مروی ہے کہ خدا ہمارے نماز گذار شیعوں کی

وجہ سے بے نماز شیعوں سے درگذر فرما لیتا ہے ورنہ اگر سب بے نماز ہوتے تو یقیناً ہلاک ہو جاتے اور ہمارے روزہ دار شیعوں کی بدولت بے روزہ شیعوں سے عذاب ٹال دیتا ہے ورنہ اگر سب بے روزہ ہو جاتے۔ تو معذب کر دیئے جاتے اور ہمارے زکوٰۃ دینے والے شیعوں کی وجہ سے بے زکوٰۃ شیعوں سے درگذر کرتا ہے ورنہ اگر سب تارکِ زکوٰۃ ہو جاتے تو ہلاک ہو جاتے۔

اور ہمارے حاجی شیعوں کے صدقہ سے تارکِ حج شیعوں سے درگذر کرتا ہے ورنہ اگر سب تارک حج ہو جاتے تو ہلاک ہو جاتے اور فرمایا کہ خدا کی قسم یہ آیت تمہارے ہی حق میں اتری ہے اور اس سے تم ہی مراد ہو اور تمہارے غیر مراد نہیں ہیں۔ (تفسیر البرہان)

ربیع الابرار زمخشری سے بروایت ابن عمر مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ خداوند کریم ایک نیک مسلمان کی بدولت اس کے قریب بسنے والے ایک لاکھ گھرانوں سے مصیبت کو دفع فرماتا ہے اور پھر آپ نے یہی آیت پڑھی۔

مجمع البیان میں جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے کہ جناب رسولخدا نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرد مسلمان جو نیک اور صالح ہو، کی بدولت خداوند کریم، اس کی اولاد، اس کی اولاد کی اولاد اور پھر ان کی اولاد، اور اس کا باقی خاندان اور اس کے جوار میں بسنے والے خاندانوں کی حالتوں کو سنوار دیتا ہے اور اس نیک مرد مسلمان کی بدولت وہ سب حفظ و امانِ خدا میں آجاتے ہیں۔

پس طالوت کے انتخاب اور حضرت داؤد کی شجاعت کی بدولت بنی اسرائیل کو دشمن پر کامیابی نصیب ہوئی اور ہر قسم کی مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ اور اس تجربہ کے بعد بنی اسرائیل کو اپنے سابقہ اعتراضات کی غلطی کا علم ہو گیا اور انہیں معلوم ہو گیا۔ کہ واقعی خدائی انتخاب ہی امن و سلامتی کا مژدہ لا سکتا ہے اور علم و جسمانی طاقت ہی معیارِ انتخاب ہو سکتی ہے۔ اس معاملہ میں خاندانی جاہ و جلال و زر و دولت اور فراوانئ مال پر نازاں ہونا صرف حماقت اور ناعاقبت اندیشی ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اعلانِ قدرت کے بعد اجماعی پروگرام کی ترتیب مفت کی ہنگامہ آرائی ہے۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے متعلق قرآن مجید میں کوئی نص نہیں ہے لیکن یہ بات صرف ان کی قرآنی مطالب سے چشم پوشی اور پہلو تہی، بلکہ حسد اور تعصب کی آئینہ دار ہے۔ قرآن مجید میں امم سابقہ کے واقعات صرف قصہ خوانی کے طور پر نہیں ہیں بلکہ وہ تو تاقیامت انسانی فلاح و بہبود کا ایک معیار بیان کرتا ہے خواہ اس کا تعلق اخروی مفاد سے ہو۔ یا دنیوی فلاح سے ہو۔ خواہ تدبیر منزل کے متعلق ہو یا سیاست عامہ کے متعلق ہو۔ جب ایک امت کے لئے ایک معیار قائم کیا گیا اور قرآن نے اسے بیان کر کے اس کے نتائج سے بھی روشناس کرا دیا تو تاقیامت وہ معیار تمام امتوں کے لئے ایک نص کی حیثیت رکھتا ہے پس امتِ اسلامیہ میں اگر جناب رسالتمآبؐ کے بعد انتخاب خلافت ضروری ہے اور ہے بھی ضروری تو جو بھی اس معیار پر پورا اترے وہی اہل ہے کہ خلیفۃ اللہ سے کہا جائے اور ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کے علاوہ اس معیارِ انتخاب پر کوئی بھی پورا نہیں اتر سکا تو قرآنی مذکورہ بالا آیات حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر نص نہیں تو کیا ہے۔ نص اور معیار کے درمیان

فرق اور اس کی ضروری وضاحت ہماری کتاب "اسلامی سیاست" میں ملاحظہ فرمائیے ۔

فلسفۂ جذب و دفع

اس میں شک نہیں کہ عالم میں جذب و دفع کی دونوں قوتیں اپنے اپنے مقام پر عمل پیرا ہیں اور نظامِ عالم کی دیمومیت وبقا میں ان کو خصوصی دخل ہے ورنہ اگر ان دونوں میں سے ایک کا وجود ختم ہو جائے تو پورا عالم عدم کی گود میں جا آرام لے گا زمین میں اپنی جگہ جذب موجود ہے جسے کشش کہا جاتا ہے اور سورج میں اپنے مقام پر یہی جذب و کشش موجود ہے پس اگر ان میں دفع کی قوت موجود نہ ہو تو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے اسی طرح عالم علوی کے تمام اجرام چاند سورج اور ستارے وغیرہ انہی دونوں قوتوں کی بناء پر برقرار ہیں۔ یعنی عالم وجود کے علوی یا سفلی اہم پرزے قوتِ جذب کی بناء پر ایک دوسرے سے اس قدر دُور نہیں جا سکتے کہ باہمی افادہ و استفادہ سے محروم رہ جائیں اور قوتِ دفع کی بنا پر ایک دوسرے کی طرف کھچ کر تباہی و بربادی سے بھی ہمکنار نہیں ہوتے ۔ پس جب تک یہ جذب و دفع کا توازن قائم ہے عالم باقی ہے اور جب یہ توازن ختم ہو گا ۔ بقا کی کشتی گرداب میں آکر ساحلِ فنا پر جا دم لے گی۔

اگر عالم علوی سے قطع نظر کر کے صرف عالم سفلی کا نظرِ غائر سے مطالعہ کیا جائے تو وجود عناصر و عنصریات میں انہی دونوں قوتوں کی کار فرمائی موجود ہے ۔ نہ یہ ایک دوسرے سے اس قدر دُور ہیں کہ باہمی نفع رسانی سے محروم ہوں اور نہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ لڑ کر فنا ہو جائیں ۔ اسی طرح زمین کی ہر جزوی پیداوار کو الگ الگ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ایک میں یہی دونوں اصول کار فرما نظر آتے ہیں ۔ خواہ جمادات ہوں یا نباتات اور حیوان ہوں یا انسان ، یعنی کوئی ذی رُوح یا غیر ذی رُوح مخلوق ایسی نہیں جو کلی نظام میں ان دونوں قوتوں سے متاثر ہوئے بغیر افادیت کی حامل ہو۔

وجودِ انسانی جس کو عالمِ اصغر سے تعبیر کر کے عالم اکبر کا خلاصہ کہا گیا ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کی طرف ایک شعر بھی منسوب ہے ۔

أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَفِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

وَأَنْتَ الْكِتَابُ الْمُبِيْنُ الَّذِيْ بِأَحْرُفِهٖ يَظْهَرُ الْمُضْمَرُ

کیا تو اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا جسم خیال کرتا ہے حالانکہ تجھ میں ایک عالمِ اکبر پنہاں ہے اور تو وہ کتاب مبین ہے جس کے حروف سے راز ہائے پوشیدہ کھلتے ہیں ۔"

اس مختصر سے وجود کی طبیعت میں جذب و دفع کی دونوں طاقتیں ظاہر و باہر ہیں اور دونوں کی بدولت نظامِ جسم قائم ہے اور جب تک ان میں توازن موجود ہے نظامِ جسم باقی ہے اور جب توازن ختم ہو جاتا ہے موت سوار ہو جاتی ہے اور فرداً فرداً ہر حیوان کی یہی کیفیت ہے اور یہی تجاذب و تدافع جس طرح فرد فرد میں نظامِ شخصی کا محافظ ہے اسی طرح ہر نوع

اور صنف میں نظامِ نوعی و صنفی کا کفیل ہے اور پورے وجود سفلی میں نظام کلی کا ضامن ہے اور تمام عالم میں نظام اتم و اکمل کا ذمہ دار ہے جو نظام کل ہے۔

پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں قوتیں فطری طور پر تحفظ و بقائے نظام میں کلی و جزئی ہر دو طریق سے دخیل ہیں۔ اور ان کا باہمی توازن رُوحِ حیات ہے۔

قرآن مجید نے اس مقام پر اسی فطری اصول کو پیش فرماتے ہوئے جہاد کو انسان کُشی کے الزام کے پیشِ نظر بربریت اور سفاکیت سے تعبیر کرنے والوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر دفع کا اصول نہ ہوتا اور جذب ہی جذب پر عمل ہوتا تو نظام انسانی درہم برہم ہو جاتا۔ کیونکہ انسان میں تسخیر موجودات کا جذبہ جو اسے فطرت سے تفویض ہوا ہے اس کے پیشِ نظر وہ ہر معاملہ میں اور ہر مرحلہ پر اپنی ہر محبوب و مرغوب شے کے حصول کا متمنی رہتا ہے اور ہر شوق و خواہش کی تکمیل کا آرزومند ہوتا ہے بنا بریں وہ اسی تلاش میں ہر گوشہ میں جھانکتا ہے اور ہر وادی میں قدم رکھنے کی جرأت کرتا ہے۔

اور چونکہ ہر انسان کی فطرت کا تقاضہ یہی ہے تو مرغوبات و مشتہیات میں تصادم ضروری ہے اور بغیر تدافع کے ناممکن ہے کہ کوئی بھی کسی مرغوب چیز سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ بلکہ جذب کا معنی دفع کے بغیر اور دفع کا معنی جذب کے بغیر قطعاً پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جذب کا معنی ہے کسی شے کو حاصل کرنا یعنی اس کی ضد اور نقیض کو دفع کرنا اور اسی طرح دفع کا معنی ہے کسی ناپسند حالت یا چیز کو دور کرنا یعنی اس کی ضد یا نقیض کو حاصل کرنا۔ پس یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے۔

پس جب یہ دونوں قوتیں فطری ہیں تو تمدن و اجتماع سے ان کا ٹکراؤ ضروری ہے اور کَانَ النَّاسُ اُمَّةً کی تفسیر میں گذر چکا ہے کہ لوگوں کی اس مقام پر وحدت سے مراد ہے فطرت اولیہ میں یکسانگی یعنی فطرت اولیٰ کے اعتبار سے وہ سب کے سب مدنی الطبع تھے اور اتحاد و تعاون ان کا ذاتی جوہر تھا۔ لیکن تجاذب و تدافع کے فطری اصولوں کے ماتحت ان میں اختلاف ضروری تھا۔ لہذا خداوند کریم نے انبیاء و مرسلین کو بھیج کر ان کو جذب و دفع میں توازن قائم کرنے کی دعوت دی تاکہ جذب و دفع اپنے نقطہ اعتدال میں رہ کر تمدن و اجتماع سے ٹکر نہ لیں جو نظام انسانی کے لئے ازبس ضروری ہے لیکن جذبات و خواہشات کا وفور انبیاء کی اس دعوت سے ٹکرا گیا اور چونکہ انبیاء کی یہ دعوت اقتدار پر ضرب کاری تھی لہذا بالخصوص طاقت و ثروت رکھنے والا گروہ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آیا۔ اور ان کے اتباع اور نچلا طبقہ جو علم و معرفت سے کورا ہونے کی وجہ سے ہاؤ ہو اور شور و غوغا کا تماشائی طور پر نظارہ گر تھا انہوں نے بلا سوچے سمجھے بڑوں کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی اور انبیاء کے خلاف اپنے بڑوں کا سہارا لیتے ہوئے زبان درازی طعن و تشنیع اور ایذا رسانی سے ان کو ستانے لگ گئے۔ لیکن بالآخر حقیقت بین اور حق شناس طبقہ کم و بیش ہر زمانہ میں انبیاء کا ہم آہنگ بھی ہوتا رہا۔ تو چونکہ انبیاء تمدن کی اصلاح کے پیشِ نظر جذب و دفع میں اعتدال کی

دعوت دیتے تھے تاکہ انسانیت صفحۂ عالم پر خوب پھولے پھلے اور ان کے مخالفین خواہشات وشہوانی جذبات کے ماتحت جذب و دفع میں بے راہ روی اور بے اعتدالی کے علم بردار تھے اور بالخصوص برسر اقتدار گروہ جن کی عیاشانہ زندگی اور رنگ رلیاں اس توازن و اعتدال کے بعد موت سے ہم آغوش ہو جاتیں وہ خاص طور پر دعوت انبیاء سے برسر پیکار تھے اور ان لوگوں کو بے اعتدالیوں کی کھلی چھٹی دینا چونکہ پوری نوع انسانی کے لئے پیغام موت تھا اور زبانی تبلیغ کی ان کے ہاں کوئی پذیرائی نہ تھی لہٰذا حکم جہاد دیا گیا تاکہ نوع انسانی میں سے اس حصے کو الگ کر دیا جائے جو پوری نوع کے وجود کے لئے باعث خطرہ ہے پس معلوم ہوا کہ ذاتی مفاد کی خاطر کسی کو قتل کرنا نفس کشی اور ظلم ہے لیکن نوع انسانی کی حفاظت کے لئے فرد خبیث کو موت کے گھاٹ اتار دینا پوری نوع پر احسان عظیم اور انسانیت نوازی ہے۔

آیت مجیدہ میں دفع کو خدا نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کیونکہ یہ دفع عام فطری جذب و دفع پر حاکم ہے کیونکہ فطری جذب و دفع میں افراط و تفریط کو ختم کرنے اور ان میں اعتدال و توازن کو قائم کرنے کے لئے انبیاء کو جس جہاد کا حکم دیا گیا وہ دفاع عام فطری دفاع سے الگ ہے جس طرح کہ ان کا جذب عام فطری جذب سے جداگانہ ہے کیونکہ انبیاء کی تبلیغ جو انسان کے تمدن کو ہموار راہوں پر چلانے کے لئے تھی وہی ان کا جذب تھا اور جو لوگ اس تمدن میں بے راہ روی اور بداعتدالی کو اپناتے ہوئے درحقیقت پوری نوع کے لئے معرض خطر تھے بلکہ وجود انسانیت پر وہ حملہ آور تھے ان کو اس طغیانی اور سرکشی سے باز رکھنا اور انسانیت پر ان کے اس حملہ کو روکنا اور ان کے سامنے علم جہاد بلند کرنا اُن کا دفع تھا۔ گویا انبیاء نوع انسانی کے لئے حکیم و ڈاکٹر تھے جس طرح ڈاکٹر بدن انسانی میں توازن و اعتدال کی بحالی کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی عضو اس قسم کا مریض ہو کہ اس کا مرض پورے بدن کے لئے معرض خطر ہو اور اس کا علاج بھی کسی صورت میں نہ ہو سکتا ہو تو حفاظت بدن کے لئے اس کو سرے سے کاٹ دیتا ہے اور اس عضو کو کاٹ دینا جو پورے بدن کے خلاف علم بغاوت اٹھائے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر کا ظلم و تشدد شمار نہیں ہو گا۔ بلکہ پورے بدن پر اس کا یہ فعل احسان عظیم ہو گا۔ اسی طرح نوع انسانی میں توازن و اعتدال کی بحالی کے لئے انبیاء روحانی ڈاکٹر ہیں اور ناقابل اصلاح افراد اور پوری نوع کے مفاد کو خطرہ میں ڈالنے والے مفسد اشخاص کو صفحۂ دنیا سے مٹا دینا وجود انسانیت پر ان کا احسان ہے۔ اور چونکہ وجود انسانیت کے علاج کے لئے خدا نے ہی ان کو یہ اختیارات دے کر بھیجا ہے تو بنا بریں ان کے دفع کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

پس اسلام تمدن و اجتماع انسانی کی حفاظت اور اس سے برسرپیکار قوتوں یعنی تجاذب و تدافع میں توازن و اعتدال کے قائم کرنے والا فطری دین ہے جس کے تمام قوانین انہی فطری اصول کے ماتحت ہیں۔ لہٰذا اسلام سے بغاوت، فطرت انسانی سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے اور اسلامی اصول و فروع سے اُلجھنا انسانیت

سے دشمنی کرنے کے برابر ہے اور اس بغاوت کو فرو کرنا اور باغیوں کی سرکوبی کرنا انسانیت کا فطری حق ہے۔ جس کا علم بردار خداوند کریم نے انبیاء کو قرار دیا ہے۔

اسی بناء پر ارشاد فرماتا ہے کہ اگر خدا کا دفاع نہ ہوتا بعض مفسدین کو بذریعہ بعض کے تو پوری زمین فساد سے بھر جاتی۔ یعنی پورا نظام درہم برہم ہو جاتا اور آخر میں فرماتا ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی اللہ عالمین پر صاحب فضل ہے۔ ارضی فسادات کے قلع قمع کا دار و مدار دفاع کو قرار دینے کے بعد اس فقرہ کو آخر میں ذکر کرنا اس امر کے لئے ہے کہ دفاع اگرچہ بعض مفسد افراد کے حق میں فائدہ مند تو بجائے خود نقصان دہ ہے۔ لیکن پورے عالمین کے لئے یعنی نظام کلی کے لئے حکم دفاع ضروری ہے اور دفاع کا حکم نظام کلی کے لئے مفید تر بلکہ عالمین کے لئے یہ حکم خدا فضل عمیم اور احسان جسیم ہے۔

پارہ ۳

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ

ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں، جن سے اللہ نے کلام کیا۔

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ

اور بلند کیا ان میں سے بعض کو درجات کے لحاظ سے اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں اور اس کی

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ

تائید کی رُوح القدس کے ذریعے اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ۔ جو ان کے بعد تھے۔

بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ

بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکی تھیں لیکن انہوں نے اختلاف کیا پس بعض ان میں سے ایمان

اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ ۲۵۳

لائے اور بعض کافر ہوئے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لڑائی نہ کرتے۔ لیکن اللہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے

رکوع نمبر ا

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ ۔ کل انبیاء جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے ایک کا انکار کرنے والا ایسا ہی کافر ہے جیسا سب کا انکار کرنے والا۔ لہٰذا یہ فرق کرنا کہ کسی کو نبی ماننا اور کسی کا انکار کرنا کفر ہے لیکن ان انبیاء کے لئے بعض کی بعض پر فضیلت کا اقرار کرنا ایمان ہے۔ کیونکہ انبیاء میں سے حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفٰےؐ اولوالعزم پیغمبر ہیں اور باقی سب غیر اولوالعزم ہیں اور اولوالعزم ان سب سے افضل ہیں اور پھر ان سب سے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو افضلیت حاصل ہے کیونکہ وہ صرف انسانوں پر مبعوث تھے اور محدود قوم و قبیلہ و علاقہ کے نبی تھے اور آنحضرت عالمین (جن و انس) کے رسولؐ ہیں اور اس آیت مجیدہ میں خداوند کریم یہی بیان فرماتا ہے کہ انبیاء و رسل میں سے بعض سے بعض افضل و برتر ہیں

وَمِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ ۔ اس سے بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ کلام خدا میں علم کلام کے ماہرین کافی بحث تمحیص کیا کرتے ہیں مختصر طور پر اس قدر جان لینا کافی ہے کہ انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اور افہام و تفہیم کے لئے

ایک ذریعے کا محتاج ہے اور سوائے کلام کے اس بارے میں اور کوئی مفید اور کارآمد ذریعہ ہو نہیں سکتا۔ لہذا انسان اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کلام کا محتاج ہے اگر انسان میں یہ اجتماعی اور تمدنی زندگی نہ ہوتی تو کلام کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ حیوانات میں سے بھی بعض حیوان دوسرے بعض حیوانات کو اپنے مافی الضمیر سے مطلع کرتے ہیں لیکن حروف سے مرکب الفاظ کے ذریعے سے نہیں بلکہ مہمل سی آوازوں سے یا آنکھوں کے ذریعے سے یا قوتِ شامہ کے واسطے سے اور علیٰ ہذا القیاس اور یہ طریقہ ان کا آپس میں کلام کہا جا سکتا ہے اسی طریقہ سے جنات وملائکہ کا کلام اپنی مخصوص نوعیت سے ہوگا۔

پس موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ کا کلام کرنا ان کی اپنی اپنی جداگانہ نوعیت واستعداد کے اعتبار سے ہے پہلے بعض خطابات میں اس کے قول یا کلام سے مراد امر تکوینی ہے جس طرح زمین یا آسمان یا اسی قسم کی رُوح و ارادہ نہ رکھنے والی مخلوق سے عہد اطاعت طلب کرنا اور ان کو قبول کرنا اور صاحبانِ رُوح وارادہ اور حاملانِ عقل و دانش مثلاً جنات ملائکہ اور انسان وغیرہ سے اس کے کلام کرنے کا مطلب ہے بہر وہ طریقہ جس سے اس کے اوامر ونواہی وجملہ خطابات کا مطلب سمجھا جا سکے۔ پس انسانوں سے اس کا کلام حروف سے مرکب الفاظ کے ذریعہ سے ہوگا چنانچہ ان کے لئے افہام وتفہیم کا سہل طریقہ یہی ہے اور جنات وملائکہ کے ساتھ کلام اس لب ولہجہ یا طرز وطریقہ سے ہوگا جو ان کی تفہیم کے لئے ضروری ہو۔ بہرکیف موجوداتِ عالم کی ہر ہر صنف اور ہر ہر نوع کے ساتھ کلام ہر ایک کی جداگانہ حیثیت کے لحاظ سے اسی کے مخصوص انداز میں مقصد کی تفہیم کا نام ہے۔

پس حضرت موسےٰ علیہ السلام کا کلیم اللہ ہونا باعتبارِ مجاز نہیں بلکہ باعتبارِ حقیقت ہے اور ان کے ساتھ کلام سے مراد وحی یا القاء یا کوئی اور طریقہ نہیں بلکہ کلام حقیقی ہے۔ ورنہ ان کی خصوصیت نہیں رہے گی۔ کیونکہ باقی انبیاء بھی وحی یا القاء یا الہام وغیرہ سے تو نوازے گئے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ خدا کا کلام منہ یا زبان سے صادر ہونے والا کلام ہو کیونکہ یہ صورت مستلزمِ حدوث ہے اور خدا اس صفت سے مبرا اور منزہ ہے بلکہ مراد ہے کلام کا ایجاد کرنا خواہ اس کا جو طریقہ اور جو لب ولہجہ بھی ہو اور اس کے کلام کی کنہ کو جاننا اور اس کی کما حقہٗ کیفیت سے مطلع ہونا انسانی امکان سے باہر ہے۔ نیز کلام۔ خدا کی صفاتِ ذات سے نہیں جس طرح علم قدرت اور حیات وغیرہ بلکہ یہ صفاتِ افعال میں سے ہے جو کہ محدث ہیں اور احادیث آئمہ اسی معنے پر دلالت کرتی ہیں۔

رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔ یہاں بعض سے مراد حضرت محمد مصطفےٰؐ لئے گئے ہیں ان کو تمام وہ معجزات عطا کئے گئے جو گذشتہ نبیوں کو دیئے گئے تھے اور ان کا قرآن مجید کا معجزہ تمام معجزات سے افضل ہے کیونکہ باقی معجزات ظاہر ہونے کے بعد ختم ہو گئے اور قرآن کا معجزہ قیامت تک باقی ہے۔ تفسیر برہان میں کتب امامیہ معتبرہ سے بروایت اصبغ بن نباتہ منقول ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک روایت میں فرمایا کہ خداوند کریم نے انبیاء میں پانچ روحیں خلق فرمائی ہیں (۱) روح القدس (۲) روح الایمان (۳) روح الشہوۃ (۴) روح القوۃ (۵) روح البدن۔

پس روح القدس کے ذریعہ سے ان کو نبوت یا رسالت عطا ہوئی اور اسی کی بدولت ان کو چیزوں کا علم مرحمت ہوا۔
رُوح ایمان کے ذریعہ سے انہوں نے اللہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ تسلیم کیا۔
روح قوّت کے ذریعہ سے وہ دشمنوں سے جہاد کرتے رہے اور اسی سے اپنے معاشیات کا انتظام فرماتے رہے۔
روح شہوت کی وجہ سے انہوں نے بعض اوقات اچھا کھانا بھی کھایا اور جوان عورتوں سے نکاح بھی کیا۔
اور روح بدن کے ذریعے ان کا سلسلہ نشوونمائے دنیاوی انجام پذیر ہوا۔ پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ ۔ یعنی خداوند کریم دین میں کسی کو مجبور نہیں فرماتا ورنہ اگر ایسا کرتا تو پھر دلائل واضحہ کے بعد کوئی کیوں گمراہ ہوتا اور جہاد وقتال تک نوبت کیوں آتی لیکن خداوند کریم کی جانب سے ایمان قبول کرنے اور نہ کرنے میں انسانوں کو مجبور نہیں کیا گیا لہٰذا ہر دور میں انبیاء کے بعد اختلاف ہوتا رہا۔ بعض ایمان لاتے اور اس پر ثابت قدم رہتے اور بعض کافر ہو جاتے تھے اور اس وجہ سے سلسلہ جہاد وقتال قائم رہا۔

برہان میں امالی شیخ سے بروایت اصبغ بن نباتہ منقول ہے کہ ایک شخص حضرت امیر علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ مولا! یہ فرمائیے کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم لڑ رہے ہیں۔ ہمارا ان کا دین ایک۔ رسول ایک۔ نماز ایک اور حج ایک ہے تو ان کے متعلق ہم اعتقاد کیا رکھیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہمارا ان کے متعلق وہی عقیدہ ہے جو خدا نے قرآن میں بیان فرمایا ہے اس نے دوبارہ پوچھا تو آپ نے یہی آیت مجیدہ پڑھی اور فرمایا کہ جب اختلاف واقع ہو گیا تو چونکہ ہم خدا اور رسولِ خدا کے ساتھ اولیٰ ہیں۔ لہٰذا ہم اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے مصداق ہیں اور وہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے مصداق ہیں۔ پس ان لوگوں سے لڑنا مشیت وارادۂ خداوندی سے ہے ایک اور روایت میں ہے کہ اس سائل نے جنگ جمل کے موقعہ پر سوال کیا تھا۔ اصبغ کہتا ہے کہ میں پاس موجود تھا پس جب آپ نے دلیل قرآنی کے ساتھ جواب فرمایا تو اس شخص نے کہا۔ رب کعبہ کی قسم کہ وہ لوگ یقیناً کافر ہیں یہ کہہ کر میدان کارزار میں کود پڑا۔ اور لڑ کر درجہ شہادت پر فائز ہوا۔

سوال :- انبیاء کی بعثت کے بعد جنگ و جدل امتوں میں کیوں باقی رہا۔ حالانکہ اس کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا جس کی وجہیں دو ہیں۔
(۱) خداوند کریم نے انسان کی سعادت دنیوی و اُخروی کے لئے انبیاء بھیجے جن کو واضح معجزات اور آیات بیّنات عطا کی گئیں پس انبیاء کی دعوتِ اسلامیہ کے بعد یقیناً نزاعات کا قلع قمع ہو جانا ضروری تھا۔ خصوصاً اسلام کا دائرہ وسیع ہو جانے کے بعد تو جھگڑا فساد تو برائے نام بھی نہ رہتا۔ کیونکہ اتحاد و اتفاق اسلام کا خصوصی رکن ہے۔
(۲) اسلام کی حقیقت کا دلوں پر چھا جانا کدوراتِ قلبیہ کو ختم کر دیتا ہے لہٰذا استقرار دعوتِ نبوت کے بعد قتل و مقاتلہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی؟

جواب :- آیت مجیدہ میں رسل کی بعثت اور ان کا باہمی تفاضل ظاہر کرنے کے بعد سوال مذکور کے جواب کا بیان ہے کہ چونکہ تمام امور کو خدا نے علل و اسباب کا تابع بنایا ہے اور قتل و مقاتلہ کی علت ہے اختلافات کا وجود۔ پس اگر اختلافات ختم ہو جاتے تو لڑائیاں بھی ختم ہو جاتیں لیکن نہ اختلاف ختم ہوا۔ نہ لڑائی ختم ہوئی ہاں اگر خدا چاہتا تو سرے سے امور کو اسباب کا تابع نہ بناتا۔ یا اسباب کو غیر مؤثر قرار دیتا۔ پس قتل و قتال وغیرہ کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اس میں جبر لازم آتا اور خدا کی مشیت کے وہ منافی ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِمَّا رَزَقْنَٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِىَ

اے ایمان والو۔ خرچ کرو ہمارے دیئے ہوئے رزق سے۔ پہلے اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں سودا

يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَٰعَةٌ ۗ وَٱلْكَٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿۲۵۴﴾

نہ ہوگا نہ دوستی (بجز ایمان کے) اور نہ شفاعت (بغیر مومن کے) اور کافر ہی ظالم ہیں

ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلْحَىُّ ٱلْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُۥ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَّهُۥ

اللہ کہ اس کے بغیر کوئی بھی مستحق عبادت نہیں ہے جو حیّ وقیوم ہے نہ اس پر غلبہ کرتی ہے اونگھ اور نہ نیند اسی کا

مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۗ مَن ذَا ٱلَّذِى يَشْفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذْنِهِۦ ۚ

ہی ہے تمام وہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کون (جرأت کرسکتا) ہے کہ سفارش کرے (کسی کی) اس کے سامنے

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهِۦٓ

بجز اس کے اذن کے وہ جانتا ہے وہ واقعات جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جو ان کے بعد آئیں گے اور وہ نہیں احاطہ کرسکتے کسی

إِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ ۖ وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفْظُهُمَا ۚ

چیز کا اس کے علم میں سے مگر جس کو وہ چاہے۔ وسیع ہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمینوں سے اور نہیں دشوار اس پر ان دونوں کی حفاظت اور وہ تمام

رکوع نمبر ۲

تفسیر آیۃ الکرسی

وَلَا شَفَاعَةٌ ۔اس مقام پر شفاعت کی ظاہراً نفی کی گئی ہے اور چونکہ شفاعت کا ہونا احادیث میں تواتر سے ثابت ہے بلکہ قرآن میں بھی دوسرے مقام پر شفاعت ثابت ہے چنانچہ آیت الکرسی میں اِلَّا بِاِذْنِہٖ کا کلمہ شاہد ہے کہ جن کو اذن ہوگا وہ شفاعت کریں گے اور اس سے مراد انبیاء و آئمہ ہیں جو گنہگاران امت کی شفاعت کریں گے بلکہ یہ بھی منقول ہے کہ بعض نیک مومن بھی کسی حد تک شفاعت کرسکیں گے لہذا اس مقام پر شفاعت کی نفی غیر مومن کے لئے ہے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت مجمع البیان میں کتب عامہ سے مروی ہے کہ عبداللہ ابن عمر کہتا ہے کہ جناب رسولِ خدا نے فرمایا۔ جو شخص ہر فریضہ نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا تو بوقت موت اس کی قبض روح خود خداوند عالم

اپنے ید قدرت سے فرمائے گا اور اس کا ثواب انبیاء کے ہمراہ جہاد کر کے شہید ہونیوالوں کے برابر ہوگا اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضورؐ نے بر سر منبر ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر نماز فریضہ کے بعد آیۃ الکرسی پڑھتا رہے تو اس کے اور جنّت کے درمیان صرف موت ہی کا فرق رہ جاتا ہے اور اس کو ہمیشہ نہیں پڑھتے مگر صدیق یا عابد۔ اور جو شخص اس کو سونے سے پہلے تلاوت کرے تو خدا اس کو بمعہ ہمسایوں کے امن میں رکھے گا۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمام کلاموں کا سردار قرآن ہے اور تمام قرآن میں سورۂ بقرہ سردار ہے اور تمام سورۂ بقرہ میں آیۃ الکرسی سردار ہے فرمایا۔ اے علیؑ اس میں پچاس لفظ ہیں اور ہر لفظ میں پچاس برکتیں ہیں۔

اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ آیۃ الکرسی کو پڑھے تو خداوند عالم اس سے دنیا و آخرت کی ایک ایک ہزار سختیاں دُور فرماتا ہے کم از کم سختی دنیا کی فقر اور کم از کم سختی آخرت کی عذاب قبر ہے۔ اور ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن مجید کی چوٹی آیۃ الکرسی ہے۔ مومنوں کے قبرستان میں آیۃ الکرسی پڑھ کر ثواب ان کو بخشنا بہت باعثِ ثواب ہے۔

خواص:۔ (۱) ہر نماز فریضہ کے بعد پڑھنا رزق کی زیادتی کا موجب ہے۔

(۲) صبح و شام پڑھنا۔ چور۔ ڈاکو۔ آتش زنی وغیرہ سے حفاظت کا موجب ہے۔

(۳) روزمرہ ہر فریضہ نماز کے بعد پڑھنا سانپ و بچھو کا تعویذ ہے بلکہ جن و انس اس کو ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔

(۴) اگر اس کو لکھ کر کھیت میں دفن کیا جائے تو کھیت چوری اور نقصان کی آفت سے محفوظ رہے گا اور باعث برکت ہے۔

(۵) اگر لکھ کر دکان میں رکھی جائے تو بہت باعثِ برکت ہے۔

(۶) گھر میں لکھ کر رکھنا چوری سے امان کا باعث ہے اگر مرنے سے پہلے پڑھ لے تو بہشت میں اپنی جگہ دیکھے گا۔

(از عمدۃ البیان)

(۷) سوتے وقت ہر روز آیۃ الکرسی کا پڑھنا فالج سے حفاظت کا باعث ہے۔ (برہان) فرمان صادق علیہ السلام لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ منقول ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسٰی علیہ السلام سے سوال کیا۔ کہ تیرا خدا جاگتا ہے یا سوتا ہے تو حضرت موسٰی نے اپنی مناجات میں بارگاہِ خدا میں عرض پیش۔ پس ارشاد ہُوا کہ تو ایک شب و روز خواب نہ کر۔ اس کے بعد ایک فرشتہ دو شیشیاں لے کر نازل ہُوا۔ اور اللہ تعالےٰ کا حکم سنایا کہ ان دونوں کو ہاتھوں میں رکھ اور ان کی حفاظت کر اور نیند نہ کرنا، لیکن چونکہ ان پر پورے شب و روز کی بیداری کی وجہ سے نیند کا غلبہ تھا۔ ہر چند انہوں نے نیند کے دفع کرنے کی کوشش کی لیکن آخرکار نیند غالب آئی اور ہاتھ پر ہاتھ جو لگا تو دونوں شیشیاں چور ہوگئیں۔ پس جبریل نازل ہُوا۔ اور کہا کہ خدا فرماتا ہے۔ اے موسٰیؑ! تو خواب میں دو شیشیوں کو محفوظ نہیں کر سکا۔ اگر میں سو جاؤں تو زمین و آسمان کا نظام کون محفوظ کرے گا۔ (عمدۃ البیان) اور یہودیوں نے یہی سوال جناب رسولِ خداؐ سے بھی کیا۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ

(صفات نقص سے) بلند (کبریائی میں) صاحب عظمت ہے نہیں زبردستی دین میں تحقیق ظاہر ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے ۔ پس

مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

جو کفر کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو گویا اس نے

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾

پکڑا دستاویز محکم کو جو کبھی نہ ٹوٹے گا ۔ اور خدا سننے جاننے والا ہے

تو آیۃ الکرسی نازل ہوئی۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا جنت والے سوئیں گے تو فرمایا کہ نیند موت کی بہن ہے ۔ وہاں نہ جنتی سوئیں گے اور نہ دوزخی سوئیں گے ۔ (البرہان) ج ۱ صہ ۲۳۲

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ ۔ صادقین علیہم السلام سے مروی ہے کہ کرسی سے مراد اس مقام پر علم ہے یعنی خدا کا علم آسمان اور زمین پر حاوی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد عرش ہے اور بعض نے قدرت ملک اور سلطنت اس سے مراد لی ہے ۔ نیز منقول ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی حیثیت کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جس طرح ایک انگوٹھی ایک وسیع جنگل میں اور کرسی کی نسبت عرش سے بھی ایسی ہے جس طرح ایک انگوٹھی یا چھلا ایک وسیع جنگل میں پڑا ہو۔

علم ہیئت والوں کے نزدیک کرسی سات آسمانوں کے اوپر محیط ہے اور وہ اس کو فلک البروج کہتے ہیں اور ان کے نزدیک تمام ستارے اور بروج وغیرہ اسی میں ہیں

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۔ روایت میں ہے کہ خداوند کریم نے اپنے ننانوے ناموں میں سب سے پہلے اپنی ذاتِ مقدس کے لئے اَلْعَلِيُّ الْعَظِيمُ کو منتخب فرمایا۔

لَا إِكْرَاهَ ۔ اس کے شانِ نزول کے متعلق بعضوں نے کہا ہے کہ ایک انصاری ایک حبشی غلام صبیح نامی کو اسلام لانے پر مجبور کرتا تھا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ شام سے کچھ تاجر وارد مدینہ ہوئے انہوں نے حصین انصاری کے دو بیٹوں کو نصرانیت کی دعوت دی پس وہ دونوں نصرانی ہو گئے اور ان کے ہمراہ شام چلے گئے اس پر حصین نے جناب رسولِ خدا کو خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض لوگ اس کو آیت جہاد سے منسوخ جانتے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ حکم صرف ذمی کافروں کے لئے مخصوص ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اعمالِ شرعیہ کی بجا آوری میں انسان مختار کل ہے اور اس پر اللہ کی طرف سے

کوئی جبر نہیں کیونکہ نیکی و بدی ہر دو کا رستہ بتایا جا چکا ہے اب انسان کی اپنی مرضی نیکی کی طرف آئے یا برائی کی طرف جائے گویا یہ آیت اس عقیدہ کو چیلنج کر رہی ہے کہ نیکی و بدی سب اللہ ہی کرواتا ہے اور انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ حَاشَا وَکَلَّا ہم تفسیر کی جلد ۲ میں پہلے رکوع کے تحت میں مسئلہ جبر کو بیان کر چکے ہیں۔

عِلمی نُکتہ

چونکہ دین کی اصل معرفت و اعتقادات ہے اور اعمال و عبادات مالیہ و بدنیہ اس کی فروعات ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اعتقاد کیفیت قلبیہ ہے جس میں جبر و اکراہ مؤثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے علیحدہ علل و اسباب ہیں جو اس کے حصول کا پیش خیمہ ہُوا کرتے ہیں۔ پس لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا جملہ ترکیب نحوی کے لحاظ سے یا تو جملہ خبریہ ہے تو مقصد یہ ہے کہ دین ایک ایسی چیز ہے جس میں جبر و اکراہ قطعاً داخل نہیں ہُوا کرتا۔ اور یہ اُن لوگوں کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے زور سے پھیلا ہے اور اگر یہ جملہ انشائیہ قرار دیا جائے تو دین کے قبول کرانے کے لئے جبر و تشدد کو منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ جبر اعمالِ ظاہریہ و افعالِ بدنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قلبی میلان اور اعتقادی رجحان میں اس کا کوئی اثر نہیں ہُوا کرتا۔ لہذا جبر کا استعمال بے ہودہ اور بے معنی ہے۔

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ۔ یہ نفی اکراہ کی تعلیل ہے کہ کوئی حاکم کسی امر ضروری میں تشدد و جبر کو اس وقت استعمال کرتا ہے۔ جب ماتحت میں فعل ماموربہ کی خوبی و بدی کے سمجھنے کی اہلیت نہ ہو۔ جس کی وجہ سے وہ فعل مامور کی مصالح سے مطلع نہ ہو سکے یا ماتحت میں سمجھنے کی اہلیت ہو لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس کو سمجھانا خلاف مقصود ہو تو ان حالات میں امور ضروریہ کی بجا آوری میں تشدد سے کام لیا جاتا ہے اور مامورین کے لئے سوائے تقلیدی رویہ کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ لیکن دین اسلام کی اچھائی اور اس کے رد کرنے کی برائی کو سمجھنے کے لئے نہ انسانوں میں فہمی معذوری ہے کیونکہ اس کے اصول فطری اور مطابق عقل ہیں اور نہ حاکم مطلق نے ان کے سمجھانے میں کوئی کمی کی ہے بلکہ وحی اور نبوت کے ذریعے سے ہدایت اور گمراہی کے ہر دو طریق پوری طرح واضح کر دیئے گئے ہیں۔ پس اس وضاحت کے بعد جبر و اکراہ کا سوال باقی ہی نہیں رہتا۔ بلکہ صاحبِ عقل و فہم انسان نفع و نقصان کے سمجھنے کے بعد اپنے اختیار و ترک میں مختار ہے لہذا اس میں جبر کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

نیز اس بیان سے یہ امر بھی پوری طرح واضح ہو گیا کہ دین اسلام زورِ تلوار سے ہرگز نہیں پھیلا۔ بلکہ اس کے مشن کی صداقت اور اس کے اصول کی مبنی بر حقیقت جاذبیت نے چہار وانگ عالم میں اس کی مقبولیت کا ڈنکا بجایا اور اس کی فطری و طبعی ناقابل تردید براہین نے فضائے عالم میں اس کا جھنڈا لہرایا ہے۔ پس روز روشن کی طرح اس امر کی بھی وضاحت ہو گئی کہ یہ آیت تاقیام قیامت منسوخ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کسی حکم کی منسوخی اسوقت ہو سکتی ہے جبکہ پہلے اس کی علت کو منسوخ کیا جائے اور

یہاں عدم اکراہ کی علت ہے ہدایت وگمراہی کے رستوں کی وضاحت اور یہ علت تاقیامت قابل نسخ نہیں - لہذا اس کا معلول حکم یعنی جبر وتشدد کے استعمال کی منع بھی ہرگز نسخ پذیر نہیں ہو سکتا - پس جن لوگوں نے اس حکم کو جہاد والی آیات سے منسوخ قرار دیا ہے یہ ان کا اشتباہ ہے اور اسلام کی جملہ لڑائیاں دین اسلام کی نشر واشاعت کی خاطر نہیں تھیں - بلکہ جو لوگ انسانیت کے اس فطری حق پر پردہ ڈالنے اور شمع توحید کو بجھانے کے درپے تھے - اسلام کی لڑائیاں بحکم جہاد - اس نفیس ترین متاع فطرت یعنی کلمۂ توحید کی حفاظت کے لئے صرف دفاعی حیثیت سے تھیں - نہ ان میں توسیع دائرہ اسلام کی ہوس کارفرما تھی اور نہ ملک گیری کا جذبہ موجب تحریک تھا - کیونکہ ملک گیری کا جذبہ تبلیغ اسلام سے بالکل منافات رکھتا ہے اور جبر و تشدد اور فاتحانہ انداز دائرہ اسلام کی توسیع میں فائدہ بخش نہیں کیونکہ اصل دین ہے معرفت اور وہ اکراہ سے حاصل کی نہیں جا سکتی

اَلطَّاغُوْتِ سے مراد شیطان یا سرکش خواہ جن ہو یا انسان، یا کاہن یا جادوگر، یا بُت ہے (باقوال مفسرین)

بروایت ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ قائم آل محمد علیہ السلام سے پہلے جو جھنڈا بلند ہو پس سمجھ لو کہ اس کا اٹھانے والا طاغوت ہے - تفسیر قمی سے نقل کیا گیا ہے کہ طاغوت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے آل محمدؐ کے حقوق کو غصب کیا -

اَلْعُرْوَۃُ الْوُثْقٰی - تفسیر برہان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ جو شخص اَلْعُرْوَۃُ الْوُثْقٰی سے تمسک پکڑنا چاہے جو کبھی نہ ٹوٹے گا تو اس کو چاہیئے کہ میرے بھائی اور وصی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت سے تمسک پکڑے کیونکہ اس کا محب و موالی ہلاک نہ ہوگا اور اس کا منکر و دشمن نجات نہ پائے گا -

(۲) حذیفہ بن اُسید سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا - اے حذیفہ! میرے بعد تم پر اللہ کی حجت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے - اس کا کفر اللہ کا کفر، اس کا شرک اللہ کا شرک - اس میں شک اللہ میں شک - اس سے کنارہ اللہ سے کنارہ، اس کا انکار، اللہ کا انکار اور اس پر ایمان اللہ پر ایمان ہے - کیونکہ وہ رسول اللہ کا بھائی، ان کا وصی - ان کی امت کا امام ہے اور وہ اللہ کی مضبوط رسی اور اَلْعُرْوَۃُ الْوُثْقٰی ہے جو ٹوٹنے والا نہیں - اور اس (علیؑ) کے متعلق دو قسم کے انسان ہلاک ہوں گے - ایک غالی جو ان کو اپنی حد سے بڑھا کر خدا یا خدا کی صفات میں شریک کہیں گے) دوسرے مقصر (جو اس کو اپنے حقوق سے پیچھے ہٹا کر دوسروں کو اس کی جگہ دیں گے) - اے حذیفہ - علیؑ سے جدا نہ ہونا، ورنہ تو مجھ سے جدا ہو جائے گا - اور علی کی مخالفت نہ کرنا، ورنہ تو میرا مخالف ہوگا - کیونکہ علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں - جس نے اس کو ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے اس کو راضی کیا اُس نے مجھے راضی کیا -

(۳) اسناد سابق سے جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا - حسین کی اولاد سے ہونے والے امام - جس نے اُن کی اطاعت کی - اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے ان کی نافرمانی کی - اس نے اللہ کی نافرمانی کی - یہی عروۂ وثقیٰ ہیں اور یہی اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں -

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ ۙ وَ

اللہ ولی ہے ایمان والوں کا کہ ان کو نکالتا ہے (کفر) کی تاریکیوں میں سے طرف نور (ہدایت) کے اور

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ

وہ لوگ جو کافر ہیں ان کے اولیاء شیطان ہیں۔ کہ ان کو نکالتے ہیں نور (ہدایت) سے طرف

اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

(کفر کی) تاریکیوں کے۔ ایسے لوگ جہنم میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

(۴) نیز جناب رسولؐ خدا سے منقول ہے کہ جو شخص عروۂ وثقیٰ (دستاویز محکم) سے تمسک پکڑنا چاہے۔ پس وہ علی اور اس کی اہلبیت کی محبت کو اختیار کرے۔

(۵) جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے ایک اپنے لمبے خط میں ارشاد فرمایا۔ کہ رسولِ خدا اپنی امت میں ایک کتاب خدا اور دوسرے اپنا وصی علی بن ابی طالب چھوڑ گئے۔ جو امیر المومنین امام المتین حبل اللہ المتین العروۃ الوثقیٰ اور عہد مؤکد ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مصداق ہے۔

(۶) بطریق مخالفین۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے منقول ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے حضرت علیؑ کو فرمایا۔ اَنْتَ الْعُرْوَۃُ الْوُثْقٰی (تو خدا کی محکم دستاویز ہے)

(۷) امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ میرے بعد تاریک فتنہ ہوگا۔ نجات وہی پائے گا جو عروہ وثقیٰ سے تمسک پکڑے گا۔ جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ تو فرمایا۔ کہ سید الوصیین کی ولایت پھر پوچھا گیا کہ سید الوصیین کون ہے؟ تو فرمایا۔ امیر المومنین۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ کون ہوگا؟ تو فرمایا کہ جو مسلمانوں کا حاکم اور میرے بعد امام ہوگا پھر سوال ہوا کہ آپ کے بعد امام اور مسلمانوں کا حاکم کون ہوگا تو آپ نے فرمایا۔ کہ وہ میرا بھائی علیؑ بن ابی طالب ہے

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ تفسیر برہان میں کافی اور دیگر کتب امامیہ سے بروایت عبداللہ بن ابی یعفور منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ میں لوگوں سے ملتا جلتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو آپ سے تولا نہیں رکھتے اور فلاں فلاں سے دوستی رکھتے ہیں۔ ان میں امانت سچائی اور وفا پائی جاتی ہے اور ایک قوم جو آپ سے تولا رکھتی ہے، ان میں وہ امانت، وفا اور سچائی نہیں پائی جاتی۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی امام علیہ السلام) سیدھے ہو بیٹھے اور غصے میں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا جو شخص ظالم امام کی ولایت کا قائل ہو،

جو خدا کی طرف سے نہیں اس کا کوئی دین نہیں اور جو شخص امام عادل منصوص من اللہ کی ولایت کا قائل ہو اس پر کوئی عتاب نہیں۔ میں نے عرض کی ؟ کہ ان کا کوئی دین نہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں ؟ تو فرمایا۔ ہاں ! اُن کا کوئی دین نہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تو نے خدا کا یہ فرمان نہیں سُنا۔ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان کو گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر توبہ اور بخشش کی نورانیت کی طرف منتقل کر دیتا ہے کیونکہ وہ امام عادل سے تولا رکھتے ہیں جو کہ منصوص من اللہ تھا اور خدا فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ نور اسلام میں تھے۔ جب انہوں نے امام ظالم کو امام مان لیا جو اللہ کی طرف سے نہ تھا کہ وہ ان کی ولایت کی وجہ سے نور اسلام سے نکل کر کفر کی تاریکی میں چلے گئے۔ پس خدا نے کفار کے ساتھ ان کے لئے جہنم واجب کر دیا۔ پس وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

ابن ابی یعفور کہتا ہے کہ میں نے عرض کی کیا۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے عام کافر مراد نہیں ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا کہ کافروں کے پاس پہلے نور ہی کون سا تھا جس سے وہ نکالے گئے ؟ بلکہ اس سے وہی معنی مراد ہے جو میں نے بیان کیا۔

بروایت ابن شہر آشوب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آیت مجیدہ میں نور سے مراد ولایتِ علی ابن ابی طالب ہے اور ظلمات سے مراد دشمنانِ علی کی ولایت ہے اور طاغوت سے مراد علی بن ابی طالب کی ولایت کے منکرین اور ان کے دوست ہیں۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے دشمن ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ خواہ اپنے نزدیک انتہائی متقی، زاہد اور عبادت گذار ہی کیوں نہ ہوں۔

اقول:۔ اس مطلب کو استدلالی رنگ میں ہم نے کتاب ہذا کی جلد اوّل یعنی مقدمہ تفسیر میں مفصّل بیان کیا ہے عدل، احباط۔ شفاعت اور ولایت آلِ محمد اور ضرورتِ امام کے عنادین ملاحظہ فرمائیں۔ نیز اسی جلد میں اسی پارہ کے رکوع ۱۰ کی تفسیر کے ذیل میں اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کے تحت بھی کسی قدر بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ:۔ یہ دو آیتیں ویسے آیۃ الکرسی سے الگ ہیں لیکن بعض نمازیں جن میں آیۃ الکرسی پڑھی جاتی ہے مثلاً نماز وحشت یا نماز غدیر وغیرہ تو وہاں آیۃ الکرسی سے مراد یہ تینوں آیتیں ہوا کرتی ہیں۔ یعنی ان نمازوں میں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ تک پڑھنا چاہیئے جس طرح کہ کتب فقہیہ میں مذکور ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

کیا تم نے نہیں دیکھا وہ شخص جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کے متعلق اس لئے کہ دیا اس کو خدا نے ملک

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ

جب فرمایا ابراہیمؑ نے کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ تو کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔

فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ

تو فرمایا ابراہیم نے کہ تحقیق اللہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے پس تو لا کر دکھا مغرب کی طرف سے۔ تو لاجواب

الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

ہوگیا کافر۔ اور خدا نہیں ہدایت فرماتا۔ اس قوم کو جو ظالم ہو

رکوع نمبر ۳

نمرود کا حضرت ابراہیمؑ سے مناظرہ

اَلَمْ تَرَ۔ یہ قصہ حضرت رسالتمآبؐ کی تسلی و اطمینان کیلئے ہے کہ ہمیشہ سے دشمنانِ خدا نبیوں کو ستاتے رہے اور نبی حوصلہ کرتے رہے ہیں۔ اِلَی الَّذِیْ۔ حضرت ابراہیمؑ سے جھگڑا کرنے والے کا نام نمرود بن کنعان تھا اور کہتے ہیں کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے خدائی دعوےٰ کیا۔ اور تفسیر برہان میں ابوبصیر سے منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت یوسف بادشاہ کے پاس آیا تو بادشاہ نے ان کو ابراہیمؑ سمجھ کر اُن سے مزاج پُرسی کی۔ حضرت یوسف نے فرمایا کہ میں ابراہیمؑ نہیں ہوں بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسحٰق کا پوتا ہوں۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے ابراہیمؑ سے مناظرہ کیا تھا؟ اس کی عمر چار سو برس تھی اور جوان تھا؟

مناظرہ کا موضوع۔ توحید تھا اور یہ مناظرہ حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کے بعد اور آگ میں ڈالے جانے سے پہلے واقع ہوا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے بعد تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرے سے خدا کے وجود کا منکر نہیں تھا بلکہ لوگوں کو دھوکا دینے کیلئے اس فعل شنیع کا مرتکب تھا جس طرح کہ فرعونِ مصر پس اس کا خدائی دعویٰ صرف دنیاوی گھمنڈ پر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دلیل پیش فرمائی کہ میرا خدا مارتا اور جلاتا ہے تو اس نے جواب میں کہہ دیا کہ ایسا تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کیسے؟ اس نے کہا کہ دو واجب القتل قیدیوں کو حاضر کرکے ایک کو رہا کردوں گا اور دوسرے کو قتل کردوں گا۔ چنانچہ اس نے ایسا کر بھی دیا آپ نے فرمایا اگر تو جلا سکتا ہے تو قتل کرنے کے بعد اسی کو زندہ کر دکھا۔

اس میں اگرچہ وہ لاجواب تھا۔ لیکن عوام الناس ان باریکیوں کو نہ سمجھتے تھے۔ پس فوراً آپ نے پہلی بات کی تائید میں سورج کے ابھارنے کو دلیل پیش فرمادیا۔ اب نمرود نے سمجھا کہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ مشرق سے میں لایا کرتا ہوں تیرا خدا مغرب سے لائے تو اس کو یقین تھا کہ ابراہیمؑ ایسا کرلے گا اور میں زیادہ شرمسار ہوں گا۔ لہذا خاموشی کو غنیمت سمجھا۔ کیونکہ دل سے تو وہ خدا کی قدرت کا معترف تھا اور اپنے آپ کو عاجز جانتا تھا۔

تنبیہ:۔ مردوں کو زندہ کرنا۔ یا دورِ شمس کو بدل دینا صرف اللہ ہی کا کام ہے۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے ان فعلوں کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ اللہ کے وجود کی دلیل قرار دیا ہے۔ پس اگر کسی کامل انسان (خواہ نبی ہو یا امام) سے اس قسم کے افعال ظہور پذیر ہوں تو یہ ان کے خدا ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ اُن کے خدا دوست ہونے کی علامت ہے کہ خدا نے ان کی صداقت منوانے کے لئے ان کی دُعا کو قبول کر کے نظامِ ظاہری کو بدل دیا۔ کیونکہ اس مقام پر اگر نمرود ضد کرتا تو حضرت ابراہیمؑ کے لئے خداوند کریم نظامِ شمسی کو تبدیل فرما کر ان کی صداقت کو تسلیم کرواتا۔ لیکن نمرود کی ہار نے اس حد تک نوبت کو آنے ہی نہ دیا۔ پس کسی انسان کامل کی دعا سے نظامِ شمسی کی تبدیلی اس کی خدائی کی دلیل نہیں اور اسی طرح باذنِ خدا مردوں کو زندہ کرلینا بھی خدائی کی دلیل نہیں۔ بلکہ خدا وہ ہے جو اپنے مخصوص بندوں کی شان دکھانے کے لئے ان کی دعاؤں کو یہ اثر بخش دیتا ہے کہ ان سے اس قسم کے خارق عادت افعال ظہور پذیر ہوں۔

پس حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے لئے ردِ شمس یا مردوں کا زندہ ہونا۔ ان کی بارگاہ ربّ العزت میں عظیم المنزلت ہونے کی دلیل ہے کہ ان کی دعاؤں کو مستجاب فرما کر خدا نے ان کی شان وعظمت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا ہے۔ بعض جہلاء مقررین اس مقام پر عوام کو دھوکا میں ڈالتے ہوئے یہ کہہ جاتے ہیں کہ دیکھو ابراہیمؑ نے ردِ شمس کو توحید کی دلیل قرار دیا اور حضرت علی نے ردِ شمس کر دکھایا۔ پس حضرت ابراہیمؑ کے بیان کردہ قاعدہ کی رُو سے یہ خدا ٹھہرے اور بعض جہلا سے مجھے شاید خود سننے کا اتفاق ہوا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور قرآن نے بھی ملتِ ابراہیمی پہ چلنے کا درس دیا ہے اور ابراہیمؑ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو مغرب سے سُورج کو لاکر دکھائے وہ خدا ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ملتِ ابراہیمی کی رُو سے علیؑ خدا ہے۔ معاذ اللہ۔

ایمان والوں کو خداوند کریم اس قسم کے فاسد عقائد سے محفوظ رکھے۔ بیان کرنے والے صرف نعرہ لگوانے اور اپنی خطابت کا سکّہ بٹھانے کے لئے یہ سب جتن کرتے ہیں۔ جس سے عوام کا اعتقاد اور اپنی عاقبت تباہ کرتے ہیں۔ ردِ شمس کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ جناب امیرالمومنین کے زانو پر جناب رسالتمآبؐ کا سر تھا۔ بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا لہذا اشارے سے نماز پڑھ لی۔ حضورؐ کی آنکھ کھُلی تو دریافت فرمایا کہ نماز کا کیا ہُوا۔ آپ نے جواب میں عرض کی۔ کہ حضورؐ! اشارے سے پڑھ لی ہے۔ حضرت رسالتمآبؐ نے دعا مانگی۔ اے میرے اللہ اگر تیرا بندہ علیؑ تیری اور تیرے رسولؐ کی اطاعت میں تھا۔ تو تُو اس کے لئے شمس کو واپس پھیر دے۔ پس ابھی جناب رسالتمآبؐ کی دعا ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ سُورج واپس آیا اور حضرت علیؑ نے نماز

ادا کی۔ بہر کیف سورج کا واپس پلٹانا خدا کا فعل ہے اور وہ اپنے خاص بندوں کی دعا کو قبول کر کے ان کے لئے ان چیزوں کو معرضِ ظہور میں لاتا ہے اگر حضرت ابراہیمؑ کو ضرورت پڑتی اور دعا کرتے تو ان کے لئے بھی سورج مغرب سے طلوع کرتا جس طرح کہ حضرت علیؑ کے لئے بوقتِ ضرورت جناب رسالتمآبؐ کی دعا سے سورج مغرب کی طرف سے پلٹ آیا۔ پس خدا وہ بالا و برتر ذات ہے جو اپنے مخصوص بندوں کی دعاؤں کو اتنا زبردست اثر عطا فرما دیتا ہے کہ ان کے طفیل نظامِ عالم میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور بلاشک خدا ایسا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کرنے پر قادر ہے۔ نیز ردِ شمس کی روایات متعدد ہیں اور الفاظ مختلفہ وارد ہیں اور سب کا مآل یہ ہے کہ خدا نے ردِ شمس کے بارے میں دعا کو مستجاب فرمایا اور سورج واپس پلٹا۔

پس جو شخص انبیاء یا آئمہ کو اس قسم کے معجزات یا خارق عادات چیزیں دیکھ کر خدا مانیں یا خدا کا شریک مانیں وہ کافر اور مشرک ہیں۔ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام اس قسم کے لوگوں سے بیزار ہیں۔ خداوند کریم تمام مومنین کو اس قسم کے بے ہودہ اور بے بنیاد عقائد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

نیز اگر یہی بات درست ہو کہ جس کے لئے سورج واپس پلٹ آئے پس اس کو خدا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر نمرود حضرت ابراہیمؑ کے سامنے بضد ہو جاتا اور حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا مانگ کر سورج کو پلٹا دیتے (اور یقیناً ایسا ہی ہوتا کیونکہ وہ سچے اور برحق اولوالعزم پیغمبر تھے اور ان کی دعا مستجاب تھی) تو ایسی صورت میں عوام الناس نمرود کو خدائی دعوے میں جھوٹا قرار دے کر حضرت ابراہیمؑ کو خدا تسلیم کر لینے میں حق بجانب ہوتے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اگر ایسا ہوتا۔ تو جس طرح وہ لوگ نمرود کو خدا کہہ کر مشرک تھے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو خدا مان کر بھی مشرک ہی رہتے۔ خدا وہ ہے جس نے ابراہیمؑ کو ابراہیمؑ بنایا، محمدؐ کو محمدؐ بنایا، اور علیؑ کو علیؑ بنایا۔ یہ سب اس کے عبد ہیں اور وہ ان سب کا معبود ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ چار آدمی پورے روئے زمین کے بادشاہ گذرے ہیں۔ دو مسلمان اور دو کافر۔ حضرت سلیمان بن داؤد اور حضرت ذوالقرنین یہ دونوں مسلمان اور نمرود اور بخت نصر یہ دونوں کافر تھے (غالباً ان کے پوری زمین پر بادشاہ ہونے کا مقصد یہ ہوگا کہ ان کے زمانہ میں ان کا اقتدار پورے روئے زمین پر مسلم تھا اور باقی کسی خطۂ زمین کا کوئی حکمران ان کے آگے سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا)۔ مجمع البیان میں ابن عباس سے مروی ہے کہ مچھر نمرود کے منہ پر بیٹھا اور اس کو کاٹا۔ نمرود نے اس کو پکڑنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو وہ اڑ کر اس کے ناک کے سوراخ میں چلا گیا پس یہ جونہی اس کے نکالنے کی کوشش کرتا رہا وہ آگے گھستا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے دماغ تک جا پہنچا۔ پس خداوند کریم نے اس کو چالیس شب و روز اسی عذاب میں گرفتار رکھا۔ اور پھر اس کو ہلاک کر دیا۔

یہ سب ذاتِ مقدسہ الٰہیہ کی مصلحتیں ہیں اگر نہ چاہا تو چار سو سال تک اپنے دشمن کو مسندِ الوہیت پر قبضہ جمائے ہوئے رہنے دیا اور اُسے ذرہ بھر بھی عذابِ زندگی کا مزہ نہ چکھایا۔ لیکن جب چاہا تو کسی کی سطوت کو مٹانے کے لئے مچھر کو مسلط کر دیا اور کسی کی الوہیت مفروضہ کو دریاؤں کی لہروں کی نذر کر دیا۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى

یا مثل اس کے جو گذرا ایک بستی سے اور وہ اپنی چھتوں پہ گری ہوئی تھی (دل میں) کہا کیسے زندہ کرے گا

يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ

ان کو خدا موت کے بعد پس خدا نے اس کو مار دیا ایک سو برس پھر اس کو اٹھایا۔ فرمایا

كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ

کہ تو کس قدر سویا ہے۔ عرض کی کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سویا ہوں فرمایا بلکہ تو تو ایک سال

مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

سو چکا ہے پس دیکھ اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف کہ وہ متغیر نہیں ہوئیں اور دیکھ

اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ

اپنے گدھے کی طرف۔ اور تاکہ تجھے لوگوں کے لئے ہم نشانی بنائیں اور دیکھ طرف ان کی ہڈیوں کے کہ کس طرح ہم

نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۖ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ

ان کو جوڑتے ہیں پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں پس جب بات واضح ہو گئی تو کہنے لگے میں جانتا ہوں۔ تحقیق

موت کے بعد زندگی

اَوْ كَالَّذِيْ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے بھی ایسا ہی منقول ہے لیکن امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ حضرت ارمیاء علیہ السلام تھے پس ان ہر دو روایتوں کی توجیہہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ شاید یہ ایک ہی شخص ہو اور اسی کے دو نام ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دو شخص ہوں اور ہر دو کو اس قسم کا واقعہ پیش آیا ہو۔

عَلٰى قَرْيَةٍ۔ وہ بستی جس کی چھتیں گری ہوئی تھیں وہ بیت المقدس کا شہر تھا جس کو بخت نصر نے خراب کیا تھا۔

قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ۔ حضرت عزیرؑ یا ارمیاؑ کا یہ کہنا کہ خدا ان کو کیسے زندہ کرے گا یہ بطور تعجب یا انکار کے نہیں تھا کیونکہ نبی کو ان چیزوں پر شک نہیں ہوا کرتا اور ان کا ایمان کامل ہوا کرتا ہے نبی تو نبی بلکہ اگر کوئی عام مومن بھی خدا کے زندہ کرنے پر شک یا انکار کرے تو صفِ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ پس ان کا یہ کہنا صرف اس لئے تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ خداوند کریم ان

کو دوبارہ زندہ کرے۔ گویا انہوں نے اپنی درخواست کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

بخت نصر کا قصّہ

تفصیل اس قصہ کی جو کتب تفاسیر میں مذکور ہے وہ اس طرح ہے کہ جب بنی اسرائیل نے برائیوں کو اپنا شیوہ بنا لیا اور اللہ کے حکم سے بالکل سرکش ہو گئے تو حضرت ارمیاء پیغمبر کو وحی ہوئی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں بنی اسرائیل پر بوجہ ان کی بدکاریوں کے ایک بدترین انسان کو مسلّط کر دوں گا۔ جو بدطینت اور حرام خور ہو گا۔ وہ ان کو قتل کرے گا۔ ان کی عورتوں کو قید کرے گا اور ان کے شہروں کو خراب کرے گا۔

حضرت ارمیاء نے بنی اسرائیل کے علماء سے اس کا بیان کیا تو انہوں نے عرض کی کہ قصور تو امراء طبقہ کا ہے۔ غریب طبقہ اور کمزور لوگ اس عذاب میں کیوں گرفتار ہوں گے۔ حضرت ارمیاء بارگاہِ رب العزت میں گذار ہوئے تو خداوند کریم کی طرف سے ان کو سخت تنبیہہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ اگرچہ تم برائیوں کے مرتکب نہیں ہو۔ لیکن تم بُروں کی برائی پر تو راضی رہے ہو تم نے منکر کو دیکھا اور اُس سے نہی نہیں کی۔ لہٰذا اس عذاب میں تم بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہو۔

پس حضرت ارمیاء نے عرض کی کہ میرے اللہ! مجھے بتا کہ وہ کون شخص ہو گا۔ تاکہ میں اس سے جا کر اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے امان طلب کر لوں۔ تو وحی ہوئی کہ تو فلاں مقام پر جا۔ وہ ابھی لڑکا ہے جو اس وقت سخت بیمار ہے چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔ اس کی پیدائش خبیث تر اس کا جسم نحیف تر اور اس کی غذا خسیس تر ہے۔

پس حضرت ارمیاء اسی شہر میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک سرائے میں وہ ایک مزبلہ پر کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے۔ اس کی ماں روٹی کے ٹکڑے ایک پیالہ میں لے کر اس پر سورنی کا دودھ دوہتی ہے تاکہ وہ نرم ہو جائیں پھر اس کو کھلاتی ہے۔ حضرت ارمیاء نے جانا کہ یہ وہی ہے جس کی اللہ سبحانہٗ نے خبر دی تھی۔ پھر اس سے دریافت کیا کہ تیرا نام کیا ہے تو اس نے اپنا نام بخت نصر بتایا۔ اب تو ان کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے پس اس کے علاج میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک وہ تندرست ہو گیا۔ پھر فرمایا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ صرف اتنا جانتا ہوں کہ تو ایک نیک آدمی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کا نبی ہوں۔ میرا نام ارمیاء ہے۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ وہ تجھے بنی اسرائیل پر غلبہ دے گا اور تو ان کو قتل کرے گا۔ یہ سُن کر بخت نصر اس وقت حیران و ششدر سا ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ارمیاء نے فرمایا کہ تو میرے لئے امان نامہ لکھ۔ تو حضرت ارمیاء کے فرمانے پر اس نے امان نامہ لکھ دیا۔

تندرست ہو جانے کے بعد بخت نصر کا دستور تھا کہ رات کے وقت پہاڑ کی طرف نکل جاتا اور لکڑیاں جمع کر کے لاتا۔ اور ان کو بازار میں بیچ کر گذر اوقات کرتا تھا اور اسی سے ترقی کرتے کرتے ایک بارسوخ سفید پوش انسان ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے لوگوں کو بنی اسرائیل سے لڑنے کے لئے اپنی طرف بلانا شروع کر دیا اور لوگ بھی کافی تعداد میں اس کے

حلقہ بگوش ہو گئے۔ یہاں تک کہ کثیر تعداد میں ایک جرار لشکر لے کر بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل کا مسکن تھا۔

حضرت ارمیاء علیہ السلام کو جب بخت نصر کی فوج کشی کی خبر پہنچی تو وہ امان نامہ ساتھ لئے گدھے پر سوار ہو کر شہر سے باہر تشریف لائے لیکن لشکر اس قدر زیادہ تھا کہ ان کی بخت نصر تک رسائی نہ ہو سکی تو انہوں نے ایک لکڑی کے سرے پر اس امان نامہ کو باندھ کر بلند کیا۔ جب بخت نصر نے یہ دیکھا۔ تو اُن کو اپنے پاس بلا کر دریافت کیا۔ کہ آپ کون ہیں؟ فرمایا کہ میں وہی ارمیاء نبی ہوں جس نے تجھے بادشاہی کی بشارت دی تھی اور یہ وہی امان نامہ ہے جو تو نے مجھے لکھ کر دیا تھا پس بخت نصر نے جواب دیا کہ تجھے بے شک امان ہے لیکن تیرے اہلبیت (گھر والوں) کے لئے کوئی امان نہیں۔ پس وہ بیت المقدس کے شہر میں داخل ہوا۔ شہر کے وسط میں ایک ٹیلہ دیکھا کہ اس کے درمیان سے خون جوش مار کر اُبلتا ہے اور بند نہیں ہوتا اس نے لوگوں سے دریافت کیا۔ کہ اس کا ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ نے ایک نبی کو قتل کیا تھا اور یہ اس نبی کا ناحق خون ہے کہ ہم لوگ جس قدر اس پر مٹی ڈالتے ہیں یہ اور زیادہ جوش زن ہوتا ہے۔ اور یہ نبی حضرت یحیٰی بن زکریا تھے اور ان کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ اس دور کا بنی اسرائیل کا بادشاہ زانی و بدکار تھا۔ جب حضرت یحیٰی سے اس کا گزر ہوتا۔ تو آپ اس کو اس فعل بد سے روکتے تھے اور خوف خدا کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔

ان بدکار عورتوں میں سے ایک عورت نے جب کہ بادشاہ نشہ شراب میں چور تھا۔ بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ یحیٰی کو قتل کر دیا جائے کیونکہ یہ ہماری عیش پسندی میں رخنہ اندازی کرتا ہے، بادشاہ نے فوراً اس کے قتل کا حکم دے دیا پس حضرت یحیٰی کے سر کو طشت میں اٹھا کر بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ تو اس پاک سر سے آواز آئی فرمایا۔ خدا سے ڈر۔ تیرے لئے زناکاری حلال نہیں۔ پس طشت میں خون کھولنے لگ گیا۔ یہاں تک کہ زمین پر جاری ہو گیا اور اس کا جوش بڑھتا گیا اور جوں جوں کوشش اس کو روکنے کی کی گئی۔ توں توں وہ زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ مٹی کا پہاڑ بن گیا۔ اور بخت نصر کے خروج اور حضرت یحیٰی علیہ السلام کے قتل ہونے کے درمیان ایک سو برس کا فاصلہ تھا۔

پس بخت نصر نے قسم کھائی کہ میں بنی اسرائیل کو اس وقت تک قتل کرتا رہوں گا جب تک یہ خون بند نہ ہو گا مردوں عورتوں بچوں حتٰے کہ ان کے حیوانوں کو بھی قتل کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لیکن باوجود اس کے حضرت یحیٰی کے خون کا جوش بند نہ ہوا۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا ابھی ان شہروں میں بنی اسرائیل سے کوئی آدمی موجود ہے تو کہا گیا کہ ایک بڑھیا فلاں مقام پر رہتی ہے پس اس کو قتل کرنے کا حکم دیا چنانچہ وہ قتل کر دی گئی اور جب وہ قتل ہوئی تو حضرت یحیٰی کا خون بند ہوا۔ اور کہتے ہیں کہ یہ وہی عورت تھی جس نے بادشاہ کو حضرت یحیٰی کے قتل کا مشورہ دیا تھا۔

انجام بخت نصر

اس کے بعد بخت نصر بابل کی طرف آیا اور یہاں ایک شہر تعمیر کیا اور حضرت دانیال پیغمبر کو ایک کنواں کھدوا کر اس میں ڈال دیا۔ اور ایک عرصہ تک ان کو وہاں محبوس رکھا۔ بیت المقدس کے نبی کو وحی ہوئی کہ بابل کے فلاں کنویں میں دانیالؑ کو آب و غذا پہنچاؤ۔ پس وہ نبی آیا اور کنویں کے کنارہ سے جھانک کر سلام کر کے

آواز دی۔ حضرت دانیالؑ نے جواب میں لبیک کہا۔ اس نبی نے کہا کہ خداوند کریم نے بعد سلام کے تجھے آب و طعام بھیجا ہے اس کو قبول کیجئے اور اس کو کنویں میں لٹکایا۔ حضرت دانیالؑ نے خداوند کریم کا شکریہ ادا کیا۔ بایں الفاظ

اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اپنی یاد سے نہیں بھلایا۔ اس اللہ کی حمد ہے جو دعا مانگنے والے کی دعا کو رد نہیں فرماتا۔ اس اللہ کی حمد ہے جو توکل کرنے والوں کو خود کافی ہوتا ہے۔ اس اللہ کا شکر ہے جو اپنی ذات پر بھروسہ کرنے والے کو اپنے غیر کے حوالہ نہیں کرتا۔ بلکہ خود اس کا کفیل ہوتا ہے۔ اس اللہ کا شکر ہے جو احسان کا بدلہ احسان سے دیتا ہے۔ اس اللہ کا شکر ہے جو صبر کے بدلہ میں نجات عطا فرماتا ہے۔ اس اللہ کی حمد ہے جو مصائب کے بعد ان کو دفع بھی فرماتا ہے اس اللہ کا شکر ہے کہ تمام حیلوں کے ختم ہوجانے کے بعد اُسی کی ذات پر بھروسہ باقی رہ جاتا ہے اور اس اللہ کا شکر ہے کہ جب ہم اپنے اعمال سے بدظن ہوجائیں تو اس کی رحمت کی امید دل میں ہوتی ہی ہے۔

بخت نصر نے خواب میں دیکھا کہ اس کا سر لوہے کا اور پاؤں پیتل کے اور سینہ سونے کا ہے فوراً نجومیوں کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ میں نے کیا دیکھا ہے۔ وہ کہنے لگے۔ بادشاہ۔ آپ خواب بیان فرمائیں۔ تب ہم اس کی تعبیر بیان کریں گے ورنہ ہمیں کیا معلوم کہ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ بخت نصر کہنے لگا کہ میں تم کو تنخواہیں حرام کی دیتا ہوں۔ جب تم اتنی سی بات بھی نہیں بتا سکتے۔ پس فوراً ان سب کو قتل کروا دیا۔

بعض حاضرین نے کہا۔ کہ یہ چیز وہی شخص ہی بتا سکے گا جو کنویں کی تاریکی میں مدت سے زندگی کے دن گذار رہا ہے پس حضرت دانیال کو حاضر کیا گیا۔ بخت نصر نے اپنا سوال پیش کیا۔ حضرت دانیالؑ نے اس کو خواب کا سب ماجرا سُنایا۔ اور اس کی تعبیر بتائی کہ بس! اب تیرا ملک زائل ہے اور تو تین دن تک قتل ہو جائے گا اور تیرا قاتل ایرانی باشندہ ہوگا یہ سنتے ہی بخت نصر نے شہر کے ہر دروازہ پر سخت پہرہ بٹھا دیا۔ اور حکم دیا کہ جو بھی اس طرف آئے اس کو قتل کر دو اور حضرت دانیال کو اپنے پاس رکھا۔ کہ اگر تین روز گذر گئے اور میں قتل نہ ہوا۔ تو تجھے قتل کر دوں گا۔ تیسرے دن جب شام ہوئی تو بخت نصر کو پریشانی اور غم لاحق ہوا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر نکلا۔ اس کا غلام جو اس کے بچے کی خدمت کرتا تھا۔ اس کے سامنے آیا اور وہ غلام ایرانی تھا لیکن بخت نصر کو اس کی خبر نہ تھی۔ پس بخت نصر نے اس کو تلوار دی اور حکم دیا کہ تیرے سامنے جو بھی آئے اس کو قتل کر دے خواہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ غلام نے تلوار لے کر اسی جگہ بخت نصر کو اسی تلوار سے ڈھیر کر دیا۔

حضرت ارمیاءؑ یا حضرت عزیرؑ کی موت

جب بخت نصر بنی اسرائیل کو قتل کر چکا تو نبی کی طرف پیغام بھیجا کہ تو اللہ کا نبی ہے اگر چاہے تو میرے ہاں قیام کرو اور نہیں تو جہاں جاؤ۔ میری طرف سے کُھلی اجازت۔ آپ نے وہاں سے روانگی کو پسند فرمایا۔ اس کے بعد قصہ وہی ہے جس کو قرآن مجید بیان فرما رہا ہے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۔حضرت ارمیا جب روانہ ہوئے تھے تو گدھے پر سوار تھے اور ان کے ساتھ زادِ راہ انجیر و انگور اور شیرہ تھا۔پس جب اس بستی سے ان کا گذر ہوا جس کو بخت نصر نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے دل میں سوچا کہ خدا ان کو کیسے زندہ کرے گا۔یعنی ان کی زندگی کی خواہش کی تاکہ اپنی آنکھوں سے قدرتِ خدا کو ملاحظہ کریں۔پس خدا نے ان کو موت دے دی اور ایک سو سال تک وہ وہاں مر کر سوئے رہے۔

جب وہ پہلی دفعہ وہاں سوئے تھے تو دن چڑھا ہوا تھا اور جب سو برس کے بعد خدا نے ان کو دوبارہ زندہ کیا تو سورج مغرب کی طرف تھا۔پہلے پہل ان کی آنکھوں میں روح پلٹائی گئی اور سوال کیا گیا کہ بتائیے تم یہاں کس قدر ٹھہرے رہے ہو؟ جواب دیا کہ ایک دن کامل۔پھر جب سورج کی طرف نگاہ کی تو فوراً کہا۔بلکہ دن کا کچھ حصہ۔پس ارشاد ہوا نہیں بلکہ تم تو یہاں ایک سو سال ٹھہرے رہے ہو۔اب اپنی یا اپنے گدھے کی ہڈیوں کو ملاحظہ کرو کہ ہم کس طرح ان کو آپس میں جمع کرتے ہیں اور پھر ان پر گوشت پہناتے ہیں تو اس کے بعد حضرت ارمیاء دیکھتے رہے اور ان کے سامنے ان کے بقیہ بدن کی ہڈیاں جو خاکستر ہو گئی تھیں اکٹھی ہونی شروع ہو گئیں اور آپس میں ملتی گئیں جب سب اعضاء اپنے مقام پر آگئے تو اوپر گوشت پوست پھر مکمل ہو گیا اور خود بھی اٹھ بیٹھے اور ان کا گدھا بھی زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

پھر ارشاد ہوا کہ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ ۔یعنی اپنے زادِ راہ کو ملاحظہ کرو جو کہ بہت جلد خراب ہو جانے والی چیزیں ہیں۔لیکن بقدرتِ خدا ابھی تک مثل تازہ کے ہیں اور باسی نہیں ہوئیں۔پس جب حضرت ارمیاء نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ملاحظہ کیا۔کہنے لگے۔بے شک مجھے یقین ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (یہ واقعہ حضرت قائم آلِ محمدؐ کی طویل زندگی پر وارد ہونے والے تمام اعتراضوں کا جواب ہے جو خدا ایک بہت جلد خراب ہو جانے والے عام میوہ جات کو ایک عرصہ دراز تک تر و تازہ رکھ سکتا ہے کیا وہ اپنے کسی خاص بندے کو ایک طویل عرصہ تک زندہ رکھنے پر قادر نہیں بے شک وہ ہے اور اس نے اپنی مصلحت سے ایسا کیا ہے۔

یہ قصہ اگرچہ بعض روایات میں حضرت ارمیاء کی طرف منسوب ہے لیکن زیادہ مشہور حضرت عزیرؑ کے متعلق ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب حضرت اپنے گھر سے نکلے تھے تو ان کی زوجہ حاملہ تھی اور ان کی عمر اس وقت پچاس برس کی تھی۔جب سو برس کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے تو ان کی عمر وہی پچاس برس ہی تھی جب گھر تشریف لائے اور ان کا فرزند اس وقت سو برس کا تھا اور عمر میں حضرت عزیر سے پچاس برس بڑا تھا اور یہ اللہ کی آیات میں سے ہے کہتے ہیں کہ بخت نصر نے تورات کو جلا دیا تھا۔پس جب حضرت عزیرؑ واپس آئے تو انہوں نے تورات کو از سر نو اپنے حفظ سے لکھ دیا۔بنی اسرائیل اس بات پر باور نہیں کرتے تھے کہ یہ وہی تورات ہے یا اس میں کمی یا بیشی ہے تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میرے دادا نے اپنے باغ میں تورات کا نسخہ دفن کروایا تھا۔مجھے وہاں لے چلو۔تاکہ اسے وہاں سے نکال کر مقابلہ کر کے دیکھیں۔جب تورات کا وہ نسخہ برآمد کر کے لائے اور اس کے ساتھ اس کا مقابلہ کرایا گیا۔تو ایک حرف تک

حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی۔ اور چار پرندوں کے پکڑنے اور ان کو قیمہ کر کے پہاڑوں پر تقسیم کرنے کا حکم ہوا۔
فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ چار پرندے :۔ مور، مرغ، کبوتر اور کوّا تھے۔ اور امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ گدھ، مور، بطخ اور مرغ تھے۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے وہ چار پرندے پکڑے ان کے گوشت کے ٹکڑے کئے ان کو آپس میں ملا کر قیمہ کر لیا اور دس پہاڑوں پر اس کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا اور ہر ایک کی چونچ اپنی انگلیوں میں محفوظ رکھی اور اس کے بعد باری باری سے ایک ایک کو بلایا پس بقدرت خدا اُن کے اجزاء ہوا میں پرواز کرنے لگے اور ہر پرندہ کی جزئیں علیحٰدہ علیحٰدہ یکجا ہونے لگ گئیں اور جب ان کے جسم مکمل ہو گئے اور ان میں رُوح داخل ہو گئی تو دوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت صادقؑ سے منقول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ (بطور امتحان کے) ایک پرندہ کی چونچ دوسرے پرندہ کے سامنے کرتے تھے تو وہ اس کو قبول نہ کرتا تھا۔ جب اس کی اپنی چونچ سامنے کرتے تو وہ اس کو قبول کر لیتا تھا۔ پس اس طریقہ سے ان کے جسم مکمل ہو گئے۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے ان کی چونچوں کو چھوڑ دیا۔ تو وہ اڑ گئے اور اپنے کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔

وجہ ربط چونکہ پہلے ارشاد فرمایا کہ خدا ایمان والوں کا ولی ہے اور ان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتا ہے اس کے بعد ایمان کی طرف لے جانے کے مدارج اور اسباب، ہدایت کی تفصیل کو ان آیات میں واضح فرمایا کہ ہدایت و رشد کے تین طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ۔ دلیل و برہان۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے مقابلہ میں اختیار فرمایا۔ پس صاحبان انصاف کے لئے حضرت ابراہیمؑ کا استدلال قبول ایمان کے لئے کافی تھا اور اس کے بعد جو یقین و اعتقاد پیدا ہو، اُسی کا نام ہے ایمان اور اس طریقہ سے حاصل ہونے والے یقین کو اہل معرفت علم الیقین کہتے ہیں۔

دوسرا طریقہ۔ شہادت عینی۔ جس طرح حضرت عزیرؑ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرایا گیا۔ اور اس درجہ کو اہلِ معرفت عین الیقین سے تعبیر کرتے ہیں۔

تیسرا طریقہ۔ علت و معلول پر ہر دو کی سیر یعنی اصل واقعہ کا مشاہدہ بھی ہو اور اس کی علت کی نشاندہی بھی ہو اور یہ ہدایت کا قوی ترین مرتبہ ہے جس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔

جس طرح کہ حضرت ابراہیمؑ کا پرندوں کو ذبح کر کے ان کے قیمے کو پہاڑوں پر رکھ کر پھر پکارنا اور ان کا زندہ ہو کر ان کے پاس آنا۔

گویا حق کو مان لینے اور تسلیم کر لینے کے مراتب ہیں۔ پہلا مرتبہ تو ہے صرف کسی کے کہنے پر سر جھکا لینا اور صاد کر دینا اور یہ ہے انقیاد و اطاعت کی منزل کمال، نہ طلب دلیل ہو نہ طلب مشاہدہ اور نہ طلب ذوق ہو۔ گویا اُدھر سے ارشاد ہو اور اُدھر سے گردن حاضر ہو یہ ہے حقیقی اسلام و تسلیم لیکن یہ تسلیم چونکہ صرف تقلید ہی تقلید ہوتی ہے لہٰذا اس میں ثبات

نہیں ہوتا۔ بلکہ ادنیٰ سے شکوک و شبہات سے اس کا زوال متوقع ہوا کرتا ہے اس لئے کہ اس کو دلیل و برہان سے تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس سے پختگی و دوام اور خلوص اتقان کی رُو سے بلند مرتبہ وہ ہے جو دلیل و برہان سے استوار ہو۔

اور اس کے بعد دوسرا درجہ ہے مقام تبلیغ میں تسکین قلب اور تفہیم غیر کے لئے طرق معرفت میں دلیل سے اقدام کرنا، تاکہ کسی کی تشکیک یا گمراہ کن شبہات اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہ پیدا کر سکیں۔ لہٰذا یہ مقام ہے دلیل و برہان کا۔ جو علم الیقین اور ایمان راسخ کی اصل ہے۔

پھر تیسرا درجہ ہے مشاہدہ کا۔ جو ایقان قلب اور عین الیقین کا سبب ہے اور چوتھا درجہ ہے معلول و علت دونوں کا مشاہدہ۔ اور یہ اطمینان اور حق الیقین کا زینہ ہے۔ مثال کے طور پر کسی کے کہنے سے آگ کا وجود مان لینا ہے حسن یقین اور دھواں دیکھ کر تسلیم کرنا ہے علم الیقین اور آگ کا مشاہدہ کرنا ہے عین الیقین، اور اس کی گرمی سے متاثر ہو کر اس کا اعتراف کرنا ہے حق الیقین۔

نمرود کے سامنے علم الیقین یعنی ایمان کا منظر تھا اور حضرت عزیر عین الیقین اور ایقان کی منزل تک پہنچے اور حضرت ابراہیمؑ حق الیقین اور اطمینان کے درجہ کے طالب تھے جسے پالیا۔ اور یہ عرفان کی آخری منزل ہے۔ جس میں کوئی شک و شبہ مؤثر نہیں ہو سکتا۔

بحار الانوار ج ۱۵ باب الیقین والبصر میں بروایت کافی حضرت امام رضا علیہ السلام سے یونس نے ایمان و اسلام کا فرق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ ایمان بھی اسلام کو ہی کہتے ہیں لیکن یہ اس سے ایک درجہ بلند ہے اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ بلند ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بلند ہے اور لوگوں میں یہ درجہ بہت کم تقسیم ہوا ہے یونس کہتا ہے میں نے عرض کی۔ یقین کیا شے ہے؟ آپ نے فرمایا۔ اللہ پر توکل اور اس کیلئے تسلیم و رضا۔ الخبر یعنی جب انسان کو اللہ کی وحدانیت، علم، قدرت، حکمت، تقدیر، تدبیر اور رأفت و رحمت پر یقین ہو گا تو لامحالہ اپنے تمام امور میں اس پر توکل و بھروسہ کریگا۔ اسی ذیل میں علامہ مجلسی قدہ فرماتے ہیں کہ علم و ایمان کے مدارج و مراتب ہیں جس قدر علم میں زیادتی ہو گی اسی قدر ایمان میں بلندی ہو گی اور ایمان کا پہلا مرتبہ ہے تصدیق جسمیں شکوک و شبہات کی کم و بیش ملاوٹ بھی ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ۔ اور اسی درجہ کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح فرماتا ہے قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا الخ
اس کے بعد ایمان کا وہ درجہ ہے جس میں شک و شبہ نہ ہو جس طرح ارشاد ہے الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا۔ الخ
اور اس سے بلند مرتبہ ہے محبت کاملہ کا جس کو احسان سے بھی تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ اور یہی یقین کا مرتبہ ہے اور پھر یقین کے تین درجے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، اور حق الیقین وصل کی وہ آخری منزل ہے جس سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں چنانچہ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں کہ اگر میرے سامنے سے پردے اٹھ جائیں تب بھی یقین میں اضافہ نہ ہو گا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں مثل اس دانے کے ہے جو اگائے سات خوشے کہ ہر خوشہ

سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۲۶۱

میں ایک سو دانہ ہو اور خدا زیادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہے اور خدا صاحب وسعت و علم ہے

رکوع نمبر ۴ خدا کی راہ میں خرچ کرنا

مَثَلُ الَّذِيْنَ ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مومن جو بھی نیکی کرے ۔ خداوند کریم اس کو ہر نیکی کا بدلہ سات سو گنا جزا کرامت فرمائے گا اور آپ نے اسی آیت مجیدہ سے استشہاد فرمایا ۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام گھر سے تشریف لائے ۔ حسنین شریفین کو بے تاب دیکھا ۔ جناب فاطمہؑ نے عرض کی کہ شہزادے بھوک سے ہیں اور تین روز کا ان کو فاقہ ہے ۔ پس آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور عبداللہ بن عوف سے ایک دینار قرض طلب فرمایا ۔ اس نے ایک تھیلی جس میں سو دینار تھے بطور صدقہ کے پیش کی ۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے جناب رسولِ خدا سے سنا ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے پس میں کسی کا احسانمند نہیں ہونا چاہتا ۔ مجھے قرض دے دیجئے کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ صدقہ کا ثواب ایک کا دس گنا ہے اور قرضہ کا ثواب اٹھارہ گنا ہے ۔ پس ایک دینار قرض لے کر بازار کی طرف روانہ ہوئے ۔ دیکھا کہ راستہ میں مقداد بیٹھے ہیں ۔ آپ نے فرمایا مقداد ! ایسی گرمی میں کیسے گھر سے نکلنا ہوا ۔ مقداد نے عرض کی کہ چار روز سے فاقہ ہے لہٰذا مجبوراً گھر سے نکلا ہوں کہ شاید کچھ میسر آجائے تو آپ نے وہ دینار مقداد کو دیدیا اور فرمایا کہ تو ہم سے زیادہ مستحق ہے کیونکہ ہمارے گھر تین روز سے فاقہ ہے اور تجھے چوتھا روز ہے پس مسجد میں تشریف لائے تو یہ آیت اتری ۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ الخ دوسرے دن ایک سوار آیا حضرت علیؑ کو ایک تھیلی پیش کی اور غائب ہوگیا ۔ حضرت علیؑ اس کو لے کر خدمتِ سرکارِ رسالت میں وارد ہوئے اور ماجرا سنایا ۔ آپ نے تھیلی کو کھولا تو اس میں سات سو دینار تھے فرمایا ۔ اے علیؑ کیا تو نے اس ناقہ سوار کو پہچانا تھا ؟ وہ تو حضرت جبرئیلؑ تھے اور بحکم خدا آئے تھے اور یہ تھیلی اس ایک دینار کا عوض ہے جو آپ نے کل مقداد کے حوالہ کیا تھا اور آخرت میں خدا اس کا بدلہ اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا ۔ پس حضرت علیؑ نے فرمایا کہ بے شک فرمانِ خدا درست و صحیح ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ۔ ان کی جزا مثل اس ایک دانے کے ہے جس سے سات سو دانہ پیدا ہو ۔ اس کے بعد آپ نے ایک دینار قرض خواہ کو واپس دیا اور باقی اہلبیتؑ اور فقراء پر تقسیم فرمایا ۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَـهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں پھر اُس کے پیچھے احسان بھی نہیں جتلاتے اور

مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

نہ اذیت دیتے ہیں تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ

هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ۲۶۲ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ۗ

غمگین ہوں گے نیک بات اور درگذر بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے بعد اذیت ہو۔

مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۔ مجمع البیان میں جناب رسالتمآب سے مروی ہے کہ جو شخص کسی پر احسان کرکے پھر جتلائے تو خدا بروز محشر اس کو اپنے کلام و نظر رحمت سے محروم کرے گا اور نہ ہی اس کا عمل پاکیزہ ہوگا (تاکہ قابل جزا ہو) اور اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ سائل کو اذیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ترشروئی سے اس کے پیش آئے یا جھڑک کر اس کو کچھ دے یا احسان کرنے کے بعد اس سے اپنے کام کاج کروائے تو اس قسم کی چیزیں احسان کی جزاء کو باطل کر دیتی ہیں۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۔ اگر کوئی سائل کچھ سوال کرے اور اس کو کچھ دینا نہ چاہے تو بجائے سخت کلامی کے اس کو دعائے خیر کرے۔ مثلاً کہے کہ خدا تجھے رزق وافر عطا فرمائے۔

وَمَغْفِرَةٌ ۔ اگر سائل سخت لہجہ میں سوال کرے یا خدا اور رسول و آئمہ کی قسمیں دینے لگ جائے یا بے وقت اور بے جا سوال کرے جس سے دل کو تکلیف پہنچے۔ تو ایسے حالات میں اس سے درگذر کرنا اور اس سے چشم پوشی کرنا بہتر ہے۔ بہر کیف اس کو نیک بات کہہ کر ٹال دینا۔ یا اس کی بے جا لیچڑ باتوں سے درگذر کرنا اُس دینے سے بہتر ہے جو ترشروئی سے جھڑک کر دیا جائے یا اس کو کوئی اور قولی یا فعلی تکلیف دی جائے۔

تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام نے ایک دفعہ خضرؑ سے فرمایا۔ کہ کوئی کلمۂ حکمت سنائیے تو خضر نے کہا۔ غنی اور مالدار لوگوں کی فقراء لوگوں پر شفقت و مہربانی اگر حصولِ ثواب کے لئے ہو تو کیا خوب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر چیز سنائیے۔ انہوں نے کہا۔ اس سے بہتر اور نہیں ہے تو آپ نے فرمایا۔ کہ اس سے بہتر ہے غنی اور مالدار لوگوں کے سامنے فقراء کی خودداری جو خدا پر توکل کرکے کسی اور کے زیر بار احسان ہونا پسند نہ کریں۔

اس مقام پر صرف صدقہ خیرات کرنے کا ذکر ہے یہ تصریح نہیں کہ واجب ہو یا غیر واجب۔ اور براہ خدا میں خرچ کرنے کی مدات بھی متعدد ہیں۔ فقراء و مساکین کی اعانت، تعمیر مساجد، عزاداری حضرت سید الشہداء اور ترویج علوم آل محمد وغیرہ ان سب پر خرچ کرنا اللہ کی راہ میں خرچ ہے لیکن اس میں سے بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے اور بمطابق مضمون احادیث

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ

اور اللہ غنی اور صاحب حوصلہ ہے اے ایمان والو! نہ باطل کرو اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت

وَالۡاَذٰی ۙ کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ

دے کر مثل اس کے جو خرچ کرتا ہے مال اپنا لوگوں کے دکھانے کے لئے حالانکہ نہ اللہ پر اس کا ایمان ہے اور نہ قیامت پر

فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفۡوَانٍ عَلَیۡہِ تُرَابٌ فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلۡدًا ؕ لَا

پس اس کی مثال اس صاف پتھر کی سی ہے جس پر گرد پڑی ہو۔ پس اس پر زور کی بارش آئے اور اس کو صاف کر دے ۔ وہ

یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۶۴﴾

لوگ کچھ بھی نہ وصول کریں گے اپنے کئے کا بدلہ اور خدا نہیں ہدایت فرماتا ہے کافر لوگوں کو

ترویج علوم آل محمدؐ کے لئے مدارس دینیہ پر خرچ کرنا سب سے افضل ہے کیونکہ علم تمام نیکیوں کی اصل ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ عالم یا متعلم کی امداد کرنا، خواہ معمولی ہو، تعمیر کعبہ کا ثواب رکھتی ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسولخداؐ نے فرمایا کہ جو شخص مومن پر احسان کرے اور پھر اس کو کلام کے ساتھ اذیت دے یا اس پر اپنا احسان جتلائے تو گویا اس نے اپنی خیرات کو باطل کر دیا۔ جیسا کہ آیت مجیدہ میں خداوند کریم ارشاد فرما رہا ہے کہ احسان جتلانے اور اذیت دینے سے اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ اور اس قسم کا صدقہ اس طرح باطل ہے۔ جس طرح ریاکاری کی خیرات باطل ہے اور پھر مزید وضاحت کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی ہے کہ جس طرح پتھر پر پڑی ہوئی گرد بارش پڑنے سے بالکل دھل جاتی ہے اور پتھر بالکل صاف نکل آتا ہے۔ اسی طرح صدقہ احسان جتلانے یا اذیت دینے کے بعد بالکل ضائع اور برباد ہو جاتا ہے۔

(بحار ص۱۵) جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ بروز محشر پہلے پہل تین قسم کے لوگوں کو حاضر کیا جائے گا (۱) قاری قرآن (۲) مجاہد (۳) مالدار۔ قاری سے سوال ہوگا کہ تو نے علم قرآن حاصل کرنے کے باوجود کیا عمل کیا وہ جواب دیگا کہ میں نے شب و روز عبادت کی پس ارشاد ہوگا کہ غلط کہتا ہے بلکہ تو نے تو صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر ہی سب کچھ کیا تھا۔ مالدار سے سوال ہوگا کہ تو نے میرے عطا کردہ مال سے کیا عمل کیا تھا وہ جواب دیگا کہ میں نے فلاں صلہ رحمی کی۔ فلاں صدقہ دیا تو جواب ملے گا کہ غلط کہتا ہے بلکہ تو نے تو یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں۔ پھر مجاہد سے سوال ہوگا تو وہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا تھا۔ پس جواب ملے گا کہ یہ تو نے شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا تھا پس ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ خداوند کریم جملہ مومنین کو اس مرض سے بچائے

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا

اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو واسطے حاصل کرنے خوشنودی خدا کے اور ساتھ قوت ایمانی

مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا

کے۔ مثل اس باغ کے ہے جو بلندی پر ہو اور اس پر زور کا مینہ پڑے پس وہ اپنی آمدنی دگنی دے

ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

پس اگر نہ بھی پڑے اس پر زور کا مینہ تو معمولی بارش (شبنم) اور اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا کہ جاری ہوں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ

اس کے نیچے نہریں۔ جس میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں اور اس پر بڑھاپا آ جائے

وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ

اور اس کے بچے (چھوٹے) کمزور ہوں پس اس باغ پر ایک بگولہ ایسا آئے جس میں آگ ہو پس وہ جل جائے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع

اسیطرح بیان فرماتا ہے خدا تمہارے لئے آیات کو تاکہ تم فکر کرو (سوچو)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ ۔ یعنی جو لوگ خوشنودی خدا کے لئے اور ایمانداری سے خیرات کرتے ہیں نہ احسان جتلاتے ہیں۔ اور نہ اذیت دیتے ہیں ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو بلندی پہ ہو اور بارش کی وجہ سے اس کی آمدنی دگنی ہو جائے (یعنی ان کا اجر دگنا ہو جاتا ہے) اور اگر بارش نہ آئے تو معمولی بونداباندی یا شبنم بھی اس کے لئے فائدہ مند ہوا کرتی ہے۔ بہرصورت وہ نقصان میں نہیں رہتے امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس سے پہلی آیت بنی امیہ کے حق میں اتری۔ اور دوسری آیت کے مصداق حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہیں۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ ۔ یہ ریاکاری سے خرچ کرنے والے کی مثال ہے کہ جس طرح ایک شخص محنت کر کے باغ تیار کرے جس میں ہر قسم کے میوہ جات کے درخت ہوں اور بوڑھا بھی ہو اور بچے بھی چھوٹے ہوں اور جب اس کا باغ تیار ہو جائے

تو ایک گرم ہوا آکر اس کے سب باغ کو جلا دے تو اس وقت جس طرح اس بوڑھے کو حسرت ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کیونکہ عمر گزر چکی ہے جوانی واپس نہیں آتی تاکہ دوبارہ محنت کر کے بچوں کے مستقبل کے لئے کوئی انتظام کر سکے۔ اسی طرح ریاکاری سے خرچ کرنے والا میدانِ محشر میں جبکہ اس کو کمائی اپنی کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اب نہ دنیا میں واپس آسکتا ہے اور نہ عمل صالح کرنے کا موقعہ مل سکتا ہے اور جو کچھ اس نے کیا تھا اس کو ریاکاری نے اسی طرح جلا کر نیست و نابود کر دیا تھا جس طرح کہ گرم لُو باغ کو تباہ کر دیتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جو صدقہ و خیرات احسان جتلانے کے لئے یا اذیت کے لئے یا ریاکاری کے طور پر کیا جائے وہ بالکل برباد و رائیگاں جاتا ہے۔

چنانچہ عمدۃ البیان میں حضرت امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جوانمردی چار چیزوں میں ہے۔

(۱) غنی ہوتے ہوئے تواضع کرنا (۲) باوجود قدرت کے انتقام نہ لینا (۳) باوجود دشمنی کے خیر خواہی کرنا (۴) احسان جتلائے بغیر کسی کو کچھ دینا۔

نیز آپؑ سے منقول ہے سخی لوگ دنیا و عقبیٰ کے سردار ہیں۔ نیز فرمایا۔ تعجب ان لوگوں پر ہے جو غلام خرید کر کے آزاد کرتے ہیں۔ بھلا وہ احسان کر کے آزادوں کو اپنا دائمی غلام کیوں نہیں بنا لیتے۔ جناب رسولِ خداؐ سے مروی ہے کہ بہشت سخیوں کے لئے ہے۔

پس انسان کو چاہیئے کہ خوشنودیٔ خدا کے لئے ہی فقراءِ مومنین کی اپنے مالِ حلال سے اعانت کرے کیونکہ بعض احادیث میں ان کو اللہ کی عیال سے تعبیر کیا گیا ہے اور صدقہ کرنا بہت سے مصائب کو دفع کرتا ہے اگر سفر میں صدقہ کیا جائے تو وہ سفر کی مصیبتوں سے نجات دلانے کا موجب ہو جایا کرتا ہے اور سفر سے پہلے صدقہ و خیرات کر کے گھر سے روانگی ایام کی نحوست کو برطرف کر دیا کرتی ہے۔

تنبیہ:۔ انسان نے آخر مر جانا ہے اور اس دنیا کے مال میں سے انسان کا حصہ صرف وہی ہے جو کچھ اس نے کھایا پیا۔ اور راہِ خدا میں خرچ کیا۔ ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کے پاس ایک مہمان وارد ہوا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ میں کچھ مشغول ہوں۔ میرے اونٹوں میں سے ایک اچھا اونٹ تلاش کر لائیے پس وہ ایک کمزور اونٹ لائے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ تم نے خیانت سے کام لیا ہے یعنی عمدہ اونٹ کیوں نہیں لائے تو جواب دے دیا گیا کہ عمدہ اونٹ موجود تھا۔ لیکن آپ کی اشد ضرورت کے وقت وہ کام آئے گا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا سخت ترین وقت قبر سے زیادہ اور کون سا ہوگا اور لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ الخ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ وہ اونٹ میرا محبوب ترین مال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اُسے اپنے کام میں لاؤں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ مال میں تین شریک ہیں (۱) تقدیر جو موت و ہلاکت سے اچھے یا بُرے مال کو لے جائے گی۔ (۲) وارث جو موت کے منتظر ہیں، مالک مر گیا تو وہ لے جائیں گے اور تیسرا خود مالک۔ پس اُسے باقیوں سے شست

نہیں ہونا چاہیئے اور پھر وہی آیت تلاوت فرمائی۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ الخ (مجمع البیان)
——— تو خوشا نصیب ہے وہ مالکِ مال جو اپنے اختیار سے اپنے مال سے خود فائدہ اٹھائے۔

بعض اوقات جب انسان کے پاس مال ہوتا ہے تو راہِ خدا میں خرچ کرنے سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ کہیں فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے چنانچہ اگلے رکوع میں خدا اسی خیال کی نشان دہی فرما رہا ہے کہ یہ وسوسہ انسان کو شیطان کی طرف سے آیا کرتا ہے۔ کیونکہ جب انسان زکوٰۃ یا خمس یا کوئی اور خیرات کرنا چاہے تو چپکے سے شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ خبردار! یہ خرچ نہ کر ورنہ تیرا اس قدر مال بے فائدہ ضائع ہو جائے گا۔ تیرے بال بچے بھوکے رہیں گے۔

چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔ اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ۔ یعنی شیطان ہی یہ باتیں دل میں ڈالتا ہے حالانکہ خدا بخشش اور زیادتی مال کا وعدہ کر چکا ہے اور یہ انسان کی کمال بدبختی کی نشانی ہے کہ شیطانی وسوسے میں پھنس کر خدا کے وعدہ کو نظر انداز کر دے۔ ہم نے کئی ایسے انسان دیکھے ہیں جو زکوٰۃ و خمس وغیرہ کے پابند ہیں اور جس قدر راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں خدا ان کو اس سے کہیں زیادہ رزق عطا فرماتا ہے اور بہت سے ایسے بھی دیکھے ہیں جو اپنے مال سے حقوق واجبہ کی ادائیگی نہیں کرتے اور دن بدن بدحالی کی طرف ان کے قدم بڑھتے ہیں

حلال کھانے والے اور حقوق مالیہ کے ادا کرنے والے بالعموم آفاتِ سماویہ و ارضیہ سے اللہ کی امان میں ہوتے ہیں اور حرام کھانے والے اور حقوق کے ادا کرنے سے جی چرانے والے آفاتِ ارضیہ وسماویہ میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ہاں اگر بعض اوقات ایسے لوگوں میں کوئی عذاب خدا نہ بھی آئے تو اس کو اللہ کی رضامندی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ خدا اس کے وبال و عذاب کو آخرت پر ملتوی کر دیتا ہے جیساکہ نمرود و شداد و فرعون و ہامان وغیرہ کی مثالوں سے خدا نے قرآن مجید میں تصریح فرما دی ہے پس انسان پر لازم ہے کہ اپنے مال سے اپنی دنیا و عقبیٰ کی فلاح و بہبود کا انتظام کرے۔

راہ خدا میں مال حلال کے خرچ کرنے والے کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے لہذا اس کی زندگی اطمینان سے گزرتی ہے لیکن بخل کرنے والا اور اپنے حقوق واجبہ کی ادائیگی سے گریز کرنے والا چونکہ اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا لہذا کبھی اس کو چین نصیب نہیں ہوتا۔

نیز سخی عقبیٰ کی فلاح کے علاوہ دنیا میں نیک نام زندگی بسر کرتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اپنا ذکرِ خیر چھوڑ جاتا ہے اور بخیل آخرت کا عذاب خریدنے کے علاوہ دنیا میں بھی بدنام ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی مستحق لعن و طعن رہتا ہے اسی طرح راہِ خدا میں خرچ کرنے کا عادی قناعت کی دولت سے فیض یاب ہو کر اللہ کی عطا کردہ نعمت پر راضی رہتا ہے لیکن بخیل کے حرص میں اضافہ اور اس کی ہائے ہائے میں روز افزوں ترقی ہوتی ہے خواہ خزائن کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو۔ (راہِ خدا میں) خرچ کرو اپنے پاکیزہ کسب سے اور اُن چیزوں سے جو پیدا کیں ہم نے

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

تمہارے لئے زمین سے اور نہ قصد کرو بُرے مال کا ۔ کہ اس سے خرچ کرو حالانکہ تم خود ایسی چیز

بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾

کا اپنا پسند نہیں کرتے مگر بصورت چشم پوشی اور جان تو تحقیق اللہ غنی (اور) لائق حمد ہے

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ

شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تم کو بُرائی کا اور خدا تم سے وعدہ

مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾

بخشش و زیادتی کرتا ہے اور اللہ صاحب وسعت و علیم ہے

رکوع نمبر ۵

طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ ۔ مفسرین نے پاکیزہ کسب سے مراد تجارت لیا ہے کیونکہ جناب رسولؐ خدا سے مروی ہے۔ رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں ہیں اور ایک حصہ باقی کسبوں میں ہے اور آپ سے پاکیزہ رزق کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا۔ اس سے مراد ہے انسان کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور نیکی سے خرید و فروخت کرنا اس مقام پر اپنی حلال کمائی اور زمین کی پیداوار سے راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم ہے لیکن فرماتا ہے کہ جو چیز دو اچھی دو۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ کا مقصد یہ ہے کہ اپنے مال سے ردّی اور نکمّی چیز کو راہ خدا میں نہ دو۔ چنانچہ متعدد احادیث میں وارد ہے کہ بعض لوگ جناب رسولخدؐا کے زمانہ میں بھی جب کھجوروں کی زکوٰۃ (صدقہ) ادا کرتے تھے تو اچھی کھجور رکھ لیتے تھے اور ردی کھجور صدقہ میں پیش کرتے تھے جس کی گٹھلی موٹی اور اوپر معمولی سا چھلکا ہوا کرتا تھا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسا نہ کیا کریں اور فرماتا ہے کہ ایسی چیزیں راہِ خدا میں نہ دو کہ اگر وہ تم کو لینی پڑ جائیں تو تم ان کو لینے سے گریز کرتے ہو اور بادل نخواستہ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہو۔

تفسیر برہان میں مروی ہے کہ ابراہیمؒ نخعی کا گذر ایک عورت سے ہوا کہ اپنے گھر کے دروازہ پر بیٹھ کر صبح سویرے

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ

دیتا ہے حکمت جسے چاہے، اور جو بھی حکمت دیا جائے پس اس کو گویا

خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

خیر کثیر دی گئی۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر صاحبانِ عقل و دانش

چرخہ کات رہی تھی اور نام اس کا ام بکر تھا۔ یہ کہنے لگا۔ اے ام بکر تو تو بوڑھی ہے اب بھی چرخہ کاتنے سے باز نہیں آتی۔ وہ کہنے لگی کہ میں اس کام کو کیسے چھوڑ دوں حالانکہ میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے اپنے کانوں سُن چکی ہوں کہ چرخہ کاتنا پاکیزہ رزق ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ۔ روایاتِ امامیہ میں اہلبیت طاہرین سے حکمت کی تفسیر اطاعتِ خدا، معرفتِ امام اور گناہوں سے اجتناب کی گئی ہے اسی طرح خیر کثیر سے مراد بھی معرفتِ ولایت آئمہ طاہرین علیہم السلام لی گئی ہے (برہان)

مجمع البیان میں ابن عباس و ابن مسعود سے مروی ہے کہ حکمتِ قرآن سے مراد ہے علم قرآن یعنی ناسخ منسوخ محکم، متشابہ، مقدم، موخر، حلال، حرام اور امثال وغیرہ کا علم۔ بعض نے کہا ہے کہ حکمت کا مطلب ہے گفتار و کردار کی صحت۔ اسی طرح علم دین، نبوت، معرفت فہم، خوف خدا، اور قرآن و فقہ، مفسرین نے حکمت سے مراد لئے ہیں۔

جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ خدا نے مجھے قرآن و حکمت عطا فرمائی ہے اور جس گھر میں حکمت نہیں وہ گھر برباد ہے اللہ سے ڈرو، فقہ حاصل کرو اور علم سیکھو تاکہ جاہل ہو کر نہ مرو۔

اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حکمت کا معنی ہے معرفت اور دین میں فقہ حاصل کرنا پس جس نے فقہ حاصل کر لی وہ صاحب حکمت ہے اور کسی مومن کی موت ابلیس کو ایک فقیہ کی موت سے محبوب تر نہیں ہے۔

اور جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر جو نعمات تقسیم فرمائی ہیں ان میں عقل و علم سے بہتر اور کوئی نعمت نہیں ہے کیونکہ عاقل (عالم) کی نیند جاہل کی شب بیداری سے افضل ہے۔ عاقل (عالم) کا گھر رہنا، جاہل کے سفر سے بہتر ہے، اور خدا نے کسی نبی و رسولؐ کو مبعوث نہیں فرمایا۔ جب تک کہ اس کو عقل و علم میں کامل نہیں کیا۔ اور نبی کا عقل و علم تمام امت کے عقول و علوم سے افضل ہوتا ہے اور انبیاء کی پوشیدہ باتیں کوشش کرنے والوں کی ظاہری کوششوں سے بہتر ہوا کرتی ہے اور کسی انسان کا فریضہ کو ادا کرنا درست نہیں انجام پاتا۔ جب تک اس کو اس کا علم نہ ہو اور تمام عبادت گذار مل کر بھی عبادت کا وہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جو ایک عالم کو عطا ہوتا ہے اور انہی کو خدا نے أُولُو الْأَلْبَابِ کہا ہے اور حضرتِ صادقؑ سے منقول ہے کہ حکمت، معرفت کا نور، تقویٰ کی میراث، سچائی کا پھل ہے اگر میں کہوں کہ نعماتِ خداوندی میں سے کوئی نعمت نعمتِ حکمت سے زیادہ قیمتی اور بلند تر نہیں ہے تو بجا ہوگا۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ

اور جو بھی تم خرچ کرو کوئی خرچ یا جو بھی تم نذر مانو کوئی نذر۔ پس تحقیق اللہ۔ اس کو جانتا ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا اگر تم ظاہر بظاہر دو صدقے تو خوب ہے اور

اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ

اگر خفیہ طور پر دیدو فقراء کو تو وہ بہتر ہے تمہارے لئے اور وہ کفارہ ہوگا تم سے تمہاری

سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ

برائیوں کا۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے نہیں ہے تیرے اوپر واجب ان کا راہ ہدایت پر لانا

اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ

اللہ راہ ہدایت پر لاتا ہے جسے چاہے اور جو کچھ تم خرچ کرو کار خیر میں وہ تمہارے اپنے لئے ہی ہے اور تم نہیں خرچ کرتے

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

مگر واسطے طلب رضائے خدا کے اور جو بھی تم خرچ کرو کار خیر میں (اس کا بدلہ) پورا دیا جائیگا تمہیں اور تم کو کوئی خسارہ نہ دیا جائے گا۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ۔ یعنی انسان جو بھی خیرات کرے خواہ صدقہ واجبہ ہو یا مستحبہ اور جو بھی نذر کرے۔ خدا سب کو جانتا ہے اور اس کے بعد فرماتا ہے کہ ظالمین کا مددگار کوئی نہ ہوگا۔ مقصد یہ ہے۔ اگر صدقہ و نذر میں ظلم کرے گا۔ مثلاً صدقہ ریاکاری کے لئے کرے یا مال حرام سے کرے یا کسی اور غرض باطل کے پیش نظر کرے اور اسی طرح نذر اور منت خدا کی نافرمانی میں کرے اور کسی ناجائز کام کیلئے کرے یا نذر غیر طریق شرعی سے کرے تو خدا اس کی سزا دے گا اور اس کا کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا پس اگر نیت نیک سے نیک کام کرے تو مستحق جزا... ورنہ مستحق سزا ہوگا۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ظاہر بظاہر جن صدقات کا دینا بہتر ہے اس سے مراد صدقات مستحبہ ہیں اور اسی مضمون کی امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی متعدد روایات منقول ہیں اور تفسیر مجمع البیان میں خفیہ طور پر اور چھپا کر صدقہ دینے کے متعلق منقول ہے کہ چھپا کر صدقہ دینا اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور گناہوں کو اسطرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اور ستر قسم کی مصیبتوں کو دور کرتا ہے اور نیز معصوم نے فرمایا کہ سات قسم کے

آدمیوں کو خدا بروز محشر اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے گا جس دن اس کے سوا اور کوئی سایہ کا مقام نہ ہوگا (۱) امام عادل (۲) جوان عبادت گذار (۳) مساجد سے محبت رکھنے والا (۴) وہ دو شخص جو خوشنودئ خدا کے لئے ایک دوسرے سے محبت کریں اور اسی بنا پر ان کی باہمی نشست و برخاست ہو (۵) وہ مرد جس کو حسن و جمال والی عورت بدکاری کی دعوت دے اور وہ خوف خدا کو ملحوظ رکھ کر اس کو ٹھکرا دے۔ (۶) وہ شخص جو خفیہ طور پر اور چھپا کر صدقہ دے حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کے فعل کی دائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو (مقصد یہ ہے کہ اس کے قریب ترین رشتہ دار اور دوست بھی مطلع نہ ہو سکیں (۷) وہ شخص جو عالم تنہائی میں خدا کو یاد کر کے روئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ۔ مقصد یہ ہے کہ صدقات کے ادا کرنے کا طریقہ آپ ان کو بیان فرما دیں۔ اس کے بعد وہ عمل کریں یا نہ کریں۔ اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔ آپ کا کام ہے صرف راہ دکھا دینا۔ ان کو مجبور کر کے راہِ راست پر لانا آپ کا فریضہ نہیں ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا۔ یعنی اے مومنو! تمہاری تو شان ہی یہی ہے کہ صرف خوشنودئ خدا کے پیش نظر تم خرچ کرنے والے ہو اور تمہاری شان سے بعید ہے کہ ریاکاری یا احسان جتلانے یا اذیت دینے کے لئے تم خرچ کرو اور ممکن ہے جملہ خبر اور معنی انشاء میں ہو۔

بحار الانوار ج ۱۵ باب السخاء جمیل بن دراج نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تمہارے اچھے وہ ہیں جو سخی ہوں اور تمہارے بُرے وہ ہیں جو بخیل ہوں۔ برادرانِ ایمانی سے حسن سلوک اور ان کی حاجت برآری عمل صالح ہے اور شیطان کی ذلت دوزخ سے دُوری اور بہشت میں داخلے کا وسیلہ ہے پس یہ حدیث اپنے برگزیدہ صحابیوں تک پہنچا دینا جمیل نے عرض کی! حضور! پسندیدہ و برگزیدہ اصحابی کون ہے؟ تو فرمایا کہ جو برادرانِ ایمانی کے ساتھ تنگی و خوشحالی میں احسان سے پیش آئیں۔ آپ نے فرمایا۔ جو شخص اپنے مال سے حق واجب نکال کر مستحقین تک پہنچا دے وہ سخی ہے اور جو حقوق واجبہ ادا نہ کرے وہ بخیل ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ نیکی کے راستے تین ہیں۔ سخاوت، خوش گفتاری اور صبر۔ جناب رسالتمآبؐ نے عدی بن حاتم طائی سے فرمایا کہ تیرے باپ کو سخاوت نے عذاب شدید بچا لیا ہے نیز آپ نے چند واجب القتل لوگوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا اور ان میں سے ایک کو مستثنیٰ قرار دیدیا تو اس شخص نے اپنے قتل نہ کئے جانے کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے بذریعہ وحی اطلاع ملی ہے کہ تو سخی ہے لہٰذا تجھ سے قتل کی سزا مرفوع ہے پس فوراً اس نے کلمۂ شہادتین جاری کیا اور مسلمان ہو گیا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ سخاوت نے اس کو جنت تک پہنچا دیا۔

مروی ہے کہ سخی نوجوان جو اپنے گناہوں کا معترف ہو۔ اس سن رسیدہ عابد سے اللہ کو محبوب تر ہے جو بخیل ہو جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ لوگ چار قسموں پر ہیں۔ سخی، کریم، بخیل اور لئیم۔ (۱) سخی وہ ہے جو خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے (۲) کریم وہ ہے جو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دے یعنی خود نہ کھائے اور دوسروں کو کھلائے (۳) بخیل وہ ہے جو خود

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى

(یہ صدقات) ان فقراء کے لئے ہیں جو بند ہو گئے ہوں اللہ کے راستہ میں جو نہ طاقت رکھتے ہوں کسی طرف

الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ

جانے کی زمین میں۔ جاہل سمجھتے ہوں کہ وہ غنی ہیں۔ بوجہ ترک سوال کے۔ تم ان کو پہچانو گے ان کی علامتوں سے

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے گڑگڑاتے ہوئے۔ اور جو بھی خرچ کرو۔ کار خیر میں تحقیق اللہ اس کے جاننے والا ہے۔

کھائے اور دوسروں کو کچھ نہ دے (۴) لئیم وہ ہے جو نہ خود کھائے اور نہ دوسروں کو کھانے دے۔

لِلْفُقَرَآءِ۔ اس سے پہلی آیات میں صدقات کی ترغیب وثواب اور دینے کا طریقہ وغیرہ بیان فرمایا۔ اس آیت مجیدہ میں صدقہ کے مصرف کا ذکر ہے کہ تمہارے صدقات ایسے فقراء کو ملنے چاہئیں۔ جو راہ خدا میں بند ہوں۔ یعنی عبادتِ خدا یا تحصیلِ علوم دینیہ یا اسی قسم کے اور مشاغل شرعیہ میں وہ اس قدر مصروف ہوں کہ نہ تجارت کر سکیں۔ اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے کسب معاش کر سکیں اور سوال کرنا بھی پسند نہ کرتے ہوں۔ جاہل لوگ ان کے سوال نہ کرنے سے ان کو غنی سمجھیں حالانکہ ان کے چہروں اور جسمانی کمزوری کی علامتوں سے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ مستحق ہیں۔

دورِ حاضر میں یہ صفت صرف دینی مدارس کے دینی طلبہ میں ہی پائی جاتی ہے جو موجودہ لادینیت کی بڑھتی ہوئی رفتار کی زد سے بچ کر اور لامذہبیت کی عام رَو سے علیحدہ ہو کر علم دین کی تحصیل میں شب و روز مصروف ہیں۔ نہ تو ان کے پاس خود کمانے کا وقت ہوتا ہے اور نہ دیگر مسلمانوں کے مدارس کے طلبہ کی طرح بھیک مانگ کر غیرت کشی کو پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ان پر صدقات وغیرہ کا خرچ کرنا سب سے بہتر اور افضل ہے۔

حدیث میں ہے کہ خدا اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند فرماتا ہے اور بدحالی کے اظہار کو ناپسند فرماتا ہے اور اپنے بندوں سے حلیم خود دار کو محبوب رکھتا ہے اور سائل بے حیا کو مبغوض رکھتا ہے۔ نیز فرمایا کہ خدا تین چیزوں کو ناپسند کرتا ہے (۱) قیل وقال (۲) کثرتِ سوال (۳) تضییع مال۔ اور فرمایا: ہاتھ تین ہیں۔ اللہ کا ہاتھ بلند ہے اور دینے والے کا ہاتھ اس کے نیچے ہے اور مانگنے والے کا ہاتھ قیامت تک پست ہی رہے گا اور فرمایا کہ کفایت کے باوجود جو سوال کرے بروز محشر اس کا چہرہ بدنما ہو گا اور اس پر خراش کے نشان ہوں گے۔

اسلام اور سرمایہ داری

اسلام نے سرمایہ داری کی بدترین انسانیت سوز لعنت کو ختم کرنے کا جس قدر اہتمام فرمایا ہے شاید کسی دین وملت میں اس کی نظیر نہ مل سکے۔ لہٰذا اپنی ضرورت سے فالتو رقم کو ذخیرہ کرنے کی جا بجا مذمت فرمائی اور فقراء و تنگ دست لوگوں پر خیرات کرنے کی تاکید فرمائی اور لوگوں کو پیسہ خرچ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے۔ کہیں وجوب کا حکم دیا اور کسی مقام پر استحباب وسنّت قرار دیا۔

خمس وزکوٰۃ کے رنگ میں، کفّارات کے ضمن میں، فدیے کی صورت میں، صدقاتِ واجبہ ومستحبہ کے طریق پر، اوقاف کے ذریعے سے اور وصیّت وہبہ، یا بخشش وہدیہ وغیرہ کے لباس میں بہر کیف خرچ کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ مدّات قرار دے کر متموّل طبقہ کو ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری سے باز رہنے کی دعوت دی ہے تاکہ مال ودولت انسانوں میں دست بدست چلتی پھرتی رہے اور کہیں ایک جگہ رُک نہ جائے اور تمام بنی آدم اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکیں اور انسانوں کے پست ونادار طبقہ کی زندگی کی سطح مالدار طبقہ کی دست گیری کی بدولت بلند ہو کر اہلِ ثروت کے برابر نہ سہی تو کم از کم ان سے ملتی جُلتی ہو جائے اور جہاں ایک طرف صاحبانِ ثروت کو نادار لوگوں پر اپنے سرمائے سے خرچ کرنے کے احکام جاری فرمائے وہاں اُن کو اسراف وفضول خرچی سے روکتے ہوئے عیش پسندیوں اور رنگ رلیوں میں پیسہ اڑانے، بلکہ ہر قسم کے فاخرانہ اور متکبرانہ انداز سے باز رہنے کی اُن کو تلقین بھی کر دی۔

ایک طرف غرباء کی زندگی کی سطح کو صاحبانِ ثروت کی امداد سے بلند کرنا اور دوسری طرف مالداروں کو انتہائی بلند اور چوٹی کی زندگی بسر کرنے عیاشیوں میں پیسہ اڑانے اور ناز ونعمت کے مسرفانہ مظاہروں سے روک دینا صرف اس لئے ہے کہ انسانی زندگی ایک متوسّط سطح پر ہو اور تمام افراد ایک دوسرے کے قریب قریب رہ کر ملتی جلتی زندگی بسر کر سکیں۔ اور کینہ، بغض، حسد اور اس قسم کی قلبی کدورتوں، دماغی کوفتوں اور ذہنی آفتوں اور ناپاک ارادوں سے نوعِ انسانی کی گلو خلاصی ہو سکے اور ان کی بجائے یک جہتی، یگانگت اور اتحاد وتعاون کا جذبہ کار فرما ہو جائے تاکہ انسانی تمدّن اپنے فطری تقاضوں اور طبعی حدوں پر جلوہ گر ہو کر عالم کو امن وآرام اور سکون واطمینان کا گہوارہ بنا دے کیونکہ اسلام کی نظر صرف اصلاحِ آخرت پر محصور نہیں بلکہ وہ انسان کے لئے ایک ایسے لائحہ عمل کی تشکیل کرتا ہے جس سے انسانی زندگی کے دنیاوی واُخروی ہر دو شعبوں کی اصلاح ہو سکے۔ لہٰذا قرآن کریم نے اسلام کا جو نظریہ ہمارے سامنے رکھا ہے اس میں دین ودنیا کی خیر وخوبی اور دارِ فانی اور عالمِ جاودانی ہر دو کی بھلائی وبہبودی کا راز مضمر ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مطمح نظر انسان کو صحیح انسانیت سکھانا ہے تاکہ وہ آئے دن کی شورشوں سے محفوظ رہ کر اپنی پاکیزہ زندگی کو اخلاق فاضلہ اور عادات لائقہ سے آراستہ کر سکے اور انسانی عائد شدہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے پر پوری طرح موفق ہو جائے۔ تاکہ زمین اللہ کی مال و متاع سب اللہ کا شمار ہو اور تمام مومن بھائی بھائی ہو کر اس میں بسر اوقات کریں۔ اور سیرت نبویہ نے اسی نوعیت کی زندگی کا رواج قائم کیا جو آپ کے حین حیات تک ہی قائم رہ سکا۔ اور آپ کی رحلت کے بعد شہوات و جذبات کے ناخدا ترس ہاتھوں نے فوراً ہی اس کا گلا دبا دیا۔ جس کے متعلق حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے دردمند دل کے تاثرات کا تاسف و تحیر کے لہجہ میں یوں اظہار فرمایا ہے۔

"تمہیں وہ زمانہ نصیب ہوا ہے کہ نیکی میں ادبار اور برائی میں اقبال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ شیطان لوگوں کی تباہی کی تاک میں ہے اور اس زمانہ میں وہ طاقت پکڑ چکا ہے، اس کی مکاری مقبول عام اور اس کے شکار کا پھندا ہمہ گیر ہو رہا ہے تم لوگ جس طرف نظر اٹھا کے دیکھو تو کسی فقیر پر نظر پڑے گی جو فقر و فاقہ کی سختیوں میں مبتلا ہوگا، یا مالدار دیکھو گے جو کفران نعمت میں گرفتار ہوگا۔ کہیں بخیل اپنے بخل کو توانگری اور زیادتی مال و دولت کا ذریعہ بنا رہا ہے اور کسی جگہ متمرد و سرکش وعظ و نصیحت سے کانوں کو بند کئے ہوئے ہے۔ (نہج البلاغہ)

قرآن کا تمام انسانوں کو متوسط سطح پر لانے کا ہمہ گیر نظریہ حقیقت اور صداقت کے ایسے پائیدار اصولوں پر مبنی تھا جن کو کسی دور میں غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا اور اس کی مصلحتیں اس کے احکام کی پائیدار اور ٹھوس بنیادیں ہیں۔ جو تا قیامت اپنی استواری کی بناء پر انہدام پذیر نہیں ہو سکتیں۔ انسانوں کے نچلے طبقہ کو اوپر لانے اور اوپر کے طبقہ کو اسراف سے روک کر سرنگوں رہنے کا پروگرام آمریت و ملوکیت اور اشتراکیت[1] و شیوعیت[2] کے بین بین ایک ایسا ہموار اور آسان راستہ تھا جس پر چل کر تمدن انسانی کبھی ٹھوکریں نہ کھاتا اور مقتضائے انسانیت کبھی پامال نہ ہوتا۔ مغربی تہذیب کا جب سے افق مشرق پر طلوع ہوا ہے، حیوانی شہوات، بہیمی خواہشات اور نفسی لذات میں افراط و انہماک نے انسانیت کو زندہ درگور کر کے رکھ دیا ہے، انسانی دماغ متاع انسانیت انہی لذات کو قرار دے چکا ہے اور ہر ممکن طاقت انہی کی تحصیل پر خرچ کرنا زندگی کی کامیابی سمجھتا ہے۔ جس کے نتیجے میں صاحبان دولت و ثروت کے دروازہ پر ہر قسم کے لذائذ نے ڈیرہ جما لیا ہے اور نچلا طبقہ اپنے حرمان کے دامن میں منہ ڈال کر آہ حسرت و چشم عبرت سے گریہ کناں و نالاں ہے لیکن اوپر کا طبقہ بھی مطمئن نہیں بلکہ ہوس و حرص کے شکنجے میں ایسا بُری طرح پھنسا ہے کہ ایک دوسرے کو کھانے پر تُلا ہوا ہے اور مادی، دنیاوی آرام و نیک بختی کی زندگی پورے ہفت اقلیم میں چند افراد کے قبضہ میں آگئی ہے اور اکثریت صرف انہی چند لوگوں کے رحم و کرم پر زندگی کے سانس پورے کر رہی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اخلاق شریفانہ اور عادات کریمانہ کا جنازہ نکل چکا ہے اور نعمات زندگی کی چاہت میں ہر فرد اس قدر سرگرداں ہے کہ اس کی تحصیل میں اعتدال کا نام و نشان تک نہیں رہا۔ اُوپر کے طبقہ کو اپنی ظالمانہ روش ماتحتوں کے طغیان سے مطمئن نہیں ہونے دیتی اور نچلا طبقہ ہر وقت استبدادی

[1] کیمونزم [2] سوشلزم

شکنجے سے جی چھڑانے کی فکر میں ہے۔ پس دونوں طبقے مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہو گئے ہیں اور اندرونی طور پر ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن بن چکے ہیں۔ اور بسا اوقات غنی و فقیر کا یہ تصادم، امیر و غریب میں یہ تفاوت، اور صاحب ثروت اور فاقہ مست میں یہ تنافر بڑے سے بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے اور مالدار اور غنی طبقہ کی بے راہ روی ہی نچلے طبقہ میں اشتراکیت و شیوعیت کے انسانیت سوز اور شرمناک نظریئے کو جنم دے دیتی ہے اور دورِ حاضر میں کمیونزم کا یہ ہمہ گیر طوفان اور شیوعیت و اشتراکیت کا جاذبِ طبع بحران و طغیان اسی ناجائز سرمایہ داری اور غلط ذخیرہ اندوزی کا شاخسانہ ہے ورنہ اگر قرآنی اصولوں پر عمل کیا جاتا اور نچلے طبقہ کو بھی کسی حد تک جینے کے حقوق دیئے جاتے تاکہ وہ بھی چند روزہ زندگی میں اطمینان کا سانس لے سکیں تو یقیناً کمیونزم کو اس قدر پر و بال پھیلانے کا موقعہ نہ مل سکتا اور شیوعیت کا سیلاب اپنے منبع سے اس حیرت انگیز رفتار کے ساتھ نہ بڑھتا۔

اسلام نے اغنیاء کے مال میں فقراء کے حقوق مقرر کر کے اور سود خوری کی لعنت کو ختم کر کے دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی ہے تاکہ ان میں باہمی انس و تعاون کا جذبہ پیدا ہو اور انسان کی تمدّنی زندگی ہر قسم کے آشوب سے بالاتر ہو کر پُرامن و پُرسکون بن جائے۔

اسی نکتہ کے پیشِ نظر خداوند کریم نے سود خواری کو حرام قرار دیا اور اغنیاء کو بلا سُود قرض دینے کی ہدایت فرمائی۔ لیکن حرص و ہوس نے قلوبِ انسانی سے اسلامی اصولوں کو بہت جلد ہی مٹا کر رکھ دیا جس کی بدولت درندگی اور بہیمیت متاعِ انسانیت کو لوٹنے میں کامیاب ہو گئی اور دنیاوی زندگی امن و سلامتی کی بجائے ظلم و استبداد اور خوف و ہراس کا مرقع بن گئی۔

سود خواری، ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری کا بدترین زینہ ہے اور عالمی جنگ اسی کے خوفناک نتائج ہوا کرتے ہیں کیونکہ غریب اور پست طبقہ خواہشات و جذبات کو ضبط کرتے کرتے جب تنگ آجاتا ہے تو وہ چار و ناچار اُوپر کے طبقہ سے ٹکر لینے کے متعلق سوچتا ہے اور بالآخر باہمی تصادم کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جس سے انسانی سکون و اطمینان کا خرمن جل کر خاکستر کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے اسلام کے فروعی احکام میں سے اس قدر کسی حکم کو اہمیت سے بیان نہیں فرمایا۔ جس قدر اس نے سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے اہتمام فرمایا ہے۔

بہر کیف قرآن مجید ملکیت کو ختم نہیں کرتا، بلکہ ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے غیر مالکوں کے حقوق کی پاسداری کی تلقین فرماتا ہے۔ تاکہ مالک و غیر مالک ہر دو حقوق زندگی سے برابر حصّہ لے سکیں اور ایک دوسرے سے قریب تر رہ کر اتحاد و تعاون سے تمدّنی و اجتماعی پوزیشن کی اصلاح کر سکیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام کمیونزم کی تعلیم دیتا ہے۔ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ قرآن و اسلام پر بہتان و افترائے عظیم ہے۔ قرآن حق ملکیّت کسی سے سلب نہیں کرتا اور نہ کسی کو

کسی کی ملکیت پر دست درازی کی اجازت دیتا ہے۔ ہاں ملکیت والوں کو غیر مالکوں اور ناداروں کی رعایت کی تعلیم دیتا ہے جو انسانی حق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسانوں میں حیوانیت کی جذباتی و شہواتی طاقتیں منظم ہو کر ایک امتیازی حیثیت کی حامل بن جائیں۔ جس طرح طاقتور حیوان کمزور حیوان سے حق زندگی سلب کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں رفق و ملاطفت کا مادہ نہیں ہوتا کہ کمزور پر رحم و کرم کی نظر کر سکے اور اس کے لئے بھی جینے کا حق تجویز کرے اسی طرح اگر انسان بھی اپنی طاقت و ملکیت کے بل بوتہ پر کمزور و ناتواں طبقہ سے حق زندگی سلب کرنے کے درپے ہو اور اپنے لطف و کرم اور سخاوت و ایثار سے امتیازی شان کا مظاہرہ نہ کر سکے تو انسان و حیوان میں پھر فرق ہی کیا باقی رہتا ہے؟

اگر خدا چاہتا تو سب کو برابر و یکساں امیر و غریب پیدا کرتا لیکن اس نے اپنی مشیت و مرضی سے تفاوت اور اختلاف پیدا کر کے انسان کو آزمائش کے مقام پر کھڑا کیا ہے تاکہ اپنے اختیارات سے نیکی و بدی کے راستوں کے درمیان امتیاز کر کے آگے بڑھے۔

حضرت ابوذرؓ پر کمیونزم کے شیدائی یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ اشتراکیت کے حامی تھے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حضرت ابوذرؓ جناب رسالتمآبؐ کے وہ مقتدر و معزز صحابی تھے کہ آپ نے ان کے حق میں فرمایا تھا۔ کہ زمین و آسمان کے مابین حضرت ابوذرؓ سے زیادہ کوئی صادق اللسان نہیں ہے آپ حق ملکیت کے قائل تھے لیکن وہ مالک اور صاحبانِ ثروت و دولت جو اپنے اموال میں سے فقراء کے حقوق ادا نہ کرتے تھے۔ حضرت ابوذرؓ ان کو کبھی معاف نہیں کرتے تھے اور علی الاعلان ان کو حکم خدا سنانے میں جھجک محسوس نہ فرماتے تھے اور برملا اور برسر اجلاس اغنیاء کو حکم زکوٰۃ و خمس و جملہ حقوق مالیہ کی ادائیگی کی تلقین کرتے تھے اور ان کے یہی بے لوث کلمات اور مبنی برخلوص مواعظ ان کی جلاوطنی کے موجب ہوئے لیکن تادم زیست انہوں نے اپنے نظریہ حق کو تبدیل نہ کیا اور حکومتِ وقت کے تہدیدی پیغامات اور خلافتِ وقت کے استبدادی اقدامات باوجودیکہ ان کے لئے وبال زندگی بن گئے لیکن ان کو اپنے اصلاحی موقف اور غلط اقدامات کے خلاف احتجاجی پالیسی سے ذرہ بھر نہ ہٹا سکے۔

میں شیعانِ آلِ محمد سے گزارش کروں گا کہ اپنے میں حضرت ابوذرؓ کی سی سیرت پیدا کریں اور خصوصاً اغنیاء و مالدار طبقہ کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ایسے پاکباز صحابیٔ رسولؐ کی سیرت سے درس عمل حاصل کر کے حقوق مالیہ کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کریں اور دین و دنیا کی فلاح کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت ہماری نو تصنیف کتاب "اسلامی سیاست" میں ملاحظہ فرمائیں

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال ۔ رات اور دن کو خفیہ اور ظاہر (راہ خدا میں) پس اُن کا

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ نہ ان پہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ زندگی نہیں بسر کرتے مگر مثل زندگی بسر کرنے اس شخص کے جس کو بدحواس کردے

الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ

شیطان بوجہ مس کرنے کے ۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے ۔ حالانکہ حلال کیا ہے خدا نے

اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ

بیع کو اور حرام کیا سود کو ۔ پس جس کے پاس آجائے نصیحت اپنے رب سے ۔ پس وہ رک جائے تو اس کے لئے (معاف) ہے جو ہو چکا اور

مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہوں گے ۔ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے

رکوع نمبر ۶

سود کھانے کا گناہ اور چند مسائل

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ ۔ تفسیر برہان میں کتب فریقین سے منقول ہے کہ یہ آیہ مجیدہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے شان میں اتری ۔ آپ کے پاس چار درہم تھے اور ان کو راہ خدا میں صدقہ دیا ۔ ایک رات میں ایک دن میں " ایک پوشیدہ طور پر اور ایک اعلانیہ طور پر ۔ تب یہ آیت اتری ۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا ۔ منقول ہے کہ سود خوار بروز قیامت جب کھڑے ہوں گے تو ان کی حالت باؤلے اور دیوانے انسان کی سی ہوگی جس سے تمام اہل محشر ان کو پہچان لیں گے اور جو لوگ سود کو حلال جانتے ہیں وہ سود کو خرید و فروخت (تجارت) پہ قیاس کرتے ہیں اور کہتے ہیں تجارت میں بھی نفع لیا جاتا ہے اور وہ حلال ہے اور سود میں بھی وہی نفع ہے لہذا یہ بھی حلال ہونا چاہیئے تو خداوند کریم اس آیت میں ان کے قول کی تردید فرماتا

ہے کہ ان کا قیاس غلط ہے کیونکہ تجارت حلال ہے اور سود حرام ہے بلکہ یہ ان کی کمال حماقت ہے گویا سود خواری نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال کر ان کو اس قدر بدحواس کر دیا کہ وہ بیع اور سود میں فرق و امتیاز بھی نہیں کر سکتے۔ پس ان کی زندگی بدحواسی اور پاگل پنے کی زندگی ہے۔

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ۔ یعنی جو شخص ایک عرصہ تک سود کھاتا رہا ہو اور اس کو اس کے حرام ہونے کا علم تک نہ ہو۔ لیکن حرام ہونے کا علم ہو جانے کے بعد گذشتہ سے توبہ کر کے آئندہ اس کو بالکل ترک کر دے تو اس کی توبہ مقبول ہے۔ لیکن معلوم ہونے کے بعد بھی جو ڈٹا رہے تو وہ دائمی طور پر جہنم کا مستحق ہوگا۔

مسئلہ:۔ جو شخص باوجودیکہ اس کو علم ہو لیکن ایک عرصہ تک وہ سود کھاتا رہے اور اس کے بعد وہ توبہ کرنا چاہے تو اس پر واجب ہے کہ سابق جس قدر حرام کھا چکا ہے اس سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرے یعنی جن جن لوگوں سے جسقدر کھا چکا ہے ان کو ان کا حق واپس کرے یا اُن سے معافی مانگے اور اگر وہ مرچکے ہوں یا زندہ ہوں لیکن اس کو یاد نہ رہے ہوں یا بعض معلوم ہوں اور بعض کا پتہ نہ ہو تو ان صورتوں میں جس حد تک مالک یا اُن کے وارث معلوم ہیں ان کو اپنا حق واپس کرے یا اُن سے معافی حاصل کرے اور جو نامعلوم ہیں تو جس قدر ان کا حق معلوم ہو وہ ان کی طرف سے صدقہ کر دے اور اگر نہ مالک معلوم ہیں اور نہ ان کا حق صحیح طور پر معلوم ہے کہ کسقدر ہے تو اس صورت میں اپنے سارے مال کا خمس ادا کرے انشاء اللہ باقی اس کیلئے حلال ہوگا اور اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں سے سود لیا تھا لیکن یہ معلوم نہ ہو وہ کسقدر تھا تو اس صورت میں اس کے ساتھ مصالحانہ فیصلہ کر کے اس کو رضامند کرے۔

مسئلہ:۔ جس شخص کو سود کی حرمت کا حکم معلوم نہ ہو اور کھاتا رہے تو علم ہو جانے کے بعد جسقدر کھا پی چکا ہے وہ معاف ہے اور جسقدر مال سود اس کے پاس موجود ہے وہ اپنے مالکوں کو واپس کرے اور اس کی باقی شقوں کا حکم وہی ہے جو پہلے مسئلہ میں گزر چکا ہے

مسئلہ:۔ سود کی دو قسمیں ہیں ایک تجارت میں اور دوسرا قرضہ میں اور یہ دونوں قسمیں حرام ہیں

مسئلہ:۔ کسی شخص کو ایک مدت تک کے لئے قرضہ دے کر اس سے زیادہ کی کچھ شرط کرنا۔ مثلاً پانچ فیصدی یا دس فیصدی وغیرہ سود ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔

مسئلہ:۔ بنک میں جو پیسہ جمع کر دیا جاتا ہے اور بنک والے اپنے دستور کے مطابق جمع کرانے والے کو کچھ معین منافعہ ادا کرتے ہیں اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اولاً تو اس پر قرض کا عنوان بھی صادق نہیں آتا۔ بلکہ پیسہ کی حفاظت کے لئے ایسا کیا جاتا ہے اور ثانیاً جو کچھ بنک والے زیادہ ادا کرتے ہیں وہ اپنی مرضی سے دیتے ہیں ورنہ پیسہ جمع کرنے والے کی طرف سے یہ شرط نہیں ہوا کرتی اور ثالثاً بنک میں جمع شدہ رقوم کو تجارت وغیرہ پر لگایا جاتا ہے جس کے منافعہ کی معین مقدار مالکوں کو ادا کی جاتی ہے لہذا اس پر ربا کا صادق آنا مشکل ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ:۔ تجارت کا سود، اُن جنسوں میں ثابت ہے جن کی خرید و فروخت وزن سے ہو (جیسے سیر و من وغیرہ) یا پیمانہ سے ہو (جیسے ہمارے ہاں ٹوپہ، بڑوپی وغیرہ مروج ہے) چنانچہ بروایت زرارہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے

کہ سود صرف وزن اور پیمانہ کی چیزوں میں ہے اور بس۔

مسئلہ :۔ مذکورہ اجناس (جو ناپ یا وزن کے تحت میں ہوں) اُن میں سے ہر جنس دوسری جنس سے اگر فروخت کی جائے مثلاً گندم نخود کے بدلہ میں، یا کھجور انگور کے بدلے تو کمی یا بیشی میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن ایک جنس کا سودا اسی جنس سے ہو مثلاً گندم گندم کے بدلے، یا کھجور کھجور کے بدلے وعلیٰ ہذا القیاس تو اس صورت میں برابر برابر لینا اور دینا واجب ہے خواہ دونوں اعلیٰ جنسیں ہوں یا دونوں ادنیٰ ہوں یا ایک اعلیٰ ہو اور دوسری ادنیٰ۔ اگر عمدہ گندم کے بدلہ میں ردی گندم زیادہ لے یا اعلیٰ کھجور کے بدلہ میں ادنیٰ کھجور زیادہ وصول کرے تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔

مسئلہ :۔ مسئلہ تجارت میں گندم اور جو کو ایک جنس قرار دیا گیا ہے لہٰذا گندم اور جو کی آپس میں خرید و فروخت ہو۔ تو برابر برابر لینا دینا واجب ہے اور گندم کم دے کر جو زیادہ لینا یا جو کم دے کر گندم زیادہ لینا سود ہے۔

مسئلہ :۔ ایک جنس سے حاصل شدہ چیز اسی جنس کے حکم میں ہے لہٰذا باہمی سودا میں کمی و بیشی ناجائز ہے۔ مثلاً گندم کا آٹا گندم کے بدلہ میں برابر برابر لے دے سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک جنس کا دودھ اور اسی جنس کے دودھ سے حاصل شدہ چیزیں مکھن، گھی وغیرہ ایک ہی جنس کے حکم میں ہیں، خرید و فروخت میں ان کا تبادلہ برابر برابر ہوگا۔ زیادتی سُود ہوگی۔ وعلیٰ ہذا القیاس

مسئلہ :۔ سونے کا سونے سے تبادلہ، اسی طرح چاندی، چاندی کے بدلہ میں برابر برابر لینا واجب ہے۔ خواہ ایک سونا بیش قیمت اور دوسرا کم قیمت ہی ہو۔ اور اسی طرح چاندی بھی، خواہ ایک عمدہ اور دوسری غیر عمدہ ہو۔ کم دے کر زیادہ لینا سُود ہے۔

مسئلہ :۔ یہ چیزیں جن پر سود صادق ہے۔ اس میں فرق نہیں کہ سودا نقد ہو یا ادھار ہر دو صورت میں زیادتی سُود شمار ہوگی۔

مسئلہ :۔ احادیث میں وارد ہے کہ جو شخص تجارت کرنا چاہے اس کو چاہیئے کہ تجارت کے مسائل معلوم کرے ورنہ بعید نہیں کہ وہ سود میں مبتلا ہو جائے۔

سود کھانے والے کا عذاب

(۱) سود کھانے والا میدان محشر میں نہایت بدترین حالت میں پیش بارگاہ رب العزت ہوگا۔ جس طرح کہ مخبوط الحواس اور دیوانے ہوتے ہیں اور یہ ان کی سود خواری کی علامت ہوگی جس سے تمام محشر والے جان لیں گے کہ یہ سود خوار تھا بلکہ مروی ہے کہ ہر بدکار کے اُوپر اس کی برائی کی مخصوص نشانی ہوگی جس سے وہ پہچانا جائے گا اور اسی طرح ہر نیکی کرنے والے کے چہرہ

پر مخصوص علامت ہو گی جس سے اس کی اہمیت و عظمت معلوم ہو گی۔

(۲) سود خوار کو خداوند کریم نے کفّار اور اثیم کے سخت لفظوں سے موسوم کیا ہے یعنی سود خوار بڑا کافر اور بڑا گنہگار ہے اور جس کو خدا بڑا کافر یا بڑا گنہگار کہے تو اس کا ٹھکانا ہی کیا ہو سکتا ہے مگر یہ کہ توبہ کر کے اپنے گناہ کی معافی لے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔

(۳) سود کھانے والا ایسا ہے جیسا کہ خدا و رسول سے نبرد آزما ہو اور لڑ رہا ہو۔ چنانچہ بعد والی آیت میں صاف طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔

(۴) جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ شب معراج میں جہنّمیوں کو دیکھا ان میں کئی ایسے آدمی تھے جن کے پیٹ بہت بڑے تھے اور ان کے اندر سے سانپ نظر آرہے تھے۔ میں نے جبریل سے دریافت کیا۔ کہ یہ کون لوگ ہیں تو اس نے کہا کہ یہ وہ ہیں جو دنیا میں سود کھاتے ہیں۔ (مجمع البیان)

(۵) آپؐ سے مروی ہے کہ شب معراج میں نے جہنّمیوں میں کئی لوگوں کو دیکھا کہ اُن کے پیٹ بہت بڑے تھے کہ وہ اٹھ نہ سکتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ تو جبریل نے جواب دیا کہ سود خوار ہیں جو میدان محشر میں مخبوط الحواس اٹھیں گے اور یہ لوگ فرعونیوں کی طرف صبح و شام جہنّم کا مزہ چکھتے ہیں۔ الخبر (مجمع البیان)

(۶) حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے سود کے معاملہ میں پانچ قسم کے آدمیوں پر لعنت بھیجی ہے۔

(۱) سود کھانے والا (۲) اس کا کھلانے والا (۳،۴) سود لینے اور دینے کے دو گواہ (۵) سود کا تحریر نامہ لکھنے والا۔ (مجمع البیان)

(۷) آپؐ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بستی پر عذاب نازل فرمانا چاہتا ہے۔ تو ان میں سود خواری زیادہ ہو جایا کرتی ہے (مجمع البیان)

(۸) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں کہ کم از کم درجے کا گناہ ایسا ہے جیسا کہ اپنی ماں سے کعبہ میں زنا کیا جائے (برہان)

(۹) جمیل بن دراج نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ سود کے ایک درہم کا گناہ اللہ کے نزدیک اُن ستّر زنا کے گناہ سے زیادہ ہے جو اپنی ماں، بہن، پھوپھی وغیرہ سے کعبہ کے اندر کیا جائے۔ (برہان)

(۱۰) جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ میری امت پر ایک دور آئے گا کہ سود کھانے سے کوئی نہ بچے گا اور اگر کوئی بچے گا تو اس پر بھی سود کی کچھ نہ کچھ گرد تو پڑ ہی جائے گی۔ (مجمع البیان)

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ

مٹاتا ہے خدا سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو اور اللہ نہیں محبوب رکھتا ہر بڑے کافر

اَثِيمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

گنہگار کو تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل بجا لائے اور قائم کی نماز

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور زکوٰۃ ادا کی۔ ان کے لئے ان کا اجر ہے نزدیک اپنے رب کے اور نہ ان پر خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا

اور نہ وہ محزون ہوں گے اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو وہ

بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

جو باقی ہے سود سے اگر تم (سچے) مومن ہو

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا۔ زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں سود کو مٹاتا ہوں اور صدقات کو بڑھاتا ہوں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سود کھانے والوں کا مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مٹانا اور کیا ہوگا کہ سود کا ایک درہم دین کو مٹا دیتا ہے اور اگر وہ اس سے توبہ کرے گا تو اس کا مال جاتا رہے گا اور وہ تنگ ہو جائے گا (مقصد یہ ہے کہ جب سود خوار توبہ کرے گا تو اس کو غیر کا حق جو کھا چکا ہے وہ تو واپس مالکوں کو دینا پڑے گا۔ لیتے وقت تو اس نے تھوڑا تھوڑا لیا تھا اور دیتے ہوئے اس کو اکٹھا دینا پڑے گا۔ لہذا لازمی طور پر اس کے جمع شدہ مال پر اثر پڑے گا اور وہ تنگدستی تک پہنچ جائے گا۔)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ ہر چیز پر فرشتے مامور ہیں سوائے صدقہ کے۔ کیونکہ اس کو خدا خود اپنے دستِ قدرت میں لیتا ہے اور اس کی پرورش فرماتا ہے جس طرح تم اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہو اور قیامت کے دن جب تم کو دیا جائے گا یعنی اس کی جزا دی جائے گی تو مثل کوہ احد ہوگا۔ (برہان)

نیز جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ کوئی مال صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا (جیسا کہ آیت مجیدہ میں خداوند عالم خود وعدہ فرما رہا ہے۔ کیونکہ آیت کا ظاہر یہی بتلاتا ہے کہ دنیا میں بھی صدقہ مال کو بڑھانے کا سبب ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ شانِ نزول، اس آیت کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ ایام جاہلیت میں سود کا معاملہ کیا کرتے

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

پس اگر ایسا نہ کرو تو تیار رہو اللہ اور رسول سے لڑنے کے لئے اور اگر توبہ کرو تو تمہارے

رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ

لئے تمہاری اصل پونجی ہے۔ نہ ظلم کرو اور نہ ظلم کئے جاؤ اور (تمہارا مقروض) تنگ دست ہو۔ تو مہلت

اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا

تا زمان خوشحالی (ان کو دو) اور تمہارا صدقہ کر دینا زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو اور ڈرو اس دن سے کہ

تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۖ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۶

پلٹائے جاؤ گے اسمیں اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر نفس کو اپنا کمایا ہوا اور نہ خسارہ دیئے جائیں گے

تھے اور ان کی سود کی کافی رقوم ان کے مقروضین کے ذمہ تھیں اور اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنی سودی رقوم کا مقروض حضرات سے مطالبہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اس سے پہلے جو کچھ کھا چکے ہو وہ معاف ہے اور جو کچھ تمہارے سود کا بقایا اُن کے ذمہ ہے اُس کو چھوڑ دو۔ اور اگر پھر بھی باز نہ آؤ تو پھر تمہاری خدا و رسولؐ سے جنگ ہے ہاں اگر توبہ کر لو تو صرف اپنے مقروض لوگوں سے اپنی اصل رقم واپس لے لو اور زیادہ کا مطالبہ نہ کرو۔ اس میں ان کو خسارہ دو اور نہ تم پر کوئی خسارہ ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ ۔ اس سے پہلے تو فرمایا کہ قرضہ وصول کرتے وقت صرف اپنی اصلزر واپس لو اور سود چھوڑ دو، اب فرماتا ہے کہ اگر تمہارے مقروض غریب و تنگدست ہوں کہ تمہیں فوری طور پر عندالمطالبہ اصلزر بھی واپس نہ دے سکتے ہوں تو ان کو تنگ نہ کرو۔ بلکہ ان کی میعاد بڑھا دو، جب ان کے پاس پیسہ آجائے اور وہ خوش حال ہو جائیں تب ان سے مطالبہ کرو اور اگر ان کو ان کی تنگدستی کے پیش نظر معاف کر دو، تو تمہارے لئے اور زیادہ بہتر ہے۔

مسئلہ :۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ سود کھانے والے پر اگر ثابت ہو جائے کہ اس نے سُود لیا ہے تو اُسے تادیب کی جائے اگر دوبارہ کرے تو دوبارہ تادیب کی جائے اور اگر سہ بارہ کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے

(مجمع البیان)

مسئلہ :۔ اگر کوئی شخص سود کھانے کی حرمت کا انکار کرے تو وہ کافر اور واجب القتل ہو جاتا ہے۔

مقروض تنگدست کو مہلت دینا

اس کے متعلق تفسیر برہان میں کافی روایات درج ہیں۔ چند ایک کا ذکر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) جناب رسالتمآبؐ ایک روز منبر پر تشریف لائے حمد و ثنا پروردگار اور درود بر انبیائے اطہار کے بعد فرمایا:۔ ایھا الناس تم میں سے جو حاضر مجلس ہیں ان کو چاہیئے کہ غیر موجود لوگوں کے کانوں تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ جو شخص کسی تنگدست مقروض کو مہلت دے گا تو خدا کے نزدیک اس کا وہ روپیہ ہر روز کا صدقہ اور خیرات شمار ہوگا۔

(۲) امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ جو شخص بروز محشر عرش خدا کے سایہ کا امیدوار ہو کہ جس دن اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس کو چاہیئے کہ تنگدست کو مہلت دے اور اس پر سے اپنا حق اٹھالے۔

(۳) امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ جو شخص جہنم کے تیز شعلوں سے بچنا چاہے اُسے چاہیئے کہ تنگدست کو مہلت دے۔ الخبر۔

(۴) جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ بروز محشر خداوند عالم چند لوگوں کو زیر عرش جگہ کرامت فرمائے گا کہ ان کے چہروں سے نور ساطع ہوگا۔ نورانی لباس سے آراستہ ہو کر نور کی کرسیوں پر وہ جلوہ گر ہوں گے پس باقی مخلوق ان کی کرامت و عزت کو دیکھ کر عرض کرے گی کہ کیا یہ لوگ نبی ہیں؟ تو زیر عرش سے منادی ندا کرے گا کہ یہ نبی نہیں ہیں۔ پھر پوچھا جائے گا کہ کیا یہ لوگ شہداء ہیں؟ منادی کی طرف سے جواب ملے گا کہ یہ شہداء بھی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں مومنوں کو خوشحال کیا تھا یا تنگدست مومنوں کو خوش حالی تک کی مہلت دی تھی۔

مسئلہ: تنگدست انسان کو مہلت دینا واجب ہے اور تنگدستی کی حد یہ ہے کہ اپنے اور بال بچوں کے درمیانہ گذر اوقات سے اس کے پاس زائد مال نہ ہو کہ وہ اس کو قرضہ میں ادا کرے اور مقروض پر واجب ہے کہ اگر اس کے پاس مال موجود ہو اور قرضہ کی میعاد آجائے تو اوّلین فرصت میں اپنے قرضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرے اور خواہ مخواہ قرضخواہ کو بار بار کے مطالبہ کی زحمت نہ دے۔

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے مروی ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں سے سب سے آخر نازل ہونے والی آیات یہی ہیں جن میں سود کا حکم بیان کیا گیا ہے اور تفسیر برہان میں ہے کہ سود کی آیات کے بعد سب قرآن کے آخر میں یہ آیت اُتری وَاتَّقُوْا یَوْمًا۔ الخ اس آیت مجیدہ کے نزول کے بعد جناب رسالتمآبؐ کل اکیس (۲۱) دن زندہ رہے۔

نقدی کا وجود

چونکہ انسان مدنی الطبع ہے اور امور زندگی میں باہمی تعاون اور لین دین کا محتاج ہے بنابریں چیزوں کا تبادلہ اس کا جزو زندگی ہے مثلاً ایک شخص کو گندم کی ضرورت ہے لیکن پاس موجود نہیں اور بجائے گندم کے اس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کپڑا موجود ہے اور دوسرے شخص کو لباس کی ضرورت ہے لیکن بجائے کپڑے کے

اس کے پاس گندم فالتو موجود ہے پس دونوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے پاس موجودہ فالتو چیز کا دوسرے کے پاس موجود زائد شئی سے حسب ضرورت تبادلہ کرلیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کپڑے کی معین مقدار کے مقابلہ میں کس قدر گندم ہونی چاہیئے اور ہر جنس کا دوسری جنس سے بوقت حاجت جب تبادلہ ہوگا یہی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ پس اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے ایک تیسری چیز کی ایجاد کی گئی جس سے ہر جنس کا اندازہ صحیح ہو سکے اور بوقت تبادلہ اجناس اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ ہے نقدی۔ پس اس میں شک نہیں کہ نقدی کا وجود خود مقصود تمدن نہیں بلکہ مقصود بالذات ہے۔ باہمی تعاون اور لین دین میں آسانی اور اس کا ذریعہ ہے نقدی۔

پس عقل و فطرت، انسان کو نقدی کے اپنے پاس رکھنے کی اجازت اس حد تک دیتی ہے جہاں تک اس کی ضرورت زندگی کا تعلق ہے اور وہ نقدی جو انسان کی ضروریات سے وافر ہو تو بجائے بے کار جمع کرنے کے اس پر ضروری ہے کہ محتاج انسانوں کی خبر گیری کرے اور ہر انسان کے کام آنے والی نقدی صرف وہی ہے جس سے وہ خود فائدہ اٹھا سکے لہٰذا جس حد تک اُسے دنیا میں ضرورت ہے بے شک اس سے دنیاوی مفاد حاصل کرے اور جس قدر اس کے پاس دنیاوی ضروریات سے وافر ہو اس سے دار آخرت کی تعمیر کرے اور وہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ فقراء و محتاجین کی دست گیری کرے اور وہ روپیہ جو اس کی دنیا کی ضرورتوں سے بچ گیا اور آخرت کے لئے اس کو خرچ نہ کیا بلکہ خزانہ میں جمع کر کے چلا گیا تو وہ روپیہ بروز محشر اس کے لئے وبال و عذاب کا موجب ہو جائے گا۔ اسی بناء پر خداوند کریم نے قرآن مجید میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور دوسرے سے ناجائز پیسہ بطور سود وصول کرنے سے منع فرمایا ہے تاکہ انسان اپنے فطری و عقلی تقاضوں کے ماتحت نقدی کو صرف جائز طریق پر استعمال کرنے کی عادت اختیار کرے اور ناجائز طور پر تحصیلِ زر سے اجتناب کرے۔

بعض عارف لوگوں نے نقدی کو خزانہ میں جمع کرنے کی مثال یوں دی ہے کہ جس طرح معین شدہ علاقائی مجسٹریٹ کو نظر بند کر دیا جائے اور پھر اس علاقہ کے لوگوں کو جھگڑا کے فیصلہ کا حکم دیا جائے کہ فلاں تعینات شدہ مجسٹریٹ کی طرف رجوع کر کے فیصلہ حاصل کرو۔ حالانکہ بصورت نظر بندی اِن کا اُس کی طرف رجوع کرنا اور اُس کا ان کے مابین فیصلہ کرنا محال ہے۔ اسی طرح پیسہ چونکہ لوگوں کی ضروریات کی کفالت کے لئے ہے تو اس کی ذخیرہ اندوزی، مجسٹریٹ کی نظر بندی کی مثل ہے اور بوقت ضرورت لوگوں کو فطرت کی طرف سے رجوع کرنے کا حکم ایسا ہے جیسا کہ مقید مجسٹریٹ کی طرف طلب فیصلہ کے لئے رجوع کرنے کا حکم دیا جائے۔ بنا بریں انسان کا فطری تقاضا یہی ہے کہ پیسہ کو بجائے نظر بند کرنے کے بجائے آزاد رکھا جائے اور تمام انسانوں کو اس کی طرف رجوع کا موقعہ دیا جائے تاکہ انسانی زندگی کا سفینہ شورشوں کے طوفانی تلاطم و گرداب میں پھنس کر غرق نہ ہو جائے۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ

اے ایمان والو! جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو۔ مدت مقررہ تک کے لئے تو اس کو لکھ لو

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا

اور چاہیئے کہ لکھے تمہارے درمیان کاتب انصاف کے ساتھ۔ اور نہ انکار کرے کاتب لکھنے سے جس طرح کہ اللہ نے

عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ

اس کو علم دیا ہے پس وہ لکھے اور لکھوایا جائے وہ جس پر حق ہے (قرض لینے والا) اور وہ اپنے رب

رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا

سے ڈرے اور کم نہ کرے اس سے کوئی چیز پس اگر ہو وہ شخص جس پر حق ہے (قرض لینے والا) بیوقوف یا کمزور

أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ

یا یہ کہ نہ قابل ہو لکھوانے کے خود۔ تو لکھوائے اس کا ولی ساتھ انصاف کے۔

رکوع نمبر

قرضے کا بیان

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ۔ تفسیر برہان میں مروی ہے کہ سورۃ بقرہ میں پانچ سو حکم مذکور ہیں اور ان میں سے پندرہ حکم صرف اسی ایک آیت مجیدہ میں ہیں۔ تفصیل یہ ہے (۱) جب ایک مدت معینہ کے لئے قرضے کا لین دین کیا جائے تو اسے لکھ لینا چاہیئے (۲) کاتب پر واجب ہے کہ عدل و انصاف سے لکھے اپنی تحریر میں قرضہ لینے یا دینے والے کو نقصان نہ دے یعنی کم یا زیادہ نہ لکھے (۳) جب کاتب کو لکھنے کے لئے کہا جائے تو انکار نہ کرے (۴) کتابت کرنا کاتب پر واجب کفائی ہے اور شیخ طوسیؒ فرماتے ہیں کہ کاتب پر اس کی اجرت لینا حرام ہے

مسئلہ ۔ کاغذ سیاہی وغیرہ کا خرچہ قرض دینے والے پر ہے نہ کہ لینے والے پر اور یہ تحریر بھی قرض خواہ کے پاس محفوظ رہے گی۔ (۵) جو قرضے رہا ہے وہ خود تحریر لکھوائے یعنی کاتب کے سامنے اپنی زبانی اقرار کرتا جائے کہ واقعی میں نے فلاں سے اتنی مدت تک کے لئے اس قدر روپیہ لیا ہے وغیرہ۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ

اور گواہ قائم کرو دو گواہ اپنے مردوں میں سے پس اگر دو مرد نہ مل سکیں تو پس ایک مرد

وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ

اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ تمہیں ان پر بھروسہ ہو (عادل ہوں) اس لئے کہ ایک عورت بھول جائے

اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا

تو اس کو دوسری یاد دلا سکے (لہٰذا ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتیں ہوں) اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور تنگدلی نہ کرو اس

اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ

کے لکھنے سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ اپنے وقت تک کے لئے یہ زیادہ قریب انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور زیادہ

(۶) قرضہ لینے والے کو اللہ سے خوف کرنا چاہئے کہ کاتب کو غلط نہ بتائے جس طرح آپس میں معاملہ کیا ہے اسی طرح صحیح صحیح لکھوائے۔ شئی کی مقدار۔ اوصاف۔ مدت وغیرہ میں کوئی کمی یا بیشی کر کے نہ لکھوائے۔

(۷) جس کے لئے قرض لیا گیا ہے اگر وہ کم عقل ہے یعنی دیوانہ مجنون ہے یا بچہ ہے یا یہ کہ لکھوانے سے اور اقرار کرنے سے معذور ہے مثلاً یہ کہ وہ گونگا ہو تو اس کے ولی پر واجب ہے کہ وہ لکھوائے لیکن عدل و انصاف کو ملحوظ رکھے نہ قرض لینے والے کو خسارہ دے اور نہ دینے والے کا نقصان کرے۔

(۸) قرضہ کی لین دین کے وقت دو عادل مرد گواہ قائم کرنے چاہئیں۔

(۹) اگر دو عادل مرد دستیاب نہ ہو سکتے ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کریں اور ان میں بھی عدالت شرط ہے اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے نزدیک ان کا دین اور عدالت پسندیدہ ہو یعنی مومن ہوں اور ظاہر کے اعتبار سے نیک ہوں (۱۰) جب گواہوں کو گواہ بننے کے لئے یا حاکم شرع کے سامنے گواہی دینے کے لئے بلایا جائے تو ہر دو صورت میں ان کا انکار کرنا ناجائز ہے۔ (۱۱) چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا لکھنے کے حکم میں سب برابر ہیں یعنی اس قسم کا ہر معاملہ لکھ لینا چاہئے کیونکہ اس میں ایک دوسرے پر بدگمانی اور شک وشبہ وغیرہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۱۲) اگر تجارت اور نقد بنقد خرید و فروخت کا قصہ ہو۔ تو اس میں لکھنا ضروری نہیں اور اگر لکھ لیا جائے تو بھی حرج نہیں۔

(۱۳) خرید و فروخت پر بھی گواہ قائم کئے جائیں اور یہ امر استحباب کے لئے ہے۔

(۱۴) لَا يُضَآرَّ۔ اگر صیغہ معلوم کا ہو۔ تو مطلب یہ ہے کہ کاتب اور گواہ معاملہ کرنے والوں کو ضرر نہ دیں یعنی ان کو ان کی ضرورت ہو تو ان کو پریشان نہ کریں بلکہ کتابت یا گواہی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیں۔

لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً

پختہ کرنے والی ہے شہادت کو اور زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم تنگ میں نہ پڑو مگر یہ کہ ہو سودا نقد بنقد

تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا

جس کا تم باہمی لین دین کرو تو پس تم پر گناہ نہیں کہ نہ لکھو اس کو اور گواہ قائم کرلیا

إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفْعَلُوا

کرو جب خرید و فروخت کرو اور نہ ضرر دے یا نہ ضرر دیا جائے کاتب اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو

فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ

تو تمہارے لئے گناہ ہوگا۔ اور اللہ سے ڈرو۔ اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۸۲)

ہر چیز کا جاننے والا ہے

اور اگر صیغہ مجہول کا ہو تو معنی یہ ہوگا کہ معاملہ کرنے والے کاتب یا گواہ کو ضرر نہ دیں کہ اگر ان کا وقت فارغ نہ ہو اور ان کو بھی اور رل سکتے ہوں تو خواہ مخواہ ان کو تنگ نہ کریں۔

(۱۵) کاتب یا گواہ کا معاملہ والوں کو یا معاملہ کرنے والوں کا کاتب یا گواہ کو بلا وجہ ضرر دینا فسق اور گناہ ہے

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ خداوند عالم تین آدمیوں کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔ (جس کا خلاصہ یہ ہے) (۱) وہ شخص جس کی عورت بدمزاج ہو اور اس کو اذیت دیتی ہو اور اس کی عیب جوئی کرتی ہو اور یہ اس سے تنگ ہو پس اللہ سے دعا مانگے کہ اے پروردگار! مجھے اس سے نجات دے تو خدا کی طرف سے اس کو جواب ملتا ہے کہ اے جاہل! اس سے نجات حاصل کرنا تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ میں نے تجھے اس کو طلاق دے کر نجات حاصل کرنے کا اختیار دے دیا ہے (۲) وہ شخص جو کسی شہر میں ہو اور وہ جگہ اس کے ناموافق ہو اور وہاں وہ جو کچھ چاہتا ہو اُسے دستیاب نہ ہو سکتا ہو پس دعا مانگے کہ اے پروردگار مجھے اس سے نجات دے تو خدا کی جانب سے جواب ملتا ہے کہ تیرے نکلنے میری طرف سے راستہ کھلا ہے۔ اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلا جا۔

(۳) وہ شخص جس نے کسی ناقابل اعتبار آدمی کو قرض دیا اور اس سے وثیقہ نہ لکھوایا۔ پس اس نے قرض کا انکار

کر دیا یا واپس کم دیا۔ پس یہ شخص اللہ سے دعا مانگے تو جواب ملتا ہے کہ اے میرا بندہ تو نے میرے فرمان پر عمل نہیں کیا اور اب مجھ سے دعا مانگتا ہے حالانکہ تو نے اپنا مال خود ضائع کیا ہے اور میری وصیت کو تبدیل کیا ہے پس اس بارہ میں تیری دعا قبول نہیں ہے اور جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ اللہ کی وصیت پر عمل کرو کیونکہ اس میں تمہاری کامیابی ہے اور اس کی خلاف ورزی نہ کرو ورنہ پشیمان ہوگے۔

اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص بغیر لکھے کے اور بغیر گواہوں کے کسی کو قرضہ دے اور پھر وہ اس کو واپس نہ دے تو اس کی بددعا بھی اس کے بارے میں مقبول نہیں۔

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ ۔ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ جناب امیرالمومنینؑ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت حضرت رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یارسول اللہ! میں جملہ عورتوں کی طرف سے حاضر خدمت ہوئی ہوں کہ خداوند عالم تمام عورتوں، مردوں کا پروردگار اور خالق و رزاق ہے اور حضرت آدمؑ و حواؑ بھی یکساں طور پر تمام مردوں، عورتوں کے والدین ہیں۔ اور آپ بھی تمام مردوں، عورتوں کی طرف یکساں طور پہ رسول ہیں پھر کیا وجہ ہے؟ کہ شہادت اور میراث میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا اے عورت خدائے عادل و حکیم ظلم و جور نہیں کرتا۔ کیونکہ تمہیں کم دینے سے اس کو نفع نہیں اور زیادہ دینے سے اس کو خسارہ نہیں ہے لیکن وہ معاملات کی تدبیر اپنے علم سے فرماتا ہے۔ اے عورت! وجہ یہ ہے کہ تمہارا دین اور عقل ناقص ہے اس نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دین کا نقصان تو اس سے ظاہر ہے کہ تمہیں ہر ماہ میں نماز پڑھنے سے معذوری لاحق ہوا کرتی ہے (اور عقل کے نقصان کی یہ علامت ہے) کہ تم لعن و طعن زیادہ کرتی ہو اور کفران نعمت تمہارا شیوہ ہے مثلاً ایک عورت اگر دس برس ایک مرد کے پاس رہے اور وہ اس کی ہر قسم کی ناز برداری کرتا رہے لیکن پھر ایک دن اگر مرد پر تنگی آجائے یا مرد عورت کو اس کے خلاف مزاج کوئی بات کہہ دے تو وہ (اس کی دہ سالہ خدمات و احسانات کو نظر انداز کرتے ہوئے) فوراً کہتی ہے کہ میں جب سے تیرے گھر آئی ہوں تجھ سے کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ ہاں اگر کوئی عورت اس سے بلند کردار اور اس قسم کی بدعادتوں سے کنارہ کش ہو تو اس کے لئے یہ (میراث و شہادت میں) کمی اس کا امتحان ہے تاکہ صبر کرے اور اس سے اس کے درجات بلند ہوں، پس تجھے خوشخبری ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا:۔ ردی مردوں اور ردی عورتوں میں سے عورت ردّی ترین ہوتی ہے اور صالح مردوں اور صالح عورتوں میں سے مرد صالح ترین ہوا کرتا ہے اور خداوند کریم نے (معاملہ شہادت میں) کسی عورت کو مرد کے برابر نہیں قرار دیا۔ مگر جناب فاطمۃ الزہراؑ کو کہ وہ اس معاملہ میں حضرت علیؑ کے برابر تھیں۔

(برہان)

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ط

اور اگر تم سفر میں ہو اور تم کو کوئی لکھنے والا نہ مل سکے تو پس کوئی چیز گروی قبضہ کرنا (اچھا ہے)

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ

پس اگر امین سمجھے تم میں سے ایک دوسرے کو تو پس ادا کرے وہ جس کو امین سمجھا گیا ہے اپنی امانت کو اور ڈرے

اللّٰهَ رَبَّهٗ ط وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ط وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ

اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور نہ چھپاؤ گواہی کو اور جو اسے چھپائے گا پس اس کا

اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸۳) ع

دل گنہگار ہے اور خدا تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ۔ اس سے پہلی آیت میں ادھار دیتے وقت تحریر اور شہادت ہر دو کا تاکیدی حکم دیا گیا تھا اور اس مقام پر فرماتا ہے اگر سفر میں بامر مجبوری کسی کو ادھار دو اور کاتب دستیاب نہ ہو سکے تو اس سے اس کے بدلہ میں کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لو اور یہی چیز تحریر و شہادت وغیرہ کے قائمقام ہو جائے گی۔

فَإِنْ أَمِنَ۔ اگر کسی کو امین اور قابلِ اعتبار قرار دے کر نہ اس سے تحریر لی گئی ہے اور نہ رہن رکھوایا گیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنا حق امانت ادا کرے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص شہادت کو چھپائے، یا ایسی شہادت دے جس سے ایک مسلمان کا خون رائیگاں ہو جائے یا کسی مسلمان کا خون تلف ہو تو بروز محشر اس کا منہ سیاہ ہوگا اور نگاہ چشم تک اس کے سامنے سیاہی ہوگی جس سے تمام اہل محشر اس کو پہچان لیں گے اور اگر کوئی حق کی شہادت دے تاکہ مسلمان کا حق زندہ ہو تو بروز قیامت اس کا چہرہ نورانی ہوگا اور تا حدِ نگاہ اس کی روشنی ہوگی کہ تمام مخلوق اس کو پہچان لے گی۔

اور جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جھوٹی شہادت دینے والا ابھی تک شہادت سے فارغ نہیں ہوتا۔ کہ جہنم میں اس کی جگہ ریزرو ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:۔ اس شہادت سے مراد ہے کہ حاکم شرع اگر شہادت طلب کرے تو انکار نہ کرنا چاہیئے اور نہ غلط بیانی کرنی چاہیئے حاکم جور کے سامنے مقدمہ لے جانا بھی حرام ہے اور اس کے سامنے شہادت دینا بھی گناہ ہے مگر یہ کہ بامر مجبوری ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائے تو خدا غفور رحیم ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ

اللہ کے لئے ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور خواہ تم ظاہر کرو وہ جو تمہارے دل میں ہے یا

تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

اس کو چھپاؤ اس کا حساب تم سے لے گا پھر وہ بخشے جسے چاہے اور عذاب دے جسے چاہے

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ایمان لایا رسول ساتھ اس کے جو نازل کیا گیا اس پر

مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

اپنے رب سے اور مومنین (بھی) سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتے اور کتابوں اور رسولوں پر

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ

(اور وہ کہتے ہیں) کہ فرق نہیں کرتے ہم (بلحاظ ایمان) درمیان کسی ایک کے اس کے پیغمبروں میں سے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی تیری بخشش چاہیے اے ہمارے پروردگار اور

شب معراج کی باتیں

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ الخ ۔ اس آیت کے ماقبل کے ساتھ ربط کی وجوہات میں سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ چونکہ خدا نے اس سورۂ مجیدہ میں فروعی احکام بیان فرمائے ہیں تو اب سورہ کو ذکر توحید اور وعظ و نصیحت اور اقرار جزا و سزا پر ختم فرما رہا ہے۔ جس طرح کہ ابتدا بھی ان ہی چیزوں سے ہوئی تھی۔

نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی مقصود ہے کہ بیان کردہ احکام کی بھلائی تمہارے لئے ہی ہے اور ان پر عمل کرنے کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا ورنہ اللہ کو ان چیزوں کی احتیاج نہیں وہ آسمانوں اور زمینوں اور کل موجودات کا مالک ہے۔

مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۔ دل کی باتوں کا حساب لینے کا مقصد یہ ہے کہ غلط عقیدہ کی خدا باز پرس کرے گا چنانچہ تفسیر برہان میں عیاشی سے اسی آیت کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس شخص کے دل میں ان دو شخصوں کی رائی کے دانہ کے برابر بھی محبت ہوگی تو خدا اس کو ہرگز ہرگز بہشت میں داخل نہ کرے گا۔

اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ

تیری طرف ہی بازگشت ہے ۔ نہیں تکلیف دیتا خدا کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق اس کے کمائے ہوئے کا نفع

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا

اسی کے لئے ہے اور اس کا وبال بھی اسی کے اوپر ہے ۔ اے پروردگار ہمارا ہماری گرفت نہ کرنا اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا

اے رب نہ رکھ ہم پر بوجھ جس طرح رکھا تو نے ان پر جو ہم سے پہلے گذرے اے رب اور نہ

تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَقفة وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَقفة وَارْحَمْنَا ۥ وَقفة

اٹھوا ہم سے وہ جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور معاف کر ہم کو اور بخش ہمیں اور رحم فرما ہم پر

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

تو ہمارا مولا ہے پس ہماری مدد فرما کافر لوگوں پر

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ۔ تفسیر برہان میں ایک حدیثِ طویل میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ پوری آیت شب معراج جناب رسالتمآبؐ پر پیش کی گئی اور آپ نے اس کو قبول فرمایا۔ پس ارشاد قدرت ہوا۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ ۔ یعنی رسول ایمان لایا ساتھ اس چیز کے جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی۔ تو جواب میں جناب رسالتمآبؐ نے اپنی اور اپنی امت کی طرف سے عرض کی۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الخ ۔ یعنی مومنین بھی ایمان لائے اور سب اللہ و فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اور بلحاظ ایمان و تصدیق ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار کریں اور سب نے خدائی فرمائشات کو سنا اور اطاعت قبول کی۔ پس جانب خدا سے آواز آئی کہ جنت اور مغفرت ان ہی کے لئے ہے پھر حضرت رسالتمآبؐ نے عرض کی غُفْرَانَكَ الخ اے پروردگار تیری بخشش چاہیئے اور تیری طرف ہی بازگشت ہے۔ اس کے بعد ارشاد قدرت ہوا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ الخ ۔ یعنی خدا کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں رکھتا پس جو عمل خیر کریں گے تو وہ ان کی جزا پائیں گے اور جو عمل بد کریں گے وہ ان کی سزا جھیلیں گے۔ تو جناب رسالتمآبؐ نے عرض کی۔ اے پروردگار! ہمیں اس سے کچھ زیادہ مرحمت فرما۔ ارشاد ہوا کہ طلب کرو۔ جو چاہتے ہو پس عرض کی۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۔

اے پالنے والے ہمیں نسیان یعنی بھول چوک اور خطا کا مواخذہ نہ کرنا تو ارشاد ہوا کہ گذشتہ امتیں جب یاد دلائے جانے کے بعد بھول جاتی تھیں تو اُن پر میں عذاب کے دروازے کھول دیتا تھا اور تیری امت سے میں نے معاف کر دیا اور گذشتہ امتوں سے جب غلطی سرزد ہوتی تھی تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔ اب تیری کرامت کی وجہ سے تیری امت پر سے میں نے یہ سزا اٹھا دی ہے پھر حضورؐ نے عرض کی کہ کچھ اور بھی دے۔ ارشاد ہوا کہ طلب کر جو کرنا ہے۔ پس عرض کی رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا الخ۔ یعنی اے اللہ! ہم پر وہ بار نہ رکھ جو گذشتہ امتوں پر رکھے گئے تھے پس خدا نے قبول فرمایا اور ارشاد ہوا کہ میں نے گذشتہ امتوں کے بوجھ تمہاری امت سے اٹھا لئے۔ مثلاً ان کی نمازیں سوائے مخصوص مقامات کے اور کہیں بھی قابلِ قبول نہیں ہوا کرتی تھیں خواہ وہ مقامات ان سے دُور بھی ہوتے تھے ان کو ضروری طور پر نماز کی ادائیگی کے لئے وہاں جانا پڑتا تھا۔ لیکن تمہاری امت سے یہ بوجھ میں نے اٹھا لیا ہے وَقَدْ جَعَلْتُ الْأَرْضَ كُلَّهَا لِأُمَّتِكَ مَسْجِدًا وَتُرَابَهَا طَهُورًا۔ اور تحقیق میں نے تمام روئے زمین کو تیری امت کے لئے جائے سجدہ قرار دے دیا ہے (جہاں وقت نماز ہو جائے وہاں پڑھ لیں) اور اس کی مٹی کو میں نے باعث طہارت کر دیا ہے (اگر پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرکے نماز کر ادا کریں۔

(۲) گذشتہ امتوں کے لئے یہ تھا کہ جہاں بدن میں ان کو نجاست لگتی تھی اس جگہ کے کاٹے بغیر ان کا بدن پاک نہ ہوتا تھا اور آپکی امت کیلئے پانی کو مطہر بنایا ہے کہ دھو دینے سے وہ مقام پاک ہو جائیگا جہاں نجاست لگی ہو پس یہ بوجھ بھی آپکی امت سے اٹھا لیا گیا ہے۔

(۳) گذشتہ امتیں اپنی قربانیاں گردنوں پر اٹھا کر بیت المقدس میں لاتی تھیں اور ان کی مقبولیت کی نشانی یہ تھی۔ کہ میں ایک آگ کو بھیجتا تھا تو مقبول قربانی کو اٹھا لیتی تھی۔ پس ان کے لئے وہ خوشی کا باعث ہوتی اور جس کی قربانی کو آگ نہ کھاتی تھی۔ وہ ناکام ہو کر واپس آ جایا کرتے تھے۔ لیکن تیری امت کی قربانیوں کی مقبولیت کا معیار تیری امت کے فقراء و مساکین کے پیٹ ہیں۔ پس جو قربانی ان تک پہنچ جائے اگر وہ مقبول ہو گی تو بروز قیامت اس کا بدلہ چند در چند دونگا اور اگر مقبول نہ بھی ہو گی تو اُن سے دنیا کے عذاب کو تو برطرف کر ہی دوں گا۔

(۴) گذشتہ امتوں پر رات کی تاریکی اور دن کے وسط میں نمازیں واجب تھیں جو مشقت کا باعث تھیں اور تیری امت پر فرحت و نشاط کے وقتوں میں نمازیں واجب کی گئیں۔

(۵) گذشتہ امتوں پر پچاس نمازیں دن رات کے پچاس وقتوں میں واجب تھیں اور تیری امت پر صرف پانچ نمازیں واجب ہیں اور وہ کل اکاون رکعتیں ہیں اور ان کو ان پانچ نمازوں کا ثواب ان کی پچاس نمازوں کے برابر عطا کروں گا۔

(۶) گذشتہ امتوں میں یہ تھا کہ اگر وہ نیکی کی نیت کرتے تھے تو اس کا ثواب نہ تھا اور اگر نیکی کر لیتے تھے تو اس کا ثواب صرف ایک کے بدلے ایک تھا اور آپ کی امت اگر نیکی کا صرف ارادہ کرے تو اس کو ایک نیکی کا ثواب اور اگر نیکی کا عمل بھی کرے تو ایک کے بدلہ میں دس گنا ثواب دوں گا۔

(۷) گذشتہ امتوں میں یہ تھا کہ اگر وہ برائی کا ارادہ کرتے اور پھر اس پر عمل نہ کرتے تو اس کا بدلہ کچھ نہ تھا اور تیری امت

اگر برائی کا ارادہ کرے اور پھر عمل نہ کرے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھی جائے گی۔

(۸) گذشتہ امتوں میں کوئی شخص جب گناہ کرتا تھا تو اس کے دروازہ پر لکھا جاتا تھا (جس سے وہ شرمسار ہوتا تھا) اور آپ کی امت کا گناہ صرف میرے اور اُن کے درمیان بند ہے اور میں نے اُن پر پردہ دے رکھا ہے۔

(۹) گذشتہ امتوں کی گناہ سے توبہ اس طرح ہوتی تھی کہ میں اُن پر لذیذ ترین غذا بطور سزا کے حرام قرار دیتا تھا اور آپ کی امت کی توبہ بغیر سزا کے قبول ہے۔

(۱۰) گذشتہ امتوں میں ایک شخص گناہ سے توبہ کرتا تو سو سال، اسی سال، پچاس سال معافی مانگتا رہتا تھا اور پھر بھی بغیر سزا دنیاوی کے مقبول نہ ہوتی تھی لیکن آپ کی امت میں سے کوئی شخص بیس سال، تیس سال، چالیس سال یا سو سال گناہ میں مبتلا رہے اور پھر توبہ کرے تو طرفۃ العین (پلک جھپکنے کی دیر تک) کی پشیمانی سے اس کے سب گناہ معاف کر دوں گا۔ (پس یہ وہ بوجھ ہیں جو گذشتہ امتوں پر تھے اور جناب رسالتمآبؐ کی دعا سے اس امت سے وہ اٹھائے گئے)

اس کے بعد جناب رسالتمآبؐ نے عرض کی۔ اے پروردگار! وَلَا تُحَمِّلْنَا۔ ہم سے ہماری طاقت سے زیادہ بوجھ نہ اٹھوا۔ تو ارشاد ہوا کہ یہ بھی منظور ہے۔ پھر عرض کی کہ اے پروردگار! وَاعْفُ عَنَّا۔ ہمیں معاف کر اور بخش اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا مولا ہے تو ارشاد ہوا کہ یہ چیز توبہ کرنے والوں کے لئے میں نے قبول کی ہے۔ پس عرض کی۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ۔ ہماری کافروں پر مدد فرما۔ تو ارشاد ہوا کہ آپ کی امت اگرچہ تعداد میں قلیل ہو گی۔ لیکن ان کا رعب اور سکہ ہو گا اور آپ کا دین مشرق و مغرب میں پھیل جائے گا۔ (انتہیٰ ملخصًا)

نیز تفسیر برہان میں مروی ہے کہ شب معراج جب مجھے خطاب پروردگار ہوا۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ الخ اور میں نے جواب میں کہا۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الخ۔ پھر ارشاد ہوا اے محمد میں نے زمین پر نگاہ قدرت کی اور تجھے چُن لیا اور تیرا نام اپنے نام سے مشتق کیا۔ جہاں میرا ذکر ہو گا وہاں تیرا ذکر بھی ساتھ ہو گا۔ پس میں محمود ہوں اور تو محمدؐ ہے پھر میں نے دوبارہ زمین پر نظر انتخاب کی تو علیؑ کو چنا اور اس کا نام بھی اپنے نام سے مشتق کیا۔ میں اعلیٰ ہوں اور وہ علیؑ ہے۔ اے محمد۔ میں نے آپ کو اور علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور باقی آئمہ جو حسینؑ کی نسل سے ہونے والے ہیں ان سب کو اپنے نور سے خلق کیا اور تمہاری ولایت کو میں نے تمام اہل ارض و سما پر پیش کیا پس جس نے اس کو قبول کیا وہ میرے نزدیک مومن ہے اور جس نے اس کا انکار کیا وہ میرے نزدیک کافر ہے۔

اے محمدؐ! اگر میرے بندوں میں سے کوئی بندہ میری عبادت کرتے کرتے نڈھال اور بوسیدہ ہو جائے لیکن تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرتا ہو تو اس کو نہ بخشوں گا جب تک کہ تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرے گا۔ اے محمدؐ کیا تو اُن کو دیکھنا چاہتا ہے؟ (یعنی باقی تیرہ معصومین کو) تو میں نے عرض کی! ہاں۔ پس مجھے خطاب ہوا کہ عرش کی دائیں جانب نگاہ کیجئے۔ پس میں نے دیکھا۔ تو علیؑ فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ، علیؑ بن الحسینؑ، محمدؑ بن علیؑ، جعفرؑ بن محمدؑ، موسیٰؑ بن جعفرؑ، علیؑ بن موسیٰؑ، محمدؑ بن علیؑ، علیؑ بن محمدؑ

حسن بن علیؑ اور حضرت مہدیؑ ایک فضائے نور میں کھڑے ہو کر مصروف عبادت تھے اور حضرت مہدیؑ ایک درخشاں ستارہ کی طرح ان سب کے وسط میں جلوہ افروز تھے۔ پس ارشاد باری ہوا۔ اے محمدؐ! یہ سب میری طرف سے حجت ہوں گے اور وہ تیری (مظلوم) عترت کا بدلہ لینے والا ہو گا۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ وہ میرے دوستوں کے لئے حجت واجبہ اور میرے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہو گا تفسیر مذکور میں ہے کہ اس روایت کو بعض مخالفین نے بھی نقل کیا ہے۔ (باختصار)

اسی تفسیر میں مروی ہے کہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شب معراج تمہارے نبی سے پہلی کلام کون سی ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ الخ یہودی نے کہا کہ میرا یہ مطلب نہیں تو آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد یہ آیت جو کہ قول رسول تھا وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ الخ یہودی نے کہا میری مراد یہ بھی نہیں آپ نے فرمایا کہ پوشیدہ باتوں کو رہنے دو۔ تو یہودی نے کہا کہ اگر آپ نہیں بتا سکتے تو آپ وہ نہیں؟ آپ نے فرمایا اگر تجھے خواہ مخواہ پوچھنا ہے تو سن۔ جب جناب رسالتمآبؐ واپس تشریف لا رہے تھے تو ابھی حجابوں کی منازل میں تھے اور مقام جبرائیل تک نہ پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک ملک نے صدا دی یَا اَحْمَد آپؐ نے کہا لبیک۔ فرشتہ نے عرض کی کہ اللہ سلام کے بعد فرماتا ہے کہ سید ولی کو سلام کہنا۔ آپؐ نے پوچھا۔ سید ولی کون ہے؟ تو ملک نے کہا کہ وہ علی بن ابی طالب ہی تو ہے۔ یہ سن کر یہودی بولا۔ بے شک۔ خدا کی قسم۔ میں نے اپنے والد کی کتاب میں ایسا ہی پڑھا ہے اور وہ یہودی حضرت داؤد کی اولاد سے تھا (باختصار)

شب معراج نو چیزیں جناب رسالتمآبؐ کی امت سے اٹھا لی گئیں ہیں انکو ان چیزوں پر گرفت نہ ہوگی۔ چنانچہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیْ تِسْعَةُ اَشْیَآءَ۔ میری امت سے نو چیزیں اٹھائی گئی ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) نسیان (۲) خطا (۳) لاعلمی (۴) بے بسی و بے طاقتی (۵) جو کام ظالم کے ظلم و جبر کے ڈر سے کیا ہو (۶) جو کام حالت اضطرار میں ہو جائے (۷) فال نیک یا بد لینا (۸) توحید کے بارے میں وسوسے بشرطیکہ ان کو کراہت کی نگاہ سے دیکھے (۹) حسد بشرطیکہ اس کا استعمال نہ کرے۔ جناب رسولخداؐ سے مروی ہے کہ جو شخص سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں اور آیۃ الکرسی تا هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ۔ اور آخری تین آیتیں لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے تا آخر پڑھے گا تو وہ اپنی جان و اہل و مال میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ دیکھے گا اور اس کے قریب شیطان نہ آئے گا اور اس کو قرآن فراموش نہ ہو گا۔

نُکتہ: سورہ بقرہ کی آخری آیتیں پوری سورت کا تتمہ یا نتیجہ ہیں کیونکہ سورہ مذکورہ میں متعدد احکام قصص و واقعات اور مختلف خبریں ذکر ہوئی پس آخر میں بطور تتمہ کے یہ اعلان نہایت موزوں تھا کہ رسولؐ اور ایمان والوں کو اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کسی شئی پر ذرہ بھر بھی تذبذب و شبہ نہیں بلکہ وہ ہر نازل شدہ شئی پر دل و جان سے ایمان رکھتے ہیں نیز ابتداء سورہ میں خوف خدا رکھنے والے اور اللہ کی جانب سے نازل شدہ تمام چیزوں پر ایمان لانے والے متقی کے مقدس لقب سے یاد کئے گئے تھے اور اس کے بعد خدا نے کفار اور منافقین کے امر جبلی طبائع، عادات و کردار کا تعارف کرا دیا تھا اور بنی اسرائیل پر اپنی نعمات کا نزول اور ان کا انکار اور پھر ان پر عذاب کی سختی وغیرہ کا تذکرہ فرمایا تھا اب اختتام سورہ پر ایک فقرہ پھر بطور تلخیص و فذلکہ[1] کے ارشاد فرما رہا ہے کہ رسولؐ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے اپنے موقف ایمانی پر ثابت قدم ہیں اور اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی ہر چیز پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور اپنی جملہ ضروریات اسی سے مانگتے ہیں اور مشکلات کا حل بھی اسی سے چاہتے ہیں

[1] فذلکہ کا معنی ہے نتیجہ (منہ)

تفسیر

سورہ آلِ عمران

یہ سورہ مدینہ ہے اور اس کی کل آیات دوسو ۲۰۰ ہیں۔
اور بسم اللہ کو شامل کرکے کل تعداد دوسو ایک ۲۰۱ ہوگی۔

فضائل وخواص :- (۱) امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کو پڑھے گا تو بروز محشر یہ دونوں سورتیں اس کے سر پر مثل بادل کے سایہ فگن ہوں گی۔

(۲) جناب رسالتمآب سے منقول ہے کہ جو شخص سورۂ آل عمران کو جمعہ کے دن پڑھے گا تو غروب شمس تک اس پر اللہ کی رحمت برستی رہے گی اور ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے۔

(۳) نیز آپ سے مروی ہے کہ جس عورت کو حمل نہ ہوتا ہو اس سورہ مبارکہ کو زعفران سے لکھ کر اس کے گلے میں ڈالا جائے تو اسے حمل ہوگا اور اگر کسی کھجور یا درخت پر جو پھل گرا دیتا ہو یا اس کے پتے گر جاتے ہوں اگر لکھ کر یہ سورۂ لٹکائے تو اس کے پھل پتے گرنے سے رُک جائیں گے۔
(باذنِ خدا)

(۴) نیز حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے اگر تنگدست آدمی اس کو لکھ باندھے تو اس کی روزی فراخ ہوگی اور خداوند کریم اس کو رزق وسیع عطا فرمائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اس اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے (شروع کرتا ہوں)

الٓمّٓ ۟ﭑ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ

اللہ کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں جو حیّ وقیوم ہے اتاری اُس نے آپ پر کتاب

بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ

برحق جو تصدیق کرنے والی ہے (ان کتابوں) کی جو اس سے پہلے ہیں اور اتارا تورات و انجیل کو اس سے پہلے لوگوں کی

قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ

ہدایت کے لئے اور اُتارا فرقان کو تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات

اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰہَ

سے اُن کے لئے عذاب ہے سخت اور اللہ غالب اور بدلہ لینے والا ہے تحقیق اللہ پر

ٹ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ :۔ (تفسیر مجمع البیان) ابن عباس سے مروی ہے کہ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ اسم اعظم ہے حضرت آصف بن برخیا نے اسی کے ذریعہ سے دعا مانگ کر بلقیس کا تخت ملک سبا سے چشم زدن میں حضرت سلیمان کے لئے حاضر کیا تھا۔

وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآن ساری کتاب ہے اور فرقان سے مراد وہ آیات ہیں جو محکم اور واجب العمل ہیں۔

اسم اعظم شیخ عباس قمی قدہ نے مفاتیح الجنان میں ذکر کیا ہے جس کی اصل عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔ سید اجل علی خان شیرازی نے کلم طیب میں نقل کیا ہے کہ خدا کا اسم اعظم وہ ہے جس کی ابتداء لفظ اللہ اور انتہا لفظ ھُوَ ہے اور اُن کے حروف پر نقطے نہیں اور اس کا معنی نہیں بدلتا۔ خواہ اعراب دیا جائے یا نہ دیا جائے اور یہ قرآن مجید کی پانچ آیتوں میں ہے جو پانچ سورتوں میں ہے بقرہ آل عمران، نساء۔ طٰہٰ اور تغابن شیخ مغربی نے کہا ہے کہ جو شخص ان پانچ آیات مبارکہ کو ہر روز گیارہ مرتبہ اپنا ورد بنالے تو اس کی ہر کلی و جزی مشکل جلدی سے آسان ہوگی۔ انشاء اللہ اور وہ پانچ آیتیں یہ ہیں۔

(۱) آیۃ الکرسی (۲) اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ مِنۡ قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ (۳) اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا (۴) اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی

لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ

کوئی چیز پوشیدہ نہیں　نہ زمین میں　اور نہ آسمان میں　اور یہ وہی ہے جو تمہاری صورتیں

فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

رحم مادر میں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے　کوئی لائق عبادت نہیں مگر وہی جو غالب حکمت والا ہے

(۵) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ سورہ آل عمران کی ابتدائی اسّی سے کچھ زائد آیات اہل نجران کے وفد کے متعلق نازل ہوئیں جو کہ ساٹھ سوار تھے اور جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کے سرگروہ تین آدمی تھے ایک عبدالمسیح جوان کا امیر اور صاحب رائے تھا۔ دوسرا ایہم جو اُن کا بزرگ تھا اور تیسرا ابوحارثہ بن علقمہ جو ان کا پادری اور مذہبی پیشوا تھا اور بہت عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ روم کی حکومت میں اس کے علم و اجتہاد کے پیش نظر اس کا بہت کافی وقار قائم تھا۔ یہ لوگ بصورتِ وفد داخل مدینہ ہوئے اور جب مسجد نبوی میں پہنچے تو اس وقت حضورؐ نماز عصر سے فارغ ہو چکے تھے یہ لوگ نہایت فاخرہ اور قیمتی لباس میں ملبوس تھے صحابہ میں سے جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہے کہتے ہیں کہ ان جیسا وفد ہم نے آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا تو ناقوس بجانے لگے اور پھر اٹھ کر مسجد نبوی میں انہوں نے نماز کا ارادہ کیا۔ صحابہ کرام کو مسجد نبوی میں ان کا یہ فعل ناگوار گذرا چنانچہ بارگاہ رسالت میں انہوں نے اپنے احساسات جتلائے تو آپ نے فرمایا۔ کہ انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے۔ پس انہوں نے نماز مشرق کی طرف منہ کر کے پڑھی۔

اس کے بعد عاقب جس کا نام عبدالمسیح تھا اور اسید جس کا نام ایہم تھا۔ دونوں نے جناب رسالتمآبؐ سے گفتگو کی۔ آنجنابؐ نے دونوں کو اسلام کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ ہم پہلے سے مسلمان ہیں آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو کیونکہ تم اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہو۔ صلیب کی عبادت کرتے ہو اور سور کھاتے ہو۔ حالانکہ اسلام ان باتوں سے منع کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کے لئے بیٹا نہیں ہے تو فرمائیے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ کون ہے؟ اور اس بات پر وہ سب کے سب بول اُٹھے آپ نے چند عقلی دلیلیں پیش کیں جن میں سے وہ ایک کا بھی جواب نہ دے سکے۔ اور تسلیم کرتے گئے چنانچہ آپ نے فرمایا:-

(۱) کیا تم مانتے ہو کہ بیٹا ہمیشہ باپ کے مشابہ ہوا کرتا ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں! فرمایا کیا تم یہ بھی مانتے ہو کہ خدا حیّ یعنی زندہ ہے اور اس کے لئے موت نہیں ہے۔ حالانکہ عیسیٰ پر فنا آئے گی؟ کہنے لگے کہ ہاں!

(۲) پھر فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے؟ کہ خدا قیوم یعنی ہر شئے کا مدبّر و محافظ و رزاق ہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بے شک ایسا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا عیسیٰ بھی ان چیزوں میں سے کسی چیز کا مالک ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں۔

(۳) آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ خدا پر آسمانوں اور زمینوں کی چیزوں میں سے کوئی چیز مخفی نہیں؟ کہنے لگے ہاں ایسا ہی ہے۔ فرمایا۔ کیا عیسٰے کو بھی ان سب چیزوں کا علم ہے سوائے ان چیزوں کے جو اللہ نے ہی بتلائی ہوں کہنے لگے کہ نہیں۔

(۴) پھر فرمایا۔ کیا تم قائل ہو کہ حضرت عیسٰے کی صورت رحم مادر میں خدا نے جس طرح چاہی بنائی۔ حالانکہ خدا خود کھانے پینے اور حدوث سے پاک ہے؟ کہنے لگے۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔

(۵) آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں علم ہے کہ عیسٰے کی والدہ باقی عورتوں کی طرح حاملہ ہوئیں اور پھر عام عورتوں کی طرح اس کا وضع حمل ہوا۔ اور عام بچوں کی طرح ان کی تربیت ہوئی وہ کھاتے پیتے تھے حالاتِ ضروریہ ان کو لاحق تھیں۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں درست ہے تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا دعوٰے پھر کہاں گیا۔ بالآخر وہ سب لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے پس خداوند کریم نے آل عمران کی اسیؔ سے کچھ زاید آیتیں انہی کے بارے میں نازل فرمائیں۔

انوارِ علمیہ

(۱) یہ چھ آیتیں سورۂ مبارکہ آل عمران کے مضامین کے تفصیلی بیانات کا اجمال ہیں مثلاً توحید کا ذکر اور تورات وانجیل کے نزول کا ذکر۔ یہود و نصاریٰ کے ایرادات کا ملخص جواب ہے کفار کے لئے عذاب کی پیش کش اور انتقام کا ذکر۔ جنگ اُحد کے تفصیلی بیان کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے اور ارحام میں بچوں کی تصویر کشی کا ذکر تولد مریم۔ پیدائش حضرت یحییٰ اور ولادتِ حضرت عیسٰے علیہم السلام کے تفصیلی قصوں کا ملخص ہے۔

(۲) تنزیل۔ کسی شے کو تدریجاً اتارنا اور انزال ایک دفعہ نازل کرنا۔ اسی وجہ سے قرآن کے لئے تنزیل کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور تورات و انجیل کے لئے انزال کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن بعض چیزیں جن میں تدریج اور مجموعیت دونوں کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان پر دونوں لفظیں استعمال ہو سکتی ہیں۔ مثلاً بارش کو اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس پر انزال استعمال ہوگا اور اگر اس کی تدریج کا لحاظ کیا جائے تو تنزیل کا استعمال بھی جائز ہے اور اسی کے پیشِ نظر قرآن میں اس کے لئے دونوں لفظیں استعمال کی گئی ہیں۔

(۳) تورات عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہے شریعت اور انجیل کے متعلق بعض کہتے ہیں یونانی ہے اور بعضوں نے اسے فارسی کلمہ کہا ہے اور اس کا معنی ہے بشارت (خوشخبری)

(۴) انجیلیں نصاریٰ کے پاس کافی ہیں اور نزول قرآن کے وقت بھی چار مشہور انجیلیں موجود تھیں جو لوقیس۔ پطرس۔ متی اور یوحنا کی طرف منسوب تھیں۔ پس اناجیل صیغہ جمع کی بجائے لفظ مفرد انجیل کا استعمال اس امر پر دلالت کے لئے ہے کہ انہوں نے کلام خدا میں تحریف سے کام لیا ورنہ دراصل انجیل ایک تھی اور تحریف کے ہاتھ نے اسے بڑھا کر چار یا زیادہ تک پہنچا دیا۔

(۵) خداوند کریم نے شکمِ مادر میں بچے کی تصویر کشی اپنی طرف منسوب فرمائی حالانکہ اسباب ظاہریہ کو بچے کی تصویر میں دخل ہے جیسا کہ علم الابدان میں اس کی تصریح موجود ہے اور خداوند کریم نے دنیا کے جملہ امور کو اسباب و علل سے وابستہ کر رکھا ہے اور اس کے خلاف ہونے کا نام ہی تو معجزہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بچے کی تصویر کشی شکم مادر میں اگرچہ اسباب مادیہ اور علل ظاہریہ کی طرف سے ہے

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ

وہ وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب۔ اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو اصل

الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ

کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے تو وہ پیچھے پڑتے

فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚۘ وَ مَا

ہیں ان کے جو اس میں سے متشابہ ہیں بغرض فتنہ اور بغرض (من مانی) تاویل کے حالانکہ کوئی

یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ﯼ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ

نہیں جانتا اس کی صحیح تاویل مگر اللہ اور وہ لوگ جو راسخ ہیں علم میں۔ حالانکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ سب

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(محکم ہوں یا متشابہ) ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نہیں نصیحت لیتے مگر صاحبانِ عقل

لیکن علل و اسباب میں اس قسم کی انقلابی کیفیات اور فعلی و انفعالی تحریکات اسی فیاض مطلق کی طرف سے عنایت شدہ ہیں پس خدا سبب حقیقی ہے اور یہ اسباب ظاہریہ ہیں اور یہ دونو ایک دوسرے کے طول میں واقع ہیں لہذا دونوں کی طرف نسبت صحیح ہے۔ ہاں اگر یہ ایک دوسرے کے عرض میں اور مقابلہ میں واقع ہوتے تو تضاد لازم آتا۔

محکمات و متشابہات کا بیان

مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ الخ۔ محکم و متشابہ کے متعلق چند اقوال ہیں (۱) محکم وہ ہے جس کا معنی و مطلب بالکل ظاہر اور صاف ہے نہ اس میں کوئی اجمال ہو اور نہ کوئی گنجلک ہو اور متشابہ وہ ہے جس کی مراد ظاہر نہ ہو اور مطلب واضح نہ ہو بلکہ اس کے سمجھنے کے لئے کافی غور و خوض کی ضرورت ہو۔

(۲) محکم سے مراد ناسخ اور متشابہ سے مراد منسوخ ہے اور امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی ایک روایت میں وارد ہے کہ منسوخ آیتیں متشابہات سے ہیں (۳) محکم وہ ہے جس کی تاویل کا صرف ایک ہی رُخ ہو اور اس سے صرف ایک ہی مطلب نکل سکتا ہو اور متشابہ وہ ہے جس میں دو یا اس سے زیادہ معانی کا احتمال ہو (۴) محکم وہ ہے جس کی تاویل معین کی جاسکتی ہو اور متشابہ وہ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ

اے ہمارے پروردگار! نہ پھیر ہمارے دلوں کو بعد اس کے کہ تونے ہمیں ہدایت فرمائی اور عنایت فرما ہمیں

رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ

اپنی رحمت تحقیق توہی تو عطا کرنے والا ہے اے رب تحقیق تو اکٹھا کرنے والا ہے لوگوں کو

لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ⑨ ع

اس دن کہ جس میں شک نہیں۔ بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

ہے جس کی تاویل کا تعین نہ ہو سکتا ہو۔

سوال: خداوند کریم نے جب قرآن مجید عام مخلوق کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے تو چاہئیے تھا کہ سارا قرآن محکم نازل کیا جاتا تاکہ ہر ایک اس کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتا۔ لہذا متشابہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: آیاتِ متشابہات نازل کرنے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں:۔

(۱) اگر سب کا سب محکم ہوتا تو لوگوں کی قرآنی علوم سے دلچسپی ختم ہو جاتی صرف نقل پر اکتفا کر لی جاتی۔ اور غور و خوض کی طرف توجہ نہ ہوتی۔

(۲) عام خطوط و مکاتیب میں یہی دستور ہے کہ اگر عبارت سلیس اور مطلب واضح ہو تو صرف ایک دفعہ اس کا سرسری مطالعہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ اس کو دیکھنے کے لئے جی تک نہیں چاہتا اور اگر اس میں ذرہ گنجلک ہو تو اس کا بار بار غور و خوض اور پورے دھیان سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور قرآن چونکہ صرف ایک وقت یا ایک دور کے لوگوں کے لئے نہ تھا بلکہ تاقیامت تمام آنے والی نسلوں کے لئے بھی باعث ہدایت تھا۔ اگر بالکل سلیس اور عام فہم ہوتا تو اس کی بہجت و نضارت تھوڑے دنوں تک محدود ہو کر رہ جاتی اور اس کی جاذبیت کے محدود عرصہ کے اندر ناپید ہو جانے سے طبیعتوں میں بار بار شوق تلاوت نہ رہتی۔ اور یہ چیز قرآن مجید کی قیامت تک کی طویل زندگی کی راہ میں سدِراہ ہو جاتی۔ پس خدا علیم و حکیم نے اس مقدس کلام میں ایسا رنگ بھر دیا۔ کہ جوں جوں زمانہ طول پکڑتا جائے اس کی طرف طبائع کا رجحان روز افزوں ترقی کرتا جائے۔

(۳) اگر سب آیات محکمات ہوتیں اور اس کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکتا تو قرآن فہمی میں طبائع کو سرور حاصل نہ ہو سکتا۔ کیونکہ جو چیز بلا تعب و مشقت حاصل ہو اس کے حصول پر اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ جتنی کہ مشقت و محنت کے بعد حاصل ہونے والی شئے پر خوشی حاصل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس چیز کی توقع ہوتی ہو اور توقع کے مطابق کامیابی حاصل ہو جائے۔ تو وہ کامیابی اتنی موجب سرور نہیں ہوتی۔ جتنی کہ بعض مطالب و مقاصد پر خلاف توقع کامیابی حاصل ہونے سے ہوا کرتی ہے چنانچہ بوعلی سینا

(رشح رئیس) کا قول ہے کہ جب مطلب کے سمجھنے کے لئے مجھے شب و روز کی محنت شاقہ برداشت کرنی پڑے جس سے دماغ پر کافی بوجھ ڈال کر اس کو حل کرنا ضروری ہو اور بالآخر اس مقصد میں کامیابی و کامرانی حل ہو جائے تو جہاں ایک طرف تمام ذہنی کاوشوں کا شیریں و خوش مزہ پھل میسر آجانے سے تمام دماغی کوفتیں ختم ہو جاتی ہیں وہاں دوسری طرف طبیعت میں اس قدر سرور و فرحت حاصل ہوتی ہے کہ شاید زمین و آسمان کے مابین کی حکومت و شاہی ملنے سے بھی وہ خوشی حاصل نہ ہو سکتی ؟

(۴) جو چیز آسانی سے دستیاب ہو جائے اس کی نہ اہمیت ملحوظ رہتی ہے اور نہ اس کی قدر و قیمت ہوتی ہے بخلاف اس کے جو چیز کسی قدر محنت طلب ہو اس کی اہمیت زیادہ اور قدر و منزلت بلند ہوتی ہے۔

(۵) قرآن مجید قیامت تک کے لئے معجزہ ہے اور ہر مفسر اپنی ذہنی منزل کے پیش نظر اس سے مطالب تک رسائی حاصل کرتا ہے ہر بعد میں آنے والا ایسے نکات و رموز پر مطلع ہوتا ہے جن تک گذشتہ مفسرین نہ پہنچ سکے تھے اور یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام انتہائی غور و فکر سے مطالب قرآنیہ حاصل کرنے کے بعد یہ دعوےٰ نہیں کر سکتے کہ ہم اس کی کنہ و انتہا تک پہنچ گئے اور مطالبِ قرآنیہ تک ہمیں کماحقہٗ دسترس حاصل ہو گئی اور جس قدر رموز قرآنیہ میں خوض کرتے ہیں اسی قدر طبیعت میں آگے بڑھنے کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے اگر سارا قرآن محکم آیات پر مشتمل ہوتا تو قرآن مجید میں تدبّر و تفکّر کی راہیں مسدود ہو جاتیں۔ پس یہ بھی قرآن کا ایک معجزہ ہے کہ تیرہ سو سال سے ہر دور میں علمائے اعلام نے اپنی توجہات خاصہ کو قرآنی مطالب کے استنتاج پر وقف رکھا۔ اور اس بحرِ ذخار سے نایاب موتیوں کی دولت حاصل کی اور بالآخر ان کو ناپید نہ کر سکے اور یہ سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا۔

(۶) قرآن پاک میں محکمات و متشابہات ہر دو قسم کی آیات کو نہایت موزونیت و مناسبت سے خلاق عالم نے ترتیب دیا۔ تاکہ صرف متشابہات کو دیکھ کر معمولی قابلیت کے انسان اس کے مطالب سمجھنے سے مایوسی کا شکار نہ ہو جائیں اور صرف محکمات کو ملحوظ رکھ کر سنجیدہ طبائع اور وقت پسند مزاج اس کو سہل و سلیس قرار دے کر سرے سے نظر انداز کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں پس ہر مزاج و طبع کے انسانوں کی جاذبیت کے لئے ذاتِ علیم و حکیم نے ایک ایسا مکمل و منظم کلام بھیجا جس سے ہر مزاج اور طبیعت کا انسان اپنی حیثیت کے مطابق مطلب تک رسائی حاصل کر سکے اور حسبِ لیاقت اس کی شیرینی سے بہرہ اندوز ہو کر اپنے دامن کو گوہرِ مراد سے پُر کر سکے۔ تاکہ قرآن مجید ہر دور میں ہر قسم کے مزاج کے انسانوں کے لئے جاذبِ طبع ہو کر مرکز التفات رہے۔

(۷) محکم و متشابہ کی تقسیم کو ذاتِ ربّ العزت نے مسلمانانِ عالم کے لئے ایک امتحان گاہ قرار دیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ تسلیم کس کو ہے اور عناد کس میں ہے؟ اور حکم فرمادیا کہ محکمات کی پیروی کریں اور ان کو چھوڑ کر اپنی نظریاتی غلطیوں میں آیاتِ متشابہات کی آڑ لے کر راہ گمراہی اختیار نہ کریں۔ چنانچہ راسخین فی العلم کی مدح فرمائی کہ یہ لوگ تسلیم والے ہیں اور محکم و متشابہ پر کلیتہً

ایمان رکھتے ہیں اور دوسروں کی مذمت فرمائی کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہ آیاتِ محکمات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ فتنہ پروری کے لئے متشابہ آیات سے غلط طور پر مطلب برآری کے درپے ہوتے ہیں۔

(۸) بحوالہ احتجاج طبرسی جناب امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں مروی ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ خداوند کریم کو علم تھا کہ لوگ قرآن مجید سے من مانے مطالب نکال کر اس کے احکام میں تغیّر پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہذا اس نے اپنے کلام کو تین حصّوں میں منقسم فرمادیا۔ ایک قسم تو ایسی ہے کہ اس کو عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری قسم ایسی ہے کہ جن کے ذہن صاف، حس لطیف اور تمیز صحیح ہے اور خدا نے اس کے سینے علم کی خوبیوں کو سمجھنے کے لئے کھول دیئے ہیں۔ بس وہی سمجھتے ہیں۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس کو خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اور یہ اس لئے کیا کہ خدا کو معلوم تھا کہ باطل پرست طبقہ میراثِ رسولؐ پر غاصبانہ تصرّف و قبضہ کرے گا۔ پس ان کو اس قسم کے غلط اقدامات کرنے کے باوجود علم قرآن کے دعوے کی جرأت نہ ہو سکے۔ بلکہ جب بھی ان کے سامنے علم کتاب کے متعلق کوئی سوال پیش آئے تو جو لوگ درحقیقت عالم قرآن اور اللہ کے سچّے ولی ہیں۔ ان کو مجبورًا ان کے دروازہ پر جبہ سائی کرنا پڑے (جس سے حقیقی وارثِ قرآن اور غلط دعوے دار کے درمیان فرق کرنا آسان ہو) پس خداوند کریم نے قرآن مجید میں آیات متشابہات نازل فرما کر عوام کے سامنے علماء کے فضل کا معیار قائم فرمادیا اور باطل کے مقابلہ میں اس کو صداقت کا مینار مقرر کیا۔ اگر قرآن کی آیات سب محکمات ہوتیں تو ہر مسندِ رسول کا قابض عالمِ قرآن کہلاتا اور سچّے و جھوٹے کی تمیز نہ ہو سکتی۔

سوال: ایک مقام پر خداوند کریم نے تمام قرآن کو محکم بتایا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ آیَاتُہٗ (یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں) اور دوسرے مقام پر تمام قرآن کو متشابہ بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا۔ (ترجمہ) اللہ نے نازل فرمائیں سب سے اچھی باتیں وہ کتاب متشابہ ہے) اور اب یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ نہ سب آیات محکمات ہیں اور نہ سب کی سب متشابہ ہیں بلکہ بعض محکم اور بعض متشابہ ہیں۔

جواب: جس مقام پر پوری کتاب کو محکم بیان فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے معانی میں وہ پختگی اور اس کے مطالب میں وہ سنجیدگی ہے جس میں تاقیامت کوئی خلل نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس کے دلائل و براہین اس قدر ٹھوس اور مضبوط ہیں کہ تاقیامت ناقابلِ تردید ہیں اس کے اوامر و نواہی میں وہ مصالح و مقاصد ملحوظ ہیں جو اوارِ مختلفہ اور ازمنۂ متفادتہ میں اذہانِ متفرقہ کی عیب جوئی سے بالاتر ہیں اور تاقیامت ناقابلِ تنسیخ و ترمیم ہیں۔ اس کے قصص و واقعات ایسے حقائق پر مبنی ہیں۔ کہ علمائے کتب سابقہ اور ماہرین آثارِ متقدمہ اس کو غلط بیانی سے نسبت نہیں دے سکتے آئندہ کی خبریں اسقدر صحیح اور مبنی برحقیقت ہیں کہ حرف بحرف ان کے مطابق واقع ہونے کی کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ گویا ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے ہر دور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لئے اس کی پختگی و مضبوطی ناقابلِ انکار حقیقت ہے اس لئے فرمایا کہ اس کتاب مقدس کی آیات محکم ہیں۔

اور جس مقام پر فرمایا۔ کہ یہ کتاب متشابہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اوّل سے لے کر آخر تک حسن و صداقت، درستی و صحت

پختگی و مضبوطی اور بے عیب ولاریب ہونے میں اس کتاب کی تمام آیات ایک دوسری سے ملتی جلتی ہے اور ایک ہی جیسی ہیں جس طرح کہ ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ اگر یہ قرآن غیراللہ کا کلام ہوتا تو اس میں کافی اختلاف پایا جاتا۔ یعنی بعض پختہ بعض غیر پختہ۔ کچھ حصہ مطابق واقع کچھ خلافِ واقع اور کہیں فصاحت و بلاغت۔ کہیں عامی خطابات۔ غرضیکہ تفاوت اور تہافت کا ایک مرقع ہوتا۔ لیکن چونکہ خالق کا کلام ہے لہٰذا اس کی سب آیات ایک جیسی ہیں۔ اس میں کہیں نہ کمزوری ہے نہ غلطی، نہ جائے تردید ہے نہ مقام ترمیم۔ اور یہی اس کے خدائی کلام ہونے کی اٹل دلیل ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تمام اوصاف حسنہ اور خصائل حمیدہ کی جامعیت میں قرآن کی تمام آیات ایک دوسری کے متشابہ اور ایک جیسی ہیں اور اسی لحاظ سے تمام کا تمام محکم اور متقن ہے اس میں کوئی رخنہ یا کمزوری نہیں۔ لیکن مطالب کی سہل بیانی اور دقت طلبی میں اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سہل جس کو ہر ایک سمجھ سکے پس وہ اس اعتبار سے محکم ہے اور دوسری وہ جس کو سمجھنے کیلئے بلند ذہن و ذکا اور فہم رسا چاہیئے یعنی بعض تک علماء کی رسائی ہو سکتی ہے اور بعض کا حل راسخون فی العلم کی رہبری کا مرہون منت ہے۔

تفسیر برہان میں کافی سے مروی ہے کہ آیات محکمات کی تاویل حضرت امیرالمومنین علیہ السلام اور باقی آئمہ طاہرین اور آیاتِ متشابہات کی تاویل فلاں فلاں اور فلاں ہیں اور فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ الخ سے مراد ان کے ساتھی اور اُن سے دوستی رکھنے والے لوگ ہیں۔

اَلرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ

روایات اہلبیت علیہم السلام میں تواتر سے ثابت ہے کہ رسولؐ اللہ کے بعد راسخین فی العلم سوائے اہلبیت عصمت کے اور کوئی نہیں ہے چنانچہ بعض کو تبرکاً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) ابوبصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم راسخین فی العلم ہیں اور ہم ہی اس کی تاویل جانتے ہیں

(۲) امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ راسخین فی العلم میں سے افضل فرد حضرت رسالتمآبؐ ہیں۔ اور جو کچھ بھی خداوند کریم نے نازل فرمایا۔ اس کی تاویل و تنزیل کا ان کو علم تھا اور کوئی چیز خدا نے ایسی نازل نہیں فرمائی جس کا آنجنابؐ کو علم نہ ہو اور حضور رسالتمآبؐ اور اُن کے بعد ان کے اوصیاءؑ سب کا علم رکھتے ہیں۔ نیز آپؑ نے فرمایا کہ قرآن میں خاص بھی ہے عام بھی۔ محکم بھی اور متشابہ بھی اور ناسخ بھی اور منسوخ بھی، لیکن راسخین فی العلم ان تمام کو جانتے ہیں۔

(۳) ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآن زاجر بھی ہے اور آمر بھی۔ جنت کا امر کرتا ہے اور دوزخ سے زجر کرتا ہے اس میں محکم بھی ہیں اور متشابہ بھی۔ پس محکمات کا تعلق ایمان و عمل ہر دو سے ہے اور متشابہات کا تعلق ایمان سے ہے اُن پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد آپ نے آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی۔ اور آخر میں فرمایا۔ کہ آلِ محمدؐ ہی راسخین فی العلم ہیں۔

ہم نے تفسیر کی جلد اوّل یعنی مقدمہ تفسیر میں بھی اس پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے اور اس مطلب کو متعدد عناوین کے تحت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ احادیث کے علاوہ صحابہ کرام کی تصریحات بھی نقل کی ہیں جس سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ وقارِ علمی میں علیؑ کے ہم پلہ صحابہ میں سے کوئی نہ تھا۔ حتٰے کہ ابن عباس کا قول ہے کہ میرے اور جناب رسالتمآبؐ کے تمام صحابہ کے علم کو حضرت علیؑ کے علم سے وہ نسبت ہے جو ایک قطرۂ آب کو سات سمندروں سے حاصل ہے۔

اِس بناء پر آیت مجیدہ میں اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا عطف لفظ اللّٰہ پہ ہے اور مقصد یہ ہے کہ تاویل آیات قرآنیہ کے علم کا حصر ہے۔ اللّٰہ میں اور راسخون فی العلم میں۔ اور ان کے سوا اس کو کوئی جانتا ہی نہیں اور اس کے بعد یَقُوْلُوْنَ الخ محلاً منصوب اور حال ہے راسخون فی العلم سے پس لفظ اللّٰہ پر وقف درست نہیں۔ اور معنی آیت وہی ہے جو تحت اللفظ موجود ہے۔

اور اس آیت کی دوسری ترکیب اس طرح ہے کہ لفظ اللّٰہ پر وقف اور جملہ کو تام مانا جائے اور اس کے بعد واؤ کو بجائے عطف کے استینافیہ قرار دیا جائے اور اَلرَّاسِخُوْنَ کو مبتدا قرار دے کر یَقُوْلُوْنَ اس کی خبر ہو، اور آیت مجیدہ کا اِس ترکیب کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ متشابہ کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا۔ مگر صرف اللّٰہ۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ اس چیز کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہی ہیں یعنی تاویل کا علم تو صرف اللّٰہ کے پاس ہے اور لوگوں کی اس بارے میں دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو من مانی تاویلیں کر کے متشابہات کی اتباع کرتے ہیں اور وہ وہی ہیں جن کے دل حق سے پھرے ہوئے ہیں اور جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور وہ متشابہات کا اللّٰہ کی جانب سے ہونا تسلیم کرتے ہوئے ٹھہر جاتے ہیں اور اپنی جانب سے اس میں رائے زنی نہیں کرتے لیکن اگر صحیح تدبر کرتے ہوئے حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ترکیب اور معنی بالکل صاف و سیدھا اور موزوں و مناسب ہے اور دوسری ترکیب اور معنی میں مخالفت واقع بھی ہے اور مخالفت عمل بھی۔ نیز مخالفت عقل بھی ہے اور مخالفتِ نقل بھی۔

مخالفت واقع تو اس لئے ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیاتِ قرآنیہ میں تدبّر اور تفکّر کی دعوت دی ہے تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ صرف محکمات میں ہی تدبّر کریں کیونکہ محکمات کا تو مطلب ہی صاف ہوتا ہے۔ اور اُن میں مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس سے مراد آیات محکمہ کے علاوہ دوسری آیات ہی ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ان کا علم صرف اللّٰہ ہی کی ذات میں منحصر ہے تو عام لوگوں کو اُن میں تدبّر و تفکر کی دعوت دینا عبث ہے اور لطف یہ ہے کہ خداوند کریم نے ان لوگوں کی جابجا مذمّت فرمائی ہے۔ جو آیات میں تدبّر نہیں کرتے پس معلوم ہُوا کہ ان آیات کا علم خدا نے اپنی ذات میں منحصر نہیں فرمایا بلکہ راسخون فی العلم کو بھی ان کا علم دیا ہے۔ اور لوگوں کو ان میں تدبّر کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

سوال:۔ اگر تدبّر فی القرآن اور تفکّر کی دعوت عام ہے تو پھر اس مقام پہ ان کی مذمّت کیوں ہے؟ کہ فرماتا ہے جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔

جواب:۔ مذمّت اس لئے نہیں کہ وہ تدبّر کیوں کرتے ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ فتنہ جوئی اور فساد کی خاطر وہ متشابہات

کو اپنے مطلب فاسد اور مقصدِ کاسد پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا اُن کا متشابہات کے درپے ہونا حق طلبی کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ فتنہ پروری کے لئے ہی ہوتا ہے۔

سوال :۔ اگر راسخون فی العلم متشابہات کی تاویل صحیح طور پر جان سکتے ہیں ۔ اور ان کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا ۔ کیونکہ متشابہ کی تاویل کا علم اللہ اور راسخون فی العلم میں بند ہے تو پھر وہی اعتراض تو واقع ہوگا کہ خدا نے باقی مخلوق کو قرآن میں تدبر کرنے اور تفکر کرنے کی دعوت کیوں دی جب کہ ان کا علم سوائے اللہ اور راسخین کے کوئی حاصل ہی نہیں کر سکتا ۔ اور راسخین سے مراد صرف آلِ محمدؐ ہیں جس طرح کہ احادیثِ آئمہ میں تواتر سے یہ مطلب منقول ہے تو گویا تدبّر کا حکم بھی صرف انہی کے لئے ہی ہے اور ان کے علاوہ باقی لوگ اگر تدبّر کریں تو وہ تفسیر بالرائی کے مرتکب ہوں گے ۔

جواب :۔ قرآن مجید چونکہ خالق کا کلام ہے اور اس میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو کسی کلام میں ہو سکتی ہے لہٰذا اس کے جملہ پہلوؤں پر پوری طرح اطلاع صرف اسی کی ذات کو ہی ہو سکتی ہے جس نے اس کو نازل فرمایا اور اس کے تمام رموز و نکات پر عبور کامل بھی اسی کی ذات کے لئے ہے جس نے اس کو خلق فرمایا ہے۔

اور ظاہری اعتبار سے اگرچہ ایک کلام میں احتمالاتِ متعددہ پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کرتا کہ ہر پیدا ہونے والا احتمال جو قواعد عربیہ یا محاوراتِ اہلِ لسان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ وہ خواہ مخواہ مرادِ متکلم بھی ہو چنانچہ ہر معمولی قابلیّت کا انسان اس حقیقت کا معترف ہے بلکہ یہ چیز فطرتِ سلیمہ کے مسلمات میں سے ہے ۔ پس خداوند کریم نے اپنے مقدس کلام کو جس پاک وجود پر نازل فرمایا ۔ اس کو قرآن کا علم بھی ساتھ ساتھ عطا فرمایا ۔ کیونکہ اگر قرآن لانے والے کو قرآنی علوم پر عبور تام حاصل نہ ہو ۔ تو اس کا قرآن لانا سوائے مضحکہ کے اور کچھ نہیں ۔ اور اسی طرح جن کو تا قیامِ قیامت قرآنی تبلیغات پر مامور فرمایا اور جناب رسالتمآبؐ نے صحابہ کے بھرے مجمع میں اپنے بعد کے لئے ان کی خلافت کا اعلان فرمایا اور دیگر فرامین میں متعدد مقامات پر اُن کا قرآن کے ساتھ ہونا اور قرآن کا ان کے ساتھ ہونا ذکر فرمایا جس طرح کہ حدیث ثقلین جو تواتر سے فریقین کی کتب میں منقول ہے ۔ ان لوگوں کو بھی قرآنی علوم کماحقہٗ عطا فرمائے ۔ پس جسطرح کہ جناب رسالتمآبؐ عالم قرآن تھے اسی طرح وہ بھی عالم قرآن ہیں اور اگر قرآن کا علم صرف اللہ نے اپنی ذات تک محدود رکھا ہوتا ۔ اور مبلغین کو اس سے بہرہ ور نہ فرمایا ہوتا تو صرف کتاب کا کسی کو عطا کر کے بھیجنا فضول ہوتا اور اس کی حیثیّت ایسی ہوتی جس طرح ایک چِٹھی رساں ایک خط کسی مکتوب الیہ کی طرف پہنچائے ۔ جس کو نہ وہ خود پڑھ سمجھ سکے اور نہ مکتوب الیہ کو اس سے کچھ حاصل ہو ۔ اور اس صورتِ حال پر مطلع ہونے والا سنجیدہ طبقہ چِٹھی رساں، یا مکتوب الیہ کو قابلِ ملامت ہرگز نہ سمجھے گا ۔ بلکہ خط بھیجنے والے کی عقل و دانش کا ماتم کرے گا اور خداوند علیم و حکیم اس قسم کے نقائص سے بلند و بالا اور اجل و اعلےٰ ہے پس اس نے اپنی کتاب کا علم مبلّغین کتاب کو کماحقہٗ عطا فرمایا ۔ اور انہی کو راسخین فی العلم کے مقدس لقب سے سرفراز فرمایا اور لوگوں کو ان کے علم حاصل کرنے اور اس میں تدبّر کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ راسخین فی العلم کے دروازہ پر جبہ سائی کر کے ان سے فیوضِ معرفت حاصل کریں اور مطالب حقۂ قرآنیہ تک دسترس حاصل کر کے اپنے قلوب

کو انوارِ علوم قرآنیہ کی روشن قندیلوں سے منور کریں۔

اسی بناء پر ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو اپنی عقل فاسد اور ذہن کا سد سے قرآنی مطالب کا استنتاج کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور قرآن والوں سے مطالب صحیحہ تک رسائی کا درس حاصل نہیں کرتے اور اسی چیز کو احادیث نبویہ میں تفسیر بالرائے سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کی پرزور مذمت کی گئی ہے جو قرآن کی تفسیر اپنی آرائے فاسدہ سے کرتے ہیں اور جہاں تدبّر و تفکّر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور اُن کی محنتوں اور ذہنی کاوشوں کو سراہا گیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو احادیث نبویہ اور فرامین عترت طاہرہ کی روشنی میں قرآنی مطالب میں غور و خوض کرتے ہیں۔

پس قرآنی جملہ علوم اور محکمات و متشابہات کی تمام تر معلومات کا راسخین فی العلم میں بند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر نہ ہو اور ان کے علومِ دینیہ کا مرکز ایک ہو جو ان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تشتت و افتراق کی وبائی روحانی امراض سے بچائے رکھے کیونکہ مرکز علم کی وحدت سے بڑھ کر کسی قوم کی وحدت کو برقرار رکھنے کیلئے اور کوئی علاج کارگر ہے ہی نہیں جس طرح کہ اقوامِ عالم کی تاریخ کا سچا مطالعہ اس کا شاہد ہے۔

پس خداوند کریم نے ایک طرف تدبّر اور تفکّر کی دعوت عام دے دی۔ اور دوسری طرف مرکز علم کو مستحکم اور مضبوط کرکے اختلافی مسائل حل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی تاکہ نہ ان میں قرآن فہمی کی شوق کم ہو اور نہ اپنی آراء و قیاسات میں پڑ کر راہِ حق سے دُور نکلنے پائیں یا یوں سمجھئے کہ علوم قرآنیہ کی طرف شوق و شغف کا اضافہ بھی ہوتا رہے اور راسخین کی ہدایات کے ماتحت حدود متعینہ سے باہر جانے کی نوبت بھی نہ آئے۔

پس قرآن کے علوم کا راسخین فی العلم میں منحصر ہونا عوام الناس کے تدبّر فی القرآن کی دعوت سے کوئی منافات نہیں رکھتا ہاں! اگر متشابہات کا علم صرف ذاتِ خدا میں منحصر قرار دیا جائے تو پھر تدبّر و تفکّر کی دعوت قطعاً بے محل ہے کیونکہ نہ تو انسان خود اپنی ذہنی صلاحیتوں سے مطالب واقعیہ تک دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی صحیح تاویل صرف اللہ کے پاس ہی ہے اور نہ اس بیں کسی سے رہبری حاصل کر سکتا ہے پس تدبّر و تفکّر کا نتیجہ اس صورت میں صرف تفسیر بالرائے ہے جس سے پرزور منع کیا گیا ہے لہذا صحیح مطلب اسی صورت میں نکلے گا کہ اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا عطف اللہ پر ہو اور ساتھ ساتھ یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا نے ان کو قرآن کے محکمات و متشابہات کا کامل علم عطا فرمایا ہے اس سے تدبّر و تفکّر کا حکم بھی صحیح ہے کیونکہ مقام خطا پر راسخین کی طرف رجوع کرکے مطالب صحیحہ تک رسائی ممکن ہے اور اس میں تفسیر بالرائے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

مخالفت عمل صدر اوّل سے لے کر آج تک علمائے مفسرین نے قرآن مجید کی تمام آیات کی تفاسیر اور حل مطالب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور کسی مشکل سے مشکل ترین آیت کی تفسیر کو اس لئے ترک نہیں کیا کہ یہ متشابہ اور اس کا علم صرف ذاتِ احدیت تک ہی محدود ہے اس بیں فرق نہیں کہ علمائے مفسرین شیعہ ہوں یا سُنی تمام کا یہی رویہ رہا ہے پس یہ عمل صاف بتلاتا ہے کہ وَالرَّاسِخُوْنَ کا عطف اللہ پر ہے اور بعد میں آنے والا جملہ مستانفہ نہیں بلکہ راسخین سے حال ہے۔

مخالفتِ عقل :- قرآن میں آیاتِ متشابہات نازل فرما کر اس کا علم کسی کو نہ دینا قرآن مجید کے تاقیامت ہادی ہونے کو باطل کرتا ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ خدا مبلغین کو تبلیغ امور قرآنیہ پر مامور فرمائے اور ان کو قرآن کے اکثر مطالب کا واقعی علم نہ عطا کرے۔ جس طرح کہ گذشتہ بیان میں تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے پس معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن تاقیامت ہادی ہے اس کے ساتھ ساتھ مبلغین قرآن کا سلسلہ بھی تاقیامت جاری ہے جو تمام قرآنی رموز ونکات کا واقعی علم رکھتے ہیں ان کو محکم و متشابہ عام وخاص۔ ناسخ و منسوخ، مطلق ومقید، تاویل و تنزیل اور ظاہر و باطن وغیرہ کا کماحقہٗ علم حاصل ہے اور وہ صرف محمدؐ و آلِ محمدؐ ہی ہوسکتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل تفسیر کی جلد اوّل میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور **مخالفتِ نقل** اس لئے ہے کہ کتب فریقین میں یہ چیز مسلّم حیثیت رکھتی ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے عالم قرآن ہونے پر تقریباً تمام صحابہ متفق تھے اور جناب رسالتمآبؐ کا فرمان اس مطلب پر نص قاطع ہے اور تاریخ صاف صاف بتلاتی ہے کہ صحابہ کرام قرآن کے مشکل مسائل کا حل حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے ہی طلب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر کے یہ الفاظ تواتر سے منقول ہیں۔ لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا۔) چنانچہ مقدمہ تفسیر کے صـ۸۷، صـ۸۸ پر بحوالہ جات کتب اس مطلب کو بیان کیا جاچکا ہے۔

احادیث ائمہ اس بارہ میں تواتر سے منقول ہیں کہ تمام قرآن کا علم اہلبیت عصمت کے پاس ہے چنانچہ جلد اوّل صـ۱۳۸، صـ۱۳۹ میں بعض احادیث کو میں نے نقل کیا ہے اور تاریخ بتلاتی ہے کہ ہر دَور میں جب قرآنی مسائل مشکلہ میں علمائے مذاہب لاجواب ہوجاتے تھے تو ائمہ اہلبیت کی طرف رجوع کرنے کے بغیر ان کو کوئی چارہ نہ ہوتا تھا۔ پس ان حقائق پر نظر دوڑانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا عطف لفظ اللہ پر ہے اور آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ تاویلِ آیات متشابہ کو سوائے خدا اور راسخین فی العلم کے اور کوئی نہیں جانتا۔

تاویلِ قرآن :- تاویل کا لغوی معنی ہے پلٹانا۔ لیکن یہاں مراد ہے معنی کی بازگشت اور بازگشت سے مراد اس طرح نہیں جس طرح کہا جاتا ہے کہ غلام کی بازگشت آقا اور عدد کی بازگشت واحد ہے بلکہ یہاں بازگشت سے مراد رجوع خاص ہے اور تاویل قرآن سے مراد وہ حقیقی وخارجی واقعہ یا مصلحت جس پر کلام کا اعتماد ہو۔ اور وہ اس کلام کا سچا مصداق ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں تاویل کے متعدد استعمالات پر عبور کرنے سے اس حقیقت کا صحیح انکشاف ہوسکتا ہے۔

(۱) کیل و وزن کی درستی و استقامت کے امر کے بعد فرماتا ہے ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ یعنی کیل و وزن کی صحت و استقامت کی تاویل بہت خوب ہے اور اس سے مراد تمدنی و اجتماعی خوشحالی ہے۔

(۲) کافروں کے بارے میں فرماتا ہے۔ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں افترا ہیں پھر فرماتا ہے کہ انہوں نے ایسی شئے کی تکذیب کی ہے۔ جس کے علم کا ان کو احاطہ نہیں ہے اور نہ اس کی تاویل ان کے پاس پہنچی ہے۔ یعنی قیامت کی خبروں کو انہوں نے جھٹلایا تھا۔ اور رسول پاکؐ کی طرف نسبت افترا کی دی تھی۔ پس خداوند کریم نے قیامت کے دن میں واقع ہونے والے امور کو جو قرآنی خبروں کے

مصداق ہیں، تاویل کا نام دیا ہے۔

(۳) حضرت خضرؑ کے کشتی کو توڑنے اور لڑکے کو قتل کرنے اور دیوار بنانے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کرنے کے بعد اُن کا کہنا ہے کہ میں آپ کو ان چیزوں کی تاویل بتلاتا ہوں تو ان مصالح واقعیہ کو اُن امور کی تاویل کہا گیا۔ جو حضرت خضرؑ سے صدور پذیر ہوئے تھے۔

(۴) حضرت یوسفؑ کے قصہ میں تعبیرِ خواب کو متعدد مقامات پر تاویل سے یاد کیا گیا۔

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاویل سے مراد وہ حقائق خارجیہ اور مصالح واقعیہ ہیں جن پر آیاتِ قرآنیہ کے معارف و علوم شرائع و احکام اور جملہ قصص و حکایات کا مدار و اعتماد ہے اور اس کا ماحصل اور خلاصہ یوں سمجھئے کہ قرآن کے معانی اور جملہ مضامین میں جہاں تک عام انسانی عقول کی رسائی ہے یہ قرآن کا جسم ظاہری ہے اور اس کے پس پردہ ایسے حقائق و دقائق اور مصالح و حکم موجود ہیں جو رُوحِ قرآن ہیں اور اُسی کو اُم الکتاب، کتاب حکیم اور کتاب مکنون کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

اور قرآن مجید کے تمام معارف و احکام کی بازگشت اور جائے اعتماد وہی ہیں وہ نہ الفاظ ہیں اور نہ معانی و مضامین ظاہریہ کی قسم سے ہیں اسی لئے اُن تک نہ افہام عامہ کی رسائی ہے اور نہ عقولِ بشریہ اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی بناء پر فرماتا ہے۔ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۔ اُس کو مس نہ کر سکنے کا مطلب ہے کہ اُس کے حقائق واقعیہ اور معارفِ باطنیہ جو الفاظ مبنیہ اور مضامینِ منتقنہ کا مآل و مرجع ہیں۔ اُن تک سوائے نفوسِ قدسیہ اور ذواتِ مطہرہ کے کسی کی رسائی نہیں اور آیۂ تطہیر اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ الخ سے اُن ذواتِ مقدسہ کی تعین بھی فرما دی جو پاک اور مطہر ہیں۔ کہ وہ اہلبیت عصمت اور خانوادۂ نبوت ہیں پس یہاں ہمیں دو عنصر معلوم ہو گئے۔

(۱) آیاتِ الٰہیہ کی تاویل یعنی مضامین قرآنیہ کے حقیقی مصداقات کو کوئی نہیں جان سکتا مگر اللہ اور راسخون فی العلم۔

(۲) کتاب مکنون کو کوئی نہیں مس کر سکتا مگر وہ جو مطہر ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تاویل قرآن کا علم اور مس ایک چیز ہے اور راسخین فی العلم اور مطہرین ایک ہی خانوادہ ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ راسخین فی العلم اور مطہرین تاویل کا علم رکھتے ہیں — نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ تاویل کا تعلق صرف آیاتِ متشابہ سے نہیں بلکہ آیاتِ محکمات سے بھی ہے اور اسی کو تو قرآن مجید کا باطن کہا جاتا ہے۔ جس کا تعلق تمام آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ ہے اور اس کی ظاہری مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح انسان نکاح کرتا ہے تو اس کا ظاہری مفہوم ہے۔ تکمیلِ خواہشاتِ جنسیہ۔ لیکن اس کا اتباع سنتِ رسولؐ ہے اور اس کے باطن میں انسان کی تنظیم اور بے راہ روی سے اجتناب کرتے ہوئے جنبۂ انسانیت کی تکمیل ہے نیز پھر اسی کے باطن میں انسان کی تمدنی اور اجتماعی زندگی کے فطری تقاضوں کے پورا ہونے کا راز بھی پنہاں ہے پھر اس کے اندر بقاء نوعِ انسانی کا راز بھی مضمر ہے اور اس کا آخری مقصد ہے نعماتِ جنت کی تحصیل جو کمال رُوح کی آخری منزل ہے۔

پس نکاح کا ظاہری اور سرسری معنی ہے خواہشاتِ جنسیہ کا دفاع لیکن اس کا ایک باطن ہے اور باطن در باطن یہانتک کہ

تدریجاً کئی بواطن ہیں اور اسی طرح آخری باطن تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ پس معمولی دماغ کا آدمی صرف ظاہری معنی سمجھتا ہے اور بلند پایہ لوگ اذہان وافکار کے مدارج کے لحاظ سے اس کے مراتب باطنیہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کا ایک ہے ظاہری ترجمہ اور اُن مطالب ومضامین اور احکام وفرامین کا سمجھنا جن تک عقولِ انسانیہ اور افکارِ بشریہ اپنی اپنی خداداد استعدادات سے رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور ایک ہے اس کا باطن جو ان معانی اور مطالب ظاہریہ کے لئے بحیثیت رُوح کے ہے جس کو عام انسانی عقول وافکار مس تک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کی دسترس سے بلند و بالا ہے اور اس کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کے اذہان وقلوب ہر قسم کے ارجاس باطنیہ سے پاک ومطہر ہوں جیسے ارشاد ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔

پس قرآن مجید کا ظاہری ترجمہ اور اپنے ذہنی استعدادات کے ماتحت اس کے مطالب کا استنتاج اور اس کے احکام وفرامین تک دسترس حاصل کرنے کے لئے غور وخوض اور متعدد معانی میں سے باعتبار قرائن کے بعض کی بعض پر ترجیح وغیرہ یہ سب کچھ تفسیر قرآن ہے جس پر ہر شخص موفق ہو سکتا ہے اور متشابہ آیات کو محکمات کی روشنی میں حل کرنا بھی اسی کے تحت میں ہے اور محکمات کو ام الکتاب کہنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آیات متشابہ کا حل انہی کی روشنی میں ہوتا ہے لیکن وہ امور خارجیہ اور مصالح واقعیہ جو قرآن کے معانی ومفاہیم اور مطالب ومضامینِ ظاہریہ کا مرجع ومآل اور مصداق حقیقی ہیں وہ باطنِ قرآن اور رُوح ہیں اور انہیں تاویل سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا علم سوائے خدا اور راسخین فی العلم کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے پس اس بیان سے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق کی وضاحت ہو گئی اور تفسیر وتاویل کے درمیان مفسرین نے کئی فرق بتائے ہیں۔

(۱) تفسیر اس لفظ کا معنی بیان کرنا جسمیں متعدد احتمالات نہوں اور تاویل سے مراد ہے متعدد احتمالات میں سے ایک کو ترجیح دینا۔

(۲) تفسیر معنی کی دلیل کو بیان کرنا اور تاویل معنی کی حقیقت کو ظاہر کرنا۔

(۳) تفسیر معنی ظاہری کو بیان کرنا اور تاویل معنی مشکل کو واضح کرنا۔

(۴) تفسیر کا تعلق روایت اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے۔

لیکن قرآن کی وہ آیات جن میں تاویل کا استعمال ہوا ہے اُن کی روشنی میں ان اقوال کی کوئی وقعت واہمیت نہیں رہتی۔ پس تحقیق وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے بعض آیات کی جو تاویلیں منقول ہیں وہ ہمارے بیان کی تصدیق وتائید کے لئے کافی ہیں اور اسی تفسیر کے مقدمہ صفحہ ۹ پر بھی تفسیر، تاویل پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ

تحقیق جو لوگ کافر ہیں ہرگز نہ فائدہ دیں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد

مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا ؕ وَاُولٰۤـئِكَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِۙ ﴿۹﴾ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ

اللہ سے (بچانے میں) کچھ بھی۔ اور وہی جہنم کا ایندھن ہوں گے جس طرح فرعون کے تابعدار

وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ‌ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ

اور ان سے پہلے کے لوگ جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیات کو پس ان کو گرفتار کرلیا خدا نے اپنے گناہوں کے

وَاللّٰهُ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ‏ ﴿۱۰﴾ قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَ

سبب اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے فرما دیجئے کافروں کو کہ تم عنقریب مغلوب ہوگے اور

تُحۡشَرُوۡنَ اِلٰى جَهَنَّمَ‌ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ‏ ﴿۱۱﴾

جمع کئے جاؤ گے طرف جہنم کے جو بُرا ٹھکانا ہے

رکوع ۱۱

قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا۔ اس کے شانِ نزول کے متعلق تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ جنگ بدر فتح کرکے واپس مدینہ میں تشریف لائے تو یہودیوں کو بازار بنی قینقاع میں جمع کرکے فرمایا۔ اے گروہ یہود۔ وہ عذاب جو قریش پر نازل ہوا ہے تم بھی اللہ سے اس کا خوف کرو۔ اور اُن جیسا عذاب اترنے سے پہلے تم اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاؤ۔ حالانکہ تم کو علم ہے کہ تمہاری کتابوں کی رو سے میں نبی مرسل ہوں۔ یہودی یہ سُن کر کہنے لگے۔ اے محمدؐ آپ ہرگز دھوکہ میں نہ پڑیں کیونکہ وہ ناتجربہ کار قوم تھی جو قواعد حرب وضرب سے بالکل بے بہرہ تھی پس موقعہ پاکر آپ نے ان کو شکست دے دی ہے۔ ہمیں ان جیسا نہ سمجھئے خدا کی قسم اگر ہمارے ساتھ لڑائی ہوتی تو پتہ چل جاتا کہ ہم کیسے جوانمرد ہیں۔ تب یہ آیت اتری کہ ان کو فرما دیجئے کہ تم مغلوب ہوگے اور قیامت کے دن بھی جہنم تمہارا حشر ہوگا۔ اب موقعہ ہے کہ بدر کی لڑائی اور مسلمانوں کی فتح یابی سے عبرت حاصل کرو۔ کیونکہ مسلمان تھوڑے سے اور کافر تعداد میں زیادہ تھے لیکن خدا کی نصرت مومنوں کے شامل حال تھی اور باوجود قلیل تعداد کے غالب اور فتحیاب رہے۔

کہتے ہیں کہ بعض یہودیوں نے یہ کہا تھا کہ واقعی یہ وہی رسول ہے جس کے متعلق ہم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی اور ہماری کتب میں اس کا تذکرہ ہے اور اس کی صفات بھی اس سے ملتی جلتی ہیں کہ اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا پھر ایک دوسرے کو کہنے لگے

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى

تحقیق تمہارے لئے نشانی تھی ان دو گروہوں میں جو ایک دوسرے سے لڑے ایک گروہ تو لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا

كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

کافر تھا۔ کہ ان کو اپنے سے دوگنا سمجھتے تھے آنکھوں کے دیکھنے سے اور اللہ تائید فرماتا ہے اپنی مدد سے جس کی چاہے

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ۝۱۳

تحقیق اس میں البتہ عبرت تھی صاحبانِ بصیرت کے لئے

کہ فی الحال جلدی کی ضرورت نہیں۔ ایک آدھ تجربہ اور بھی کر لینا چاہیئے پس جب اُحد کی جنگ میں مسلمانوں نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور بھاگ گئے تو یہودیوں کا پہلا عقیدہ جاتا رہا اور اپنے کفر پر پختہ ہو گئے نیز قوم یہود کا جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ غیر جانبداری کا عہد تھا لیکن انہوں نے مدت عہد کے اندر اندر عہد شکنی کی جس کی پاداش میں ان کو قتل یا جلا وطن ہونا پڑا۔ جیسا کہ تاریخ میں موجود ہے۔

جنگِ بدر کی طرف اشارہ

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ :۔ اس کے معنی میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ خطاب کافروں سے ہو اور جناب رسالتمآبؐ کے قول کا اس کو تتمہ قرار دیا جائے اور دوسرا یہ کہ خطاب مومنین سے ہو۔ بہر کیف آیت میں جنگِ بدر کی طرف اشارہ ہے اور یہودیوں کے لئے تنبیہ اور درسِ عبرت ہے۔ یا مومنین کے لئے ثابت قدمی کی تلقین اور نصیحت ہے

جنگِ بدر اسلامی لڑائیوں میں سے سب سے پہلی لڑائی ہے جو مسلمانوں اور کفارِ قریش میں واقع ہوئی تھی اس میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی جن میں ۷۷ مہاجر اور ۲۳۶ انصار تھے مہاجرین کے علمبردار حضرت امیر المومنین علیہ السلام تھے اور انصار کا علم حضرت سعد بن عبادہ انصاری کے ہاتھ میں تھا۔ جناب رسالتمآبؐ کی فوج میں ستر اونٹ تھے اور دو گھوڑے ایک مقداد کے پاس اور دوسرا مرثد ابن ابی مرثد کے پاس اور ہتھیار صرف چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ اس طرف کفارِ قریش کے لشکر کی تعداد کافی تھی باختلاف روایات وہ ایک ہزار کے لگ بھگ تھے ان کے پاس ایک سو گھوڑے سوار تھے اور سالار فوج عتبہ بن ربیعہ تھا۔

اس جنگ میں کل ۲۲ مسلمان شہید ہوئے جن میں چودہ مہاجر اور آٹھ انصار تھے اور اس جنگ میں کامیابی کا سہرا حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے سر تھا۔

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ ۔ اس کے معنی میں کئی احتمالات ہیں :۔ (۱) يَرَوْنَ کا فاعل ضمیر جو راجع طرف کفار کے ہے قرار دی جائے اور پہلی ضمیر هُمْ کا مرجع مسلمان ہوں اور دوسری ضمیر هُمْ کا مرجع بھی مسلمان ہوں تو معنی یہ ہوگا۔ خدا نے مسلمانوں کا رعب اُن کے

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

مزین ہے لوگوں کے لئے شہوانی محبت۔ عورتوں سے بچوں سے اور اُن مقیلوں سے جو پُر ہوں سونے اور

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

چاندی سے اور علامت دار گھوڑوں اور چوپاؤں سے اور کھیتی سے

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ

یہ سب سرمایہ ہیں زندگی دنیا کا اور اللہ کے پاس اچھی بازگشت ہے فرما دیجئے کیا

اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ

میں بتاؤں تمہیں اس سے بہتر چیز (وہ یہ کہ) جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اپنے رب کے پاس جنتیں ہیں کہ جاری

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ

ہیں ان کے نیچے نہریں کہ ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں اور بیویاں پاکیزہ اور خوشنودی خدا (بھی) ان کے لئے

اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۝

ہے) اور اللہ نگران ہے بندوں پر

دلوں پر اس قدر جما دیا۔ کہ کافر اُن کو ان کی اصل تعداد سے دگنا خیال کرتے تھے اور ظاہر میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

(۲) باقی ترکیب وہی پہلی صرف آخری ضمیر ھُمْ کا مرجع کافروں کو قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ بوجہ رعب کے کافر مسلمانوں کو اپنی تعداد سے ظاہری نظروں کے لحاظ سے دگنا خیال کرتے تھے۔

(۳) یَرَوْنَ کا فاعل مسلمان ہوں اور دونوں مقام پر ھُمْ ضمیر کا مرجع کفار ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی قوتِ قلب اور تسلی کے لئے خدا نے یہ انتظام فرمایا کہ کافر لوگ ان کو تھوڑے معلوم ہوتے تھے پس مسلمان کافروں کو اپنی تعداد سے صرف دگنا ہی سمجھ رہے تھے۔

حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ مجمع البیان میں جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ میرے بعد مردوں کے لئے عورت سے بڑھ کر اور کوئی نقصان دہ فتنہ نہیں۔ نیز فرمایا کہ یہ شیطان کا جال ہیں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ عورت مجسمہ شر ہے اور اس میں سب شر ہی شر ہے اور یہ ایک ایسا بچھو ہے جس کا ڈسنا شیریں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

جو یہ کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے۔ پس بخش دے ہمارے گناہ۔ اور بچا ہم کو عذاب جہنم سے

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

صابر اور سچے اور اطاعت شعار اور سخی اور پچھلی رات کو استغفار کرنے والے ہیں

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ

شہادت دی اللہ نے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور صاحبانِ علم نے درحالیکہ وہ عدل پر قائم ہیں

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ ؕ

اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ غالب حکمت والا ہے

وَالْبَنِيْنَ ۔ ایک حدیث میں جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے (اولاد) میوۂ دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور باعثِ بزدلی۔ بخل اور حزن وغم بھی ہے۔

وَالْقَنَاطِيْرِ ۔ جمع ہے قنطار کی اور ایک قنطار کی مقدار بیل کی کھال جو سونے سے پُر ہو اور یہ معنی صادقین علیہما السلام سے مروی ہے بعض مفسرین نے دوسرے معانی بھی کئے ہیں۔

اَلْمُسَوَّمَةِ ۔ مسومہ کو سوم سے مشتق قرار دیا جائے تو معنی ہوگا چرنے والے اور سیماء سے مشتق مانا جائے تو معنی خوبصورت ہوگا۔

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۔ مجمع البیان ۔ جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ اللہ فرماتا ہے جب میں اہل زمین پر عذاب کا ارادہ کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ میرے گھروں کے آباد کرنے والے اور میری خوشنودی کے لئے آپس میں محبت کرنے والے اور سحر کے وقت استغفار کرنے والے موجود ہیں تو اہل زمین سے اپنا عذاب ٹال دیتا ہوں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص بوقت سحر نماز وتر میں ستر مرتبہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ ایک سال تک پڑھتا رہے تو وہ اس آیت کا مصداق ہے۔

مقامِ توحید

شَهِدَ اللّٰهُ ۔ پوری آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ اللہ نے شہادت دی یعنی اس کی قدرت کاملہ اور حکمت شاملہ کے مناظر اور مظاہر زمینوں کی وسعتیں پہاڑوں کی بلندیاں دریاؤں کی موجیں بادلوں کی تسخیر آسمانوں کا بغیر ستونوں کے قیام اور ان میں ستاروں کی روشن قندیلیں شمس وقمر کا دورہ اور پھر ان کے اندر مخلوقاتِ عالم کی آبادی اور ہر فردِ خلقت میں اس کی صنعتِ بدیعہ کے بے مثال کرشمے ان سب چیزوں کے کلی و جزوی مصالح و حِکم اور عجیب صنعت و حکمت پر اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ سب خلاقِ عالم کی یکتائی کے اپنے اپنے مقام پر شاہد مبین ہیں اور ان کا نظام اتم واکمل ۔ گویا قادرِ مطلق، خالقِ فطرت، خدائے علیم و حکیم کی بولتی ہوئی زبان ہے جو اس کی قدرت اور حکمت کی بانگ دہل آواز ہے اور بذریعہ وحی مزید وضاحت کے لئے اسی شہادت کا غیر مبہم اعلان ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

قَائِمًا بِالْقِسْطِ - اور پھر جن لوگوں کو خدا نے علم کے زیور سے آراستہ فرمایا۔ وہ لوگ بھی مشاہداتِ حسیہ تاثراتِ فطریہ موازناتِ عقلیہ اور مکاشفاتِ قدسیہ سے جو آیاتِ آفاقیہ و انفسیہ سے ان کو حاصل ہیں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔ یعنی کوئی بھی لائق عبادت نہیں سوائے اُس ایک ذات کے جس کا فیصلۂ حکمت اور نظامِ قدرت بالکل عدل و انصاف پر مبنی ہے اور جور و اعتساف سے بالکل علیحدہ ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ - کوئی معبود نہیں مگر وہ جو تمام اشیاء پر غالب ہے اور اس کا تمام نظامِ کائنات جو بدرجہ اتم و اکمل موجود ہے وہ سب مبنی بر حکمت ہے۔ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ - ترکیب میں لفظ اللہ سے حال بھی ہو سکتا ہے اور معنی یہ ہو گا کہ اللہ جو قائم بالقسط ہے وہ اپنی توحید کی شہادت دیتا ہے اور ملائکہ اور صاحبانِ علم بھی اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔

فضیلت اہل علم

وَاُولُوا الْعِلْمِ - اس آیت مجیدہ میں ذاتِ ذوالجلال نے علم و علماء کی فضیلت کو اجاگر فرمایا ہے۔ کیونکہ علماء کا ذکر ملائکہ کے ذکر کے ساتھ اور ان کی شہادت کو ملائکہ کی شہادت کے ساتھ متصل فرمایا ہے اور صرف انہی کا ذکر کر کے باقی مخلوق کا تذکرہ ترک فرما دیا ہے اور وہ علم جس کی بدولت علماء کا ذکر خالقِ کائنات نے ملائکہ کے ساتھ کیا اور ان کی شہادت کا اہمیت سے تذکرہ فرمایا، علم توحید ہے یا جو علم علوم توحید سے وابستہ ہیں یعنی علوم شرعیہ دینیہ اس جگہ مراد ہیں کیونکہ شہادت اسی مطلب پر ہے یہی وجہ ہے کہ آئمہ معصومینؑ اور خود جناب رسالتمآبؐ نے تحصیلِ علومِ دینیہ پر بڑا زور دیا اور علماء کے فضائل بہت زیادہ بیان فرمائے چنانچہ مجمع البیان میں جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ عالم کا ایک گھنٹہ تک اپنے تکیہ پر آرام سے اپنے علم میں غور و فکر کرنا ایک عبادت گذار کی ستر برس کی عبادت سے افضل و برتر ہے اور انس بن مالک سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا لوگو! علم سیکھو کیونکہ اس کا سیکھنا نیکی ہے اس کے درس و تدریس میں ثواب تسبیحِ خدا ہے اس کا تکرار و مباحثہ جہاد ہے اس کا ان پڑھ کو پڑھانا صدقہ ہے اور اس کی اپنے اہل کو یاد دہانی کرانا قربت ہے کیونکہ یہ حلال و حرام کا نشان ہے اور جنت و نار کے راستوں کا مینار ہے۔ یہ وحشت کا مونس، مسافرت کا ساتھی، تنہائی میں ہمکلام و ہمدم، خوشی و غمی میں رہبر، دشمن کے سامنے ہتھیار اور غرباء کے نزدیک موجب قرب ہے اسی کے ذریعہ سے خدا قوموں کو سربلندی عطا فرما کر ان کو امور خیر میں پیشرو بناتا ہے تاکہ ان کی اقتداء کی جائے اور ان کے نقوشِ قدم پر چلا جائے اور ان کے مشوروں کو آخری فیصلہ قرار دیا جائے فرشتوں کو ان کی دوستی محبوب و مرغوب ہے وہ اپنے پروں کو ان سے مس کرتے ہیں اور اپنی نمازوں میں اُن کے لئے بخشش طلب کرتے ہیں بلکہ ہر خشک و تر حتیٰ کہ دریاؤں کی مچھلیاں اور دوسرے جانور، زمین کے درندے اور چوپائے آسمان اور اس کے ستارے ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ آگاہ رہو! علم دلوں کی زندگی، آنکھوں کا نور اور جسموں کی طاقت ہے۔ یہ انسان کو شرفاء کی منازل اور سلاطین کی مجالس تک پہنچاتا ہے اس میں غور و خوض روزہ کے برابر اور اس کی درس و تدریس عبادت کے برابر ہے اور اسی کے ذریعے سے حرام و حلال کی پہچان اور صلہ رحمی ہوتی ہے علم عمل کا پیش رو اور عمل اس کا مقتدی ہے یہ نیک بختوں کو عطا ہوتا ہے اور بدبخت اس سے محروم رہتے ہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہم اولو العلم ہیں اور ہم ہی حلال و حرام کو جانتے ہیں (البرہان)

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا

تحقیق دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے — اور نہیں اختلاف کیا۔ ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی — مگر

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَإِنَّ

بعد آجانے علم کے — باہمی حسد کی وجہ سے — اور جو کفر کرے آیاتِ خدا سے۔ تو — تحقیق

اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَإِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ

اللہ جلد حساب لینے والا ہے — پس اگر وہ آپ سے جھگڑیں تو فرما دیجئے کہ میں نے اللہ کے لئے سر جھکا دیا ہے اور

اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۗ فَإِنْ أَسْلَمُوْا

میرے تابعداروں نے بھی اور فرما دیجئے ان کو جنہیں کتاب دی گئی اور ان پڑھ لوگوں کو۔ کیا تم نے بھی (اس کے لئے) سر جھکایا ہے (اسلام لائے)

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع

پس اگر وہ اسلام لائیں تو وہ راہ راست پر ہوں گے اور اگر منہ پھیر لیں تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ ہے اور خدا نگران ہے بندوں پر

آیت مجیدہ شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهٗ آخر تک پڑھنے کے متعلق انس نے جناب رسالتمآبؐ سے روایت کیا ہے کہ سوتے وقت یہ آیت مجیدہ تلاوت کرے تو خداوند کریم ستر ہزار مخلوق پیدا فرماتا ہے جو تا قیام قیامت اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے۔ نیز جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جب اس آیت مجیدہ کی تلاوت کرنے والا بارگاہ خدا میں پیش ہوگا تو خدا فرمائے گا میرے اس بندے کا مجھ سے عہد ہے اور میں عہد کو پورا کرنے کا سب سے بڑا حقدار ہوں پس میرے اس بندہ کو داخل جنت کر دو۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ کعبہ کے پاس ۳۶۰ بت تھے جب یہ آیت اتری تو سب بت سجدہ میں سرنگوں ہو گئے۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ۔ تفسیر برہان اور مجمع البیان میں تفسیر قمی سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اسلام کی ایسی نسبت بیان کرتا ہوں جو نہ مجھ سے پہلے کسی نے بیان کی اور نہ میرے بعد کوئی بیان کرے گا اور وہ یہ کہ اسلام تسلیم کا نام ہے اور تسلیم یقین کا نام ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق کا مطلب اقرار ہے اور اقرار کا معنی ادا کرنا ہے مومن اپنا دین خدا سے لیتا ہے اور اس کا ایمان اُس کے عمل سے پہچانا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے معلوم ہوتا ہے۔ اے لوگو! دین کو اختیار کرو۔ کیونکہ اس میں گناہ کرنا بے دینی کی نیکی سے بہتر ہے اس لئے کہ دین کے ہوتے ہوئے گناہ بخشا جا سکتا ہے لیکن بے دینی میں کوئی نیکی قابل قبول ہی نہیں ہے۔ بروآیت ابن شہر آشوب امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اسلام سے مراد حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی ولایت کا تسلیم کرنا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ایمان کا درجہ اسلام سے بلند ہے جس طرح کہ کعبہ کا درجہ مسجد الحرام سے بلند ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ

تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں ساتھ آیات خدا کے اور قتل کرتے ہیں ۔ نبیوں کو ناحق اور قتل کرتے

الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۱﴾

ہیں ان کو جو امر کرتے ہیں انصاف کا لوگوں میں سے پس خبر دو ان کو عذاب دردناک کی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿۲۲﴾

وہ وہی ہیں جن کے ضائع ہو گئے اعمال دنیا اور آخرت میں اور کوئی نہ ہوگا ان کا مددگار

(**اقول**) پہلی حدیث میں ہے کہ ایمان کی پہچان عمل سے ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ اسلام ولایت علیؑ کو مان لینے کا نام ہے تو معلوم ہوا کہ جو ولایت کے قائل ہیں وہ مسلمان ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں وہ مومن ہیں اور جو ولایت کے قائل نہیں ۔ وہ نہ مسلمان ہیں نہ مومن اسی بنا پر فرمایا۔ لَوِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلٰى حُبِّ عَلِيٍّ لَمْ يَخْلُقِ اللّٰهُ النَّارَ وَقَالَ حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ لَا يَضُرُّ مَعَهَا سَيِّئَةٌ وَبُغْضُ عَلِيٍّ سَيِّئَةٌ لَا يَنْفَعُ مَعَهَا حَسَنَةٌ (ترجمہ) اگر تمام لوگ علیؑ کی محبت پر جمع ہو جائیں تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا اور فرمایا کہ علی کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان دہ نہیں ہوتا ۔ اور علی کے ساتھ عداوت کرنا ایسا گناہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ مند نہیں ہوتی ۔

اور دوسرے رکوع کے ذیل میں اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا ۔ کی تفسیر میں بھی اسی مطلب کی بعض حدیثیں مذکور ہو چکی ہیں نیز مقدمۂ انوار النجف ص۲۴۵ پر بھی ملاحظہ ہوں یعنی حضرت علیؑ کی ولایت رکھنے والے گناہوں سے توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول ہوتی ہے اور گناہوں کے نقصان سے بچ جاتے ہیں اور دشمن علی کی نہ نیکی قبول اور نہ گناہ سے توبہ قبول ہوتی ہے ۔

رکوع ۱۰

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے حق میں اتری ۔ ابو عبیدہ بن جراح سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ سے میں نے دریافت کیا کہ سخت ترین عذاب میں کون لوگ ہوں گے تو آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو کسی نبی کو قتل کریں یا ایسے انسان کو قتل کریں جو نیکی کا امر کرنے والا اور برائی سے روکنے والا ہو ۔ پس آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا ۔ اے ابو عبیدہ بنی اسرائیل نے ۴۳ نبی بوقت صبح ایک گھنٹہ کے اندر قتل کئے ۔ پس بنی اسرائیل کے عبادت گذار لوگوں کی ایک جماعت جن کی تعداد ایک سو بارہ تھی ، نے ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا تو ان کو اسی دن پچھلے پہر قتل کر دیا گیا ۔

تنبیہ :۔ اگرچہ اس فعل بد کے مرتکب تو وہ لوگ تھے جو بوقتِ نزولِ آیت موجود نہ تھے لیکن چونکہ موجودہ یہود بھی ان کے اس فعل پر راضی تھے لہٰذا ان کو اس فعل کا مجرم قرار دے کر خطاب کیا گیا ۔ پس معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی مومن یا معصوم کے قاتل کی پاس کریں ۔ اور

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ

کیا تم نے نہیں دیکھا اُن کو جنہیں دیا گیا ہے حصہ کتاب سے اُن کو بلایا جاتا ہے طرف کتابِ خدا کے تاکہ وہ فیصلہ کرے

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

ان کے درمیان پھر بیٹھ پھیرتا ہے ایک گروہ اُن کا رد گردانی کرتے ہوئے یہ اس لئے کہ انہوں

قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

نے کہا ہمیں ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن گنے چنے اور ان کو دھوکا دیا اپنے دین کے معاملہ میں اُن کی من گھڑت باتوں نے

اُن کے اس بدفعل پہ راضی ہوں تو وہ بھی قاتل کی طرح مذمت کے مستحق ہیں پس اس آیت کا ظاہر اگرچہ بنی اسرائیل کے حق میں ہے۔ لیکن اس کا باطن تمام ان لوگوں سے متعلق ہے جو ان جیسا فعل کریں۔

بِغَيْرِ حَقٍّ :- یہودیوں کو اس امر پر مذمت کرنا کہ وہ ناحق نبیوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بعض اوقات ان کا قتل برحق بھی ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ انبیاء کا قتل جو فعل ناحق ہے، کا ارتکاب کرتے ہیں یعنی بغیر حق کا کلمہ تاکید و مبالغہ کے لئے ہے کلمہ احتراز یہ نہیں ہے تاکہ اشکال لازم آئے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ - سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امر بالمعروف کرنے پر قتل کا خطرہ ہو تو کیا ایسی صورت میں بھی امر بالمعروف جائز ہے؟ تو اس مقام پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہاں :- ایسی صورت میں امر بالمعروف جائز ہے چنانچہ جناب رسالتمآبؐ سے ایک حدیث وارد ہے کہ اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ يُقْتَلُ عَلَيْهِ - یعنی بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے جس پر وہ قتل کر دیا جائے لیکن ہمارے نزدیک امر بالمعروف کے حُسن کے لئے شرط یہ ہے کہ اس پر کوئی مفسدہ لازم نہ آتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت مجیدہ یا اس قسم کی روایات کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف کرنے والے کو جب یہ ظن ہو کہ میری نصیحت پر غالباً کوئی ضرر مترتب نہ ہو گا تو اس وقت امر بالمعروف جائز اور مستحسن ہے پس اگر اس کو خلاف توقع ضرر پہنچ جائے اور اس نتیجہ میں وہ قتل بھی کر دیا جائے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے ورنہ اگر پہلے سے ہی معلوم ہو کہ امر بالمعروف میں بجائے فائدہ کے نقصان ہی ہو گا تو ایسی صورت میں امر بالمعروف ساقط ہے۔

يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ - ابن عباس سے مروی ہے کہ خیبر کے یہودیوں میں سے ایک مرد و عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور وہ دونوں بڑے خاندان کے فرد تھے ان کی کتاب میں اسکی سزا رجم کرنا تھا لیکن وہ لوگ ان کو بچانا چاہتے تھے۔ پس جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں آئے کہ یہاں شاید کچھ گنجائش ہو۔ لیکن آپؐ نے بھی رجم کا حکم دے دیا۔ تو یہودیوں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ کہ حضورؐ! یہ تو ان پر ظلم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ چلو تورات کا فیصلہ منظور کر لو۔ انہوں نے کہا یہ بالکل درست ہے" آپ نے فرمایا۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

پھر کیا حال ہوگا جب اُن کو جمع کریں گے اس دن جسمیں کوئی شک نہیں اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو اپنی کمائی (کا بدلہ)

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ

اور ان کو خسارہ نہ دیا جائے گا تم کہو۔ اے اللہ مالک مُلک عطا فرماتا ہے مُلک تو جسے چاہے

تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

اور لے لیتا ہے ملک تو جس سے چاہے اور تو عزت دیتا ہے جسے چاہے اور ذلیل کرتا ہے جسے چاہے

بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے۔ تحقیق تو ہر شے پر قادر ہے۔

تم میں سے تورات کا بڑا عالم اس وقت کون ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ مرد اعور ہے یعنی یک چشم ابن صوریا نامی جو فدک کا باشندہ ہے پس اس کو منگوایا گیا۔ آپ نے باطلاع جبریل اس کو خطاب کیا کہ کیا تو ابن صوریا ہے؟ کہا۔ ہاں" فرمایا تو ان کا بڑا عالم ہے؟ کہنے لگا ایسا ہی لوگ کہتے ہیں۔ پس آپ نے تورات کا وہ حصہ منگوایا جس میں حکم رجم موجود تھا۔ فرمایا۔ کہ پڑھ۔ تو اس نے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن جب رجم کی آیت پر پہنچا تو اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر آگے نکل گیا۔ عبداللہ بن سلام نے عرض کی۔ حضورؐ۔ یہ تو آیت رجم چھوڑ کر آگے جا رہا ہے اور پھر خود اٹھ کر اس کا ہاتھ ہٹا کر وہ آیت پڑھی جس میں رجم کا حکم تھا کہ محصن مرد اور محصنہ عورت اگر زنا کریں اور گواہوں سے ثابت ہو جائے تو ان کو رجم کرنا واجب ہے لیکن اگر عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کو مہلت دینی چاہیئے۔ پس حضورؐ نے حکم دیا کہ ان کو رجم کیا جائے چنانچہ وہ سنگسار کئے گئے اور اس پر یہودی اور زیادہ آنحضرتؐ پر غصے ہوئے۔ مجمع البیان

اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔ اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں صرف چالیس دن عذاب ہوگا کیونکہ اتنے ہی دن انہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور یا یہ کہ وہ کہتے تھے ہمیں سات دن عذاب ہوگا۔ يَفْتَرُوْنَ۔ ان کا افترا یہ تھا کہ وہ باوجود ان باتوں کے اپنے آپ کو اَبْنَآءُ اللّٰه کہتے تھے۔ یعنی ہم اللہ کے بیٹے ہیں یا یہ افترا مقصود ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں چند معین ایام میں ہی عذاب ہوگا۔ اور اس کے بعد ہم جنتی ہو جائیں گے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ۔ تفسیر مجمع البیان میں بطریق اہلبیت حضرت رسالتمآبؐ سے ایک حدیث میں ہے کہ فرماتا ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ جو بندہ ہر فریضہ نماز کے بعد سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شَهِدَ اللّٰهُ۔ اور یہ آیت بغیر حساب تک پڑھے تو اس کی خطیرۃ القدس میں جگہ ہوگی۔ یا ہر روز ستر مرتبہ اس پر نظر رحمت ہوگی۔ یا ہر دن اس کی ستر حاجات پوری کی جائیں گی جن

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ

تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ

الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو رزق عطا فرماتا ہے جسے چاہے بلا حساب

میں سے کم از کم مغفرت ہے اور یا اس کو ہر دشمن سے محفوظ رکھوں گا اور اس کا ناصر رہوں گا اور اس کے اور جنت کے درمیان صرف موت کا ہی فاصلہ ہو گا۔

معاذ بن جبل کہتا ہے کہ میں ایک دفعہ نماز جمعہ میں شریک نہ ہو سکا جب بارگاہ رسالت میں شرفیاب ہوا۔ تو آپؐ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا۔ حضورؐ۔ یوحنا یہودی کا میرے اوپر قرضہ ہے اور وہ میری تاڑ میں تھا اس لئے میں نے گھر سے نکلنا پسند نہ کیا تاکہ مجھے روک نہ لے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے معاذ۔ کیا تو قرضہ کی ادائیگی چاہتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ "جی ہاں!" آپؐ نے فرمایا یہ دو آیتیں پڑھا کرو اور اس کے بعد کہو۔ یَا رَحْمَانَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِیْمَهُمَا تُعْطِیْ مِنْهُمَا مَا تَشَاءُ وَتَمْنَعُ مِنْهُمَا مَا تَشَاءُ اِقْضِ عَنِّیْ دَیْنِیْ۔ اگر ایسا کرو گے تو پھر اگر روئے زمین کے برابر سونا بھی تیرے اوپر قرضہ ہو گا۔ تو خداوند کریم اس کو ادا کرے گا۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے جنگ احزاب کے موقعہ پر خندق کی کھدائی کے لئے صحابہ کے لئے چالیس ذراع مقرر کئے مہاجر اور انصار میں ہر جماعت سلمان کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتی تھی تو حضورؐ نے فرمایا:۔ اَلسَّلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَیْتِ۔ پس خندق کی کھدائی شروع ہوئی۔ تو نیچے سے ایک پتھر سخت ایسا نکلا۔ کہ اس پر کدال کام نہ کرتی تھی۔ پس سلمان جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا سنایا۔ تو آنحضرت بنفسِ نفیس خود تشریف لائے اور پھر سلمان کے ہمراہ خندق میں اترے اور سلمان کے ہاتھ سے لے کر اس کو پتھر پر مارا۔ تو اس کا ایک حصہ توڑ دیا اور اس پتھر سے بجلی کی طرح ایک روشنی نمودار ہوئی۔ پس حضورؐ نے تکبیر کی آواز بلند کی۔ اور صحابہ نے بھی تکبیر پڑھی۔ پھر آپ نے دوبارہ اس کدال کو اس پتھر پر مارا۔ اور پھر اس کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اور بجلی کی مانند ایک روشنی ظاہر ہوئی پس حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اور صحابہ نے بھی تکبیر کہی۔ پھر حضورؐ نے سہ بارہ کدال کو اس پتھر پہ مارا۔ کہ وہ پتھر بالکل ٹوٹ گیا اور مثل سابق روشنی نمودار ہوئی۔ پس حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور صحابہ نے بھی تکبیر کہی۔ اس کے بعد حضورؐ سلمان کے ہاتھ کو پکڑ کر خندق سے باہر تشریف لائے۔ تو سلمان نے عرض کی۔ یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آج میں نے آپ سے نئی بات دیکھی ہے۔ پس حضورؐ متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جب میں نے پہلی ضرب لگائی اور روشنی پیدا ہوئی تو میں نے اس میں حیرہ اور مدائن کے محل دیکھے اور جبرئیل نے بتایا۔ کہ آپ کی امت کو اس پر غلبہ ہو گا۔ لہٰذا میں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ جب دوبارہ میں نے پتھر پہ کدال کی ضرب لگائی۔

اور روشنی ظاہر ہوئی تو میں ملک روم کے محلات دیکھے اور جبریل نے خبر دی کہ آپ کی امت کو ان پر بھی غلبہ ہوگا اور تیسری دفعہ ملک صنعاء کے محل دکھائی دیئے اور جبریل نے ان پر بھی مجھے فتح کی خوشخبری سنائی۔ پس جب جناب رسالتمآبؐ نے مسلمانوں کو یہ بشارت دی تو سب مسلمان خوش ہوئے۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ سن کر منافقین ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ عجیب بات ہے کہ ادھر ڈر کے مارے خندق کھود رہے ہیں اور کھلے میدان میں لڑائی کی جرأت نہیں کرتے لیکن ادھر ایران و روم کی فتح کی دل میں امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ پس یہ آیت نازل ہوئی کہ ان آیات کا ورد کیا کرو۔

انوارِ علمیہ

(۱) مِلک اور مُلک دو جُدا لفظیں ہیں۔ اور ان کے معانی الگ الگ ہیں۔ صاحبِ مِلک کو مالک کہا جاتا ہے اور صاحب ملک کو مَلِک کہا جاتا ہے اس آیت میں مالک کو ملک کی طرف مضاف کرکے اس مطلب کو واضح کیا گیا کہ موجوداتِ عالم کی مِلک اور مُلک ہر دو درحقیقت اللہ کے قبضہ میں ہیں اور تمام مخلوق کی مِلک یا مُلک اسی کا عطیہ ہے جس کو وہ کسی شئے کا مِلک عنایت فرماتا ہے وہ اس چیز کا مالک ہوتا ہے اور جس کو وہ مُلک عطا کرتا ہے وہ اس کا ملک اور بادشاہ ہوتا ہے۔

(۲) خیر صفت مشبہ ہے اس کا اصل معنی ہے انتخاب۔ پس اسی شئے کو خیر کہا جاتا ہے جسے اس کے مقابل کی چیزوں سے منتخب کیا جائے بعضوں نے اس کو صیغۂ افعل التفضیل قرار دیا ہے اور اس کی اصل اَخْیَرُ بیان کی ہے حالانکہ بالکل اشتباہ اور بے سود تکلّف ہے کیونکہ چند اشیاء یا متعدد معانی میں سے جس کو خیر کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نظر انتخاب میں اس کو باقیوں سے سبقت حاصل ہے اور یہ انتخاب صرف اس کے مادہ کی دلالت سے ہے نہ کہ صیغہ کی طرف سے۔ اور چونکہ اس کو افضل کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے مثلاً افضل القوم کی جگہ خیر القوم کہنا درست ہے پس اسی بناء پر اس کو افعل التفضیل قرار دے کر اس کی اصل اَخْیَرُ تجویز کرنے کا تکلف کیا گیا ہے حالانکہ چند چیزوں میں سے افضل اس کو کہا جائے گا جب اس کے مقابل کے چیزوں میں اصل فضیلت موجود ہو اور اس میں بہ نسبت ان کے زیادتی پائی جائے لیکن خیر کے محل استعمال میں یہ چیز ضروری نہیں مثلاً قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ (کہدو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہو سے بہتر ہے) یہاں انعاماتِ اخرویہ کو لہو سے خیر کہا گیا ہے حالانکہ انعامات خداوندی اور لہو میں کوئی قدر مشترک نہیں تاکہ زیادتی صفت کے لحاظ سے انعاماتِ خداوندی کو برتری حاصل ہو بلکہ میاں تو صاحبانِ عقل و دانش کو عقلی نظریہ کے ماتحت تنبیہ کیا گیا ہے کہ تمہاری نظر انتخاب بجائے لہو و لعب کے نعماتِ اُخروی پر ہونی چاہیئے اور یہ خیر کی ذاتی دلالت ہے نہ کہ تفضیلی معنی۔

(۳) بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ جار مجرور کو مقدم کرنے میں حصر کو ظاہر کیا گیا ہے اور الخیر پر الف و لام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جملہ امورِ خیر کا فیضان صرف اسی ذات کی طرف سے ہی ہے خواہ تکوینیات سے ہوں یا تشریعیات سے ہوں۔ ملک و عزت کا مرجع واحد وہی ہے اور مالکانِ مُلک اور صاحبانِ عزت اسی ذات کے ممنونِ احسان ہیں پس یہ خیر تکوینی ہے اور جملہ عبادات و اعمال صالحہ چونکہ اسی کی توفیق سے ہیں اگرچہ عبد کو ان کی بجا آوری میں اختیار حاصل ہے اور یہ خیر تشریعی ہے۔ پس تمام امورِ خیر کا حصر

اس کی ذات میں صحیح ہے اور موجوداتِ عالم میں صاحبانِ خیر اسی ذات سے مستفیض ہیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کی ذات سے صرف خیر کا ہی افاضہ ہوتا ہے اور خیر کا عدم چونکہ شر ہے اور عدم فاعل کا فعل نہیں ہوا کرتا بلکہ فعل کا عدم ہوا کرتا ہے پس کسی پہ خیر کا افاضہ نہ ہونا شر ہے اور چونکہ خیر کی نسبت اللہ کی طرف حقیقی ہے۔ لہٰذا اس کے عدم (شر) کو بھی مجازاً اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

(۴) رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مطلب ظاہراً یہ ہے کہ خطِ استوا سے میل شمس کی کمی وبیشی کی بدولت شب و روز میں جو تفاوت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی رات کا حصہ دن میں اور کبھی دن کا ایک حصہ رات میں داخل ہوجاتا ہے مثلاً اعتدالِ ربیعی کے زمانہ میں یعنی جب سورج برج حمل میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت سورج سیدھا خطِ استوا پہ ہوتا ہے اور دن رات تقریباً برابر ہوتے ہیں اس کے بعد سورج خطِ استواء کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور رات کا کچھ حصہ روزمرہ دن میں داخل ہوکر رات میں تدریجی طور پہ کمی اور دن میں اسی نسبت سے زیادتی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج اپنی میل شمالی میں آخری درجہ تک پہنچ جاتا ہے اس کے بعد تدریجاً میل کم ہونا شروع ہوتی ہے جس سے رفتہ رفتہ دن میں کمی اور رات میں زیادتی پیدا ہوتے ہوتے جب سورج دوبارہ خطِ استواء پر پلٹ آتا ہے تو رات دن پھر برابر ہوجاتے ہیں اور وہ زمانۂ اعتدالِ خریفی کا ہوتا ہے جبکہ سورج کا داخلہ برج میزان ہوتا ہے۔ اس کے بعد سورج کی خطِ استواء سے میل جنوبی شروع ہوتی ہے جس کی وجہ سے دن کا کچھ حصہ روزمرہ تدریجاً رات میں داخل ہوتا جاتا ہے۔ پس رفتہ رفتہ دن گھٹتا جاتا ہے اور رات بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ میل جنوبی اپنے آخری درجہ پہ پہنچتی ہے اور اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ نقطۂ اعتدالِ ربیعی کی طرف رجوع ہوتا ہے پس تقریباً چھ مہینے رات کا کچھ حصہ دن میں داخل ہوتا ہے اور یہ ابتدائے موسم گرما سے لے کر ابتدائے موسم سرما تک ہے اور تقریباً چھ مہینے دن کا کچھ حصہ رات میں داخل رہتا ہے اور یہ ابتدائے موسم سرما سے لے کر ابتدائے موسم گرما تک کا زمانہ ہے اور سال بھر میں صرف دو دن تقریباً رات اور دن اپنی اپنی حدود کے اندر رہتے ہیں اور وہ ایک دن جبکہ سورج اعتدالِ ربیعی میں خطِ استوا پر آتا ہے اور دوسرا دن جبکہ سورج اعتدالِ خریفی میں خطِ استوا پہ ہوتا ہے۔

(۵) مردوں کو زندوں سے اور زندوں کو مردوں سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ مومن سے کافر اور کافر سے مومن پیدا کرتا ہے اور ممکن ہے کہ یہاں تعمیم مراد ہو۔ تاکہ انسان وحیوان کا نطفہ سے اور نباتات کا مٹی سے پیدا ہونا اور پھر خروج روح کے بعد ان کا خاکستر ہوکر حالتِ مردنی سے ہم آغوش ہونا بھی اس میں داخل ہوجائے۔

(۶) دونوں آیتوں میں تقابل کی جو لطیف صنعت پیش کی گئی ہے وہ اسی کلام بلاغت نظام کا ہی حصہ ہے۔ پہلی آیت میں ملک عطا کرنے اور ملک لے لینے کے مقابلہ میں دوسری آیت میں رات کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں داخل کرنا مذکور ہے کیونکہ ملک عطا کرنے کا مطلب ہے کہ بعض افراد کو بعض پہ حق تصرف دیا گیا ہے اور اس کی مناسبت رات کو دن میں داخل کرنے کے ساتھ ہے وہاں بھی نور کو ظلمت پہ تصرفِ شاہانہ حاصل ہے اور ملک کے زائل ہونے کو دن کے رات میں داخل ہونے

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ

نہ پکڑیں مومن کافروں کو دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جو ایسا کرے گا

ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّآ أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَ

پس نہ اس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں مگر اس صورت میں کہ تم کو اُن سے ڈر لگتا ہو اور

يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ﴿۲۸﴾

ڈراتا ہے تمہیں خدا اپنی ذات سے اور اللہ کی طرف ہی بازگشت ہے

سے مناسب ہے یعنی دن کا رات پر غالب آنا حکومت سے اور رات کا دن پر چھا جانا زوالِ حکومت سے موزوں و مناسب ہے۔

اسی طرح پہلی آیت میں عزت و ذلت کا مقابلہ دوسری آیت کے زندہ کو مُردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے سے کیا گیا ہے کیونکہ ذلت کے بعد عزت، موت کے بعد زندگی سے اور عزت کے بعد ذلت زندگی کے بعد موت سے مشابہ ہے نیز پہلی آیت کے آخر میں عطائے ملک و عزت کو خیر سے تعبیر کیا گیا اور دوسری آیت کے آخر میں اس کو رزق کہا گیا کیونکہ اللہ کی طرف سے جو کچھ عطا ہو وہ خیر بھی ہوتا ہے اور رزق بھی۔

(۷) پہلی آیت میں ملک و عزت کے عطا کرنے کا ذکر تھا لہذا اس کو اپنی قدرت کے محیط ہونے کے ذکر سے ختم کیا اور دوسری آیت میں چونکہ اپنی عطا و بخشش کو رزق سے تعبیر فرمایا۔ لہذا اس کے بعد بغیرِ حساب فرمادیا جو وسعتِ رزق پر دلالت کرتا ہے اور یہاں حساب کا معنی عوض ہے نہ کہ اندازہ یعنی خدا کا رزق بلا معاوضہ ہے کیونکہ کائنات کی ہر شے جب اس کی ملکیت اور اسی کا عطا کردہ رزق ہے تو جس چیز کو عوضہ قرار دیا جائے گا وہ بھی بعینہٖ اس کا رزق ہوگا پھر عوض کیسے بن سکے گا اور یہ کہنا کہ خدا رزق بلا اندازہ اور بغیر مقدار کے دیتا ہے دوسری قرآنی آیات کے خلاف ہے۔

جوازِ تقیہ

إِلَّآ أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔ آیت مجیدہ کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے لئے ناجائز ہے کہ کافر بے دین سے دوستانہ تعلقات رکھے بلکہ مومن کی دوستی صرف مومن سے ہی ہونی چاہیئے البتہ صرف اس صورت میں مومن، غیر مومن سے رواداری کے طور پر اظہارِ محبت کر سکتا ہے جبکہ مومنین کمزور ہوں اور وہ طاقتور ہوں اور اگر یہ ان کے ساتھ موافقت اور محبت کا اظہار نہ کریں تو اُن سے اپنی عزت و جان و مال وغیرہ کا خطرہ ہو۔ پس ایسی صورت میں مومن کے لئے اُن جیسا بن کر وقتی گذارا کر لینا جائز ہے اور اسی کو تقیہ کہتے ہیں۔ یہ آیتِ مجیدہ جوازِ تقیہ پر نص ہے اور جو لوگ تقیہ کا انکار کرتے ہیں اُن کا عملاً اس آیت پر ایمان نہیں۔

بعض اوقات تقیہ واجب ہو جاتا ہے جبکہ جان کا خطرہ ہو اور بعض اوقات مستحب و مباح وغیرہ۔ جس طرح مقام کی مناسبت

قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا

فرما دیجئے کہ خواہ تم چھپاؤ وہ جو تمہارے دلوں میں ہے یا ظاہر کرو خدا اُسے جانتا ہے اور نیز جانتا ہے جو

فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ تَجِدُ

کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے جس دن پائے گا

كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ

ہر نفس عمل خیر (کی جزا) کو حاضر اور عمل بد (کی سزا) کو بھی حاضر) تو چاہتا ہوگا کاش! اس گناہ

تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ

اور میرے درمیان لمبی دوری ہوتی۔ اور ڈراتا ہے خدا تم کو اپنی ذات سے

وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿٣٠﴾ ع

اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے

ہو۔ بہرکیف تقیہ کے جواز پر علمائے امامیہ کا اتفاق ہے۔ کہتے ہیں مسیلمہ کذاب نے دو صحابیوں کو پکڑا۔ اور ان سے اپنی رسالت کا اقرار کروانا چاہا۔ تو ایک نے جان کے خطرہ سے تقیہ کرتے ہوئے اقرار کرلیا۔ اور دوسرے نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس کی بات کو اَن سنا کر کے ٹال دیا۔ مسیلمہ کذاب نے تین دفعہ بار بار پوچھا اور اُس نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ میری قوتِ سماع کم ہے لہٰذا میں تمہاری بات سنتا نہیں ہوں آخر اس نے اس کو قتل کردیا۔ جب جناب رسالتمآبؐ کو یہ خبر پہنچی تو فرمایا۔ کہ قتل ہونے والا اپنے صدق و ایمان پر قتل ہوا۔ اور درجۂ فضیلت پر فائز ہوا۔ پس وہ اس کو مبارک ہو۔ لیکن دوسرا شخص پس اُس نے خدا کی رخصت کو قبول کیا۔ لہٰذا اس سے بھی اس معاملہ میں کوئی بازپرس نہیں ہے گویا اس روایت سے یہ ظاہر ہوا کہ بصورت خوف بھی حق کا اظہار کرنا افضل ہے لیکن تقیہ کا کرنا بھی حرام نہیں ہے بلکہ مباح اور جائز ہے لیکن آئمہ اہلبیتؑ سے تقیہ کے جواز پر بلکہ بعض مقامات پر اس کی افضلیت بلکہ وجوب پر بکثرت روایات موجود ہیں۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ الخ۔ حضرت امام زین العابدینؑ سے منقول ہے کہ وہ ہر جمعہ مسجد رسولؐ میں یہ موعظہ فرماتے تھے۔ أَيُّهَا النَّاسُ! اللہ سے ڈرو اور یقین جانو کہ تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہے پس دنیا میں نیکی یا بدی جو بھی کسی نے کی ہوگی۔ وہاں اس کا بدلہ اس کو ملے گا اور برائی کرنے والا اس وقت پچھتائے گا اور کہے گا کاش! اس برائی اور میرے درمیان بڑی دوری ہوتی۔ اور خدا خود تمہیں اپنے (قہر و غضب) سے ڈراتا ہے۔ مقام افسوس ہے تیرے لئے اے غافل آدمی

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ

فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تم کو محبوب رکھے اور بخش دے

ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۱﴾ قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ

تمہارے گناہ اور خدا بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے فرما دیجئے اطاعت کرو اللہ و رسول کی

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾

پس اگر روگردانی کریں تو تحقیق اللہ نہیں محبوب رکھتا کافروں کو

کیونکہ تجھ سے تو غفلت نہ برتی جائے گی۔ اے ابن آدم! موت تیری طلب میں بہت تیزی سے تیری طرف متوجہ ہے اور بہت جلد تجھے پالے گی جبکہ تیری اجل پوری ہوگی اور قبض رُوح کے بعد تو قبر میں تنہا جائے گا۔ پس تیری رُوح کو پلٹایا جائے گا اور منکر و نکیر تجھ سے سوال کرنے اور تیرا امتحان لینے کے لئے تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔ پس تجھ سے تیرے رب، تیرے نبی، تیرے دین، تیری کتاب اور تیرے امام کے متعلق دریافت کریں گے پھر پوچھیں گے کہ اپنی عمر کہاں گنوائی اور اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں پر خرچ کیا۔ پس بچاؤ کی صورت بناؤ اور اپنے نفس کے لئے فائدہ سوچو اور امتحان و آزمائش و سوال و جواب کے لئے تیاری کرلو اگر تم مومن بامعرفت اور سچوں کے اطاعت گذار اور اولیاء اللہ کے ولا رکھنے والے ہوگے تو خدا تمہیں جواب سکھا دے گا اور تمہاری زبان پر درست کلمات اور صحیح جواب جاری کردے گا اور تمہیں رضوان خدا اور بہشت کی خوشخبری سنائیں گے اور فرشتے بشارت اور خوش روئی کے ساتھ تمہارا استقبال کریں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو زبان رُک جائے گی، حجت کمزور ہوگی۔ جواب نہ بن سکے گی جہنم کی بشارت ہوگی اور عذاب کے ملائکہ جہنم پہنچانے کے لئے آجائیں گے۔

اے ابن آدم! اس کے بعد بہت بڑا ہولناک اور روح فرسا منظر قیامت کا دن ہوگا۔ جس دن تمام لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ اور خدا اولین و آخرین کو جمع کرے گا اور پھر آپ نے فرمایا کہ وہاں لغزشوں کی معافی نہ ہوگی۔ فدیہ نہ لیا جائے گا، عذر قبول نہ ہوگا اور توبہ کی گنجائش نہ ہوگی بلکہ وہاں تو صرف یا نیکی کا بدلہ اور یا برائی کا بدلہ ہی ہوگا۔

رکوع ۱۲

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ: یہ آیت کھلے لفظوں اعلان کر رہی ہے کہ محبت کا دعویٰ صرف زبانی کافی نہیں جب تک عملی طور پر اس محبت کی تصدیق نہ ہو۔ ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے مَنۡ سَرَّہٗ اَنۡ یَعۡلَمَ اَنَّ اللّٰہَ یُحِبُّہٗ فَلۡیَعۡمَلۡ بِطَاعَۃِ اللّٰہِ وَلۡیَتَّبِعۡنَا الخبر۔ (جس کو یہ پسند ہو کہ وہ جان لے کہ اللہ اس سے محبت رکھتا ہے تو اُسے اللہ کی

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى

تحقیق اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام

الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

جہانوں سے حالانکہ یہ ذریت بعض بعض سے ہے اور اللہ سننے جاننے والا ہے

اطاعت اور ہماری پیروی کرنی چاہیئے اس مقام پر مولانا مقبول صاحب مرحوم کو ایک اشتباہ ہوا ہے کہ انہوں نے مَنْ شرطیہ کو مِنْ حرف جر سمجھا اور سَرَّ کا شرط کو سِرِّ مجرور مِنْ کا قرار دیا حدیث پاک کے مذکورہ جملہ کا ترجمہ یوں بیان کیا کہ (اسرار دین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بندہ جان لے کہ خدا اس سے محبت رکھتا ہے پھر وہ خدا کی اطاعت کرے اور ہماری پیروی) حالانکہ یہ ترکیب اور ترجمہ بالکل غلط ہے اور درست وہی ہے جو ہم عرض کر چکے ہیں اس کے بعد آپ نے آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا۔ خدا کی قسم کبھی کوئی بندہ اللہ کا اطاعت گذار نہیں ہوتا۔ مگر یہ کہ خدا اپنی اطاعت کے اندر ہماری اتباع اس کے دل میں ڈالتا ہے اور قسم بخدا کہ کوئی بندہ ہماری اتباع نہیں کرتا۔ مگر یہ کہ اس سے اللہ محبت رکھتا ہے اور بخدا کوئی شخص ہماری اتباع کو نہیں چھوڑتا مگر یہ کہ وہ ہمارے ساتھ بغض رکھتا ہے اور بخدا ہمارے ساتھ جو بھی بغض رکھے گا وہ اللہ کا نافرمان ہوگا اور جو بھی اللہ کا نافرمان ہو کر مرے گا اس کو خدا رسوا کرے گا۔ اور اوندھے منہ اس کو جہنم میں ڈالے گا۔

ایک حدیث میں حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس امت میں سے جو بھی ہمارے حق کا عارف ہوگا۔ وہ ناجی ہوگا۔ سوائے تین قسم کے لوگوں کے۔ ایک حاکم ظالم کا ساتھی۔ دوسرا خواہش پرست۔ تیسرا اعلانیہ فسق کرنے والا۔

اور نیز آپ سے مروی ہے کہ دین تو صرف محبت ہی کا نام ہے۔ پھر اسی آیت سے استشہاد فرمایا کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو اطاعت رسولؐ کرو۔ پس خدا تم سے محبت رکھے گا۔ گویا اصل دین محبت ہے اور اطاعت اس کی فرع ہے۔ اور فرع کا درست نہ ہونا اصل کی کمزوری یا فقدان کی دلیل ہے۔ نیز آپ سے مروی ہے کہ فرمایا۔ اس شخص کی اللہ سے محبت نہیں جو اس کی نافرمانی کرے پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

تَعْصِي الْإِلٰهَ وَأَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ   هٰذَا مُحَالٌ فِي الْفِعَالِ بَدِيعٌ

اللہ کی نافرمانی اور ساتھ اس کی محبت کا دعوے یہ بات قطعاً محال ہے

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَأَطَعْتَهُ   إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعٌ

اگر تجھے سچی محبت ہوتی تو اس کی اطاعت ضرور کرتا کیونکہ محب اپنے محبوب کا مطیع ہوا کرتا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ اگر کوئی پتھر بھی ہماری محبت رکھتا ہوگا تو خدا اس کو بھی ہمارے ساتھ محشور کرے گا۔ کیونکہ دین تو محبت ہی کا نام ہے۔

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ :۔ خدا و رسولؐ کی اطاعت کے حکم کے بعد یہ فرمانا کہ خدا کفر کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا و رسولؐ کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے میں انسان خود مختار ہے پس اس سے عقیدہ جبر کی تردید ہوگئی کیونکہ اگر انسان اطاعت یا نافرمانی میں مجبور ہوتا تو خدا یہ نہ فرماتا کہ میں ان کو دوست نہیں رکھتا۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی :۔ قرائت اہلبیت میں آلِ عمران کے بعد آلِ محمدؐ کے لفظ ہیں بلکہ تفسیر برہان میں تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ ابو وائل کہتا ہے کہ میں نے ابن مسعود کے مصحف میں آلِ عمران کے بجائے آلِ محمدؐ پڑھا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ آلِ ابراہیم سے مراد آلِ محمدؐ ہے۔ جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ جب وہ آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کا ذکر کریں تو خوش ہوتے ہیں اور جب آلِ محمدؐ کا ذکر ہو تو ان کے دل گھٹتے ہیں اور مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے اگر کوئی شخص بروزِ محشر ستر نبیوں کے اعمال کے برابر بھی نیک اعمال پیش کرے گا۔ تو اس کے اعمال مقبول نہ ہوں گے جب تک میری اور علی بن ابی طالب کی ولا کو پیش نہ کرے گا۔

اٰلِ عِمْرٰنَ ۔ عمران تین گذرے ہیں ایک حضرت موسیٰ اور ہارون کے والد ماجد دوسرے حضرت مریم کے والد، اور تیسرے حضرت ابوطالب، کیونکہ ان کا نام دراصل عمران تھا۔ آیت مجیدہ میں بعض لوگوں نے آلِ عمران سے مراد حضرت موسے و ہارون لئے ہیں اور بعض نے حضرت عیسےٰ مراد لئے ہیں اور تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ تفسیر اہلبیت میں آلِ عمران سے مراد حضرت علیؑ بن ابی طالب ہیں اور بروایت ابن عباس انہوں نے نقل کیا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ کہ میں آلِ ابراہیم ہوں اور علیؑ آلِ عمران ہیں۔

تنبیہ :۔ آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کی لفظیں گو عام ہیں لیکن ان سے مراد صرف وہ انسان ہو سکتے ہیں جو طاہر اور معصوم ہوں کیونکہ اصطفاء غیر معصوم کا نہیں ہو سکتا اور نیز اس آیت سے یہ صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ ملائکہ سے افضل ہیں۔ کیونکہ ان کو عالمین پر چنا گیا ہے اور فرشتے عالمین میں داخل ہیں۔

وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۔ یعنی خدا ان کے اقوال سننے والا اور نیتوں کے جاننے والا ہے اور چونکہ ان کے اقوال و نیات میں کوئی نقص نہیں تھا بلکہ وہ ظاہری و باطنی دونوں قسم کی کثافتوں سے صاف تھے اور طاہر و معصوم تھے لہٰذا تمام جہانوں پر ان کو مصطفےٰ بنا دیا۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا

جب عرض کی زوجہ عمران نے اے رب میں نے نذر کی ہے تیرے لئے وہ جو میرے شکم میں ہے کہ (وہ عبادت کیلئے)

فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ

آزاد ہوگا۔ پس تو قبول فرما میری نذر کو تحقیق تو سننے جاننے والا ہے پس جب اس کو جنا تو عرض کی اے رب میں نے

إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ

لڑکی جنی ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا جنا ہے اور نہیں لڑکا مثل لڑکی کے۔

وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا

اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو

مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾

شیطان رجیم (کے شر) سے

حضرت مریمؑ کی پیدائش و تربیت

اِمْرَاَۃُ عِمْرَانَ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عمران بن ہاشم حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھے اور بعض کہتے ہیں یہ عمران بن ماثان تھے۔ جو میہود بن یعقوب کی ستائیسویں پشت میں تھے اور عمران بن یصہر جو حضرت موسیٰ کے والد تھے ان کے اور ان کے درمیان اٹھارہ سو سال کا فاصلہ تھا اور ماثان کی اولاد اس زمانہ میں بنی اسرائیل کی سردار تھی قاقود بن قبیل کی دو لڑکیاں تھیں ایک کا نام حنّہ تھا جو عمران کی زوجہ اور مریم کی والدہ تھیں اور دوسری کا ایشاع تھا جو حضرت زکریا کی زوجیت میں تھیں یعنی حضرت مریم اور حضرت یحییٰ ایک دوسرے کے خالہ زاد تھے۔ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ الخ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ عمران کو خدا نے وحی کی تھی کہ میں تجھے ایک مبارک فرزند عطا کروں گا جو مادر زاد نابینا اور مبروص کو شفایاب کرے گا اور میرے اذن سے مردوں کو زندہ کرے گا اور میں اس کو بنی اسرائیل کا نبی بناؤں گا تو عمران نے اپنی زوجہ حنّہ سے یہ بات بیان کی۔ پس جب اس کو حمل ہوا تو نذر مان لی کہ اے اللہ یہ بچہ جو میرے پیٹ میں ہے اس کو خدمت مسجد اور عبادت کیلئے اپنی طرف سے آزاد کرونگی (بروایت بحار الانوار) ابوبصیر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا عمران نبی تھا؟ تو آپ نے فرمایا۔ ہاں وہ اپنی قوم میں نبی و مرسل تھا (المیزان)

مُحَرَّرًا :- یعنی آزاد - اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس سے اپنے کام کاج نہ کراؤں گی اور کہتے ہیں کہ جب کوئی لڑکا اس مطلب کے لئے آزاد کیا جاتا تھا تو اُسے عبادت خانہ میں ٹھیرایا جاتا تھا اور اس عبادت خانہ کی جھاڑو برداری، صفائی اور خدمت سنِ بلوغ تک اس کے ذمہ میں ہوتی تھی اور بلوغ کے بعد اس کو اختیار ہوتا تھا کہ وہاں ٹھیرا رہے یا چلا جائے پس یہاں تحریر کا معنی غلامی سے آزاد ہونا نہیں بلکہ حقِ ولدیت جو اولاد پر ماں باپ کے لئے ثابت ہے اس کا ساقط کرنا یہاں مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ حنہ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی یہاں تک کہ بوڑھی ہوگئی - ایک دن ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی کہ دیکھا ایک پرندہ درخت پر اپنے بچہ کو دانہ بھرا رہا ہے یہ کیفیت دیکھتے ہی دل میں اولاد کی محبت بھر آئی اور اللہ سے طلبِ فرزند کی دعا کی - تو خدا نے اس کو قبول فرمایا اور حضرت مریمؑ سے حاملہ ہوئیں اور منت مانی کہ اس کو عبادت خانہ کی خدمت اور عبادت گذاری کے لئے آزاد رکھوں گی۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا - زمانہ حمل میں حنہ کے شوہر عمران کا انتقال ہوگیا تھا اور حنہ کو یہی خیال تھا کہ میرے پیٹ میں لڑکا ہی ہوگا اس لئے کہ خدا کی طرف سے بشارت تھی کہ میں اس کو رسول بناؤں گا اور عہدۂ رسالت صرف مردوں کے لئے ہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن اُن کے خلافِ توقع جب لڑکی پیدا ہوئی تو گھبرا گئیں اور شرمساری محسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر عرض کی - کہ اے پالنے والے یہ تو لڑکی پیدا ہوئی ہے اور لڑکے اور لڑکی میں بڑا فرق ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا - کہ جب تمہارے بیٹوں یا پوتوں یا پڑپوتوں میں کوئی بات ہونے والی ہو اور ہم کہہ دیں کہ تم میں ایسا ہوگا تو اس بات پر تعجب نہ کرو - جیسا کہ عمران کے نواسہ کو خدا نے رسول بنانا تھا لیکن ان کو وحی یہ کی کہ میں تجھے فرزند دوں گا جو رسول ہوگا۔

سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ - ان کی زبان میں مریم کا ترجمہ عابدہ ہوتا تھا جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ تمام عالم سے خدا نے چار عورتوں کو منتخب فرمایا (۱) مریم بنت عمران (۲) آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون (۳) خدیجہ بنت خویلد (۴) فاطمہ بنت محمدؐ۔

أَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا - مریم کے حسنِ قبول اور حسنِ تربیت کے متعلق کہتے ہیں کہ ان سے پہلے کوئی لڑکی بیت المقدس میں عبادت کے لئے نذر نہ کی جاتی تھی - پس یہ پہلی لڑکی تھی جس کو اس مطلب کے لئے خدا نے قبول فرمالیا اور حسنِ تربیت یہ کہ کبھی دن یا رات میں ایک گھنٹہ بھر کے لئے بھی ان کو بیماری لاحق نہ ہوئی یا یہ کہ حسنِ قبول کا مطلب ہے کہ سعادت کے راستہ پر چلنے کی خدا نے زیادہ توفیق مرحمت فرمائی - حتّٰی کہ جب بعمر نو سال پہنچیں تو دن کو متواتر روزہ اور رات بھر عبادت میں بسر کرتیں - یہاں تک کہ تمام عابدوں سے سبقت لے گئیں اور حسنِ تربیت کا مطلب یہ ہے بہت جلد ترقی کرتی تھیں کہ عام بچوں کی سال کی ترقی اور اُن کی ایک دن کی ترقی برابر تھی۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا - کہتے ہیں جب حضرت مریم کی ولادت ہوئی تو اُن کی والدہ حنہ نے ان کو ایک کپڑا میں لپیٹا - اور مسجد میں لاکر احبار بنی اسرائیل سے فرمایا کہ یہ میری لڑکی ہے جس کے متعلق میں نے نذر کی تھی چونکہ بنی ماثان بنی اسرائیل کے سردار تھے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ

تو اس (نذر) کو قبول فرمایا اس کے رب نے اچھا قبول کرنا اور اس کو بڑھایا خوب بڑھانا اور کفالت دی اس کی زکریا کو۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ

جب بھی داخل ہوتے اس لڑکی پہ زکریا محراب (عبادت) میں پاتے اس کے پاس رزق پوچھتے

يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ

اے مریم کہاں سے تجھے یہ (پہنچا) وہ کہتیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے تحقیق اللہ رزق بھیجتا ہے

مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۷

جسے چاہے بغیر حساب کے

لہذا اپنے پیشوا اور سردار کی لڑکی سمجھ کر ہر ایک کے دل میں اس کی کفالت اور تربیت کی حرص پیدا ہوئی۔ تو حضرت زکریا نے فرمایا کہ یہ چونکہ میری زوجہ کی بھانجی ہے لہذا میں اس کی تربیت کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔

(صاحب تفسیر صافی فرماتے ہیں کہ ہماری روایات میں حضرت زکریا کی زوجہ حضرت مریم کی بہن تھی نہ کہ خالہ چنانچہ قمی اور عیاشی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی یہی روایت کی ہے)

تو احبار بنی اسرائیل نے جواب دیا کہ اگر اس کا حق تربیت قرابتداری کی بنا پر ہے تو پھر اس کی ماں کو اس کی تربیت کا زیادہ حق ہے بس اب اس کا فیصلہ یہ ہے کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جس کا نام قرعہ سے نکل آئے وہی اس کی تربیت کا حقدار ہوگا تو ۲۹ آدمی بقولے ۲۷ آدمی اس قرعہ اندازی میں شریک ہوئے پس سب کے سب دریا کے کنارے پہنچے اور ہر ایک نے اپنے اپنے قلم پانی میں پھینکے سوائے حضرت زکریا کے سب کے قلم ڈوب گئے اور ان کا قلم پانی کی سطح پر تیرتا رہا اور بعض کہتے ہیں کہ باقی لوگوں کے قلم دریا میں بہہ گئے اور حضرت زکریا کا قلم پانی میں ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ پس حضرت زکریا کے سپرد حضرت مریم کی کفالت و تربیت ہوئی۔ اور حضرت زکریا حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھے اور ان موجودہ احبار کے رئیس بھی تھے اور نبی بھی۔ پس حضرت زکریا نے حضرت مریمؑ کے لئے علیحدہ حجرہ بنایا جس میں وہ رہتی تھیں اور اپنی زوجہ یعنی حضرت یحیٰی کی والدہ کو اس کے رضاع پر مامور فرمایا۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ نے کسی عورت کا دودھ نہیں پیا۔ بلکہ خداوند کریم نے ابتداء سے اس کے لئے جنت کے رزق کا انتظام فرمادیا تھا۔

القصہ جب جوان ہوئیں تو حضرت زکریا نے مسجد میں ان کے لئے ایک علیحدہ محراب عبادت بنایا تاکہ وہ باپردہ اس میں مشغول عبادت رہیں اور ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ لیکن حضرت زکریا جب ان کے پاس تشریف لاتے تھے تو ان کے پاس بے موسم

کے میوہ جات موجود پاتے تھے مثلاً موسم گرما میں موسم سرما کے میوے اور موسم سرما میں موسم گرما کے اور بالکل تر و تازہ ۔ اور حیرت سے دریافت فرماتے کہ یہ کہاں سے آیا ؟ تو وہ جواب میں کہتیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے اور خدا جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے"

اور حضرتِ مریمؑ کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ جب محراب عبادت میں مشغولِ نماز ہوتیں تو ان کی جبینِ مبین سے ایک نور ساطع ہو کر محراب کو منور کر دیتا تھا ۔ (صافی)

سبحان اللہ ! یہ مریم کی شان تھی ۔ مناسبتِ مقام کے لحاظ سے حضرت مریمؑ کبریٰ صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شان کے متعلق بھی صرف ایک روایت عرض کرتا ہوں جو اس مقام پر نہایت موزوں ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب فاطمہؑ اور حضرت امیرؑ کے خانگی معاملات کا دستور یہ تھا کہ گھر کے تمام کام کاج بتولِ معظمہؑ کے ذمہ اور باہر کے امور حضرت امیر علیہ السلام کے ذمہ تھے ایک دن جب امیر المومنین علیہ السلام گھر میں تشریف لائے تو دریافت فرمایا ۔ اے فاطمہؑ ! کوئی چیز کھانے کے لئے ہے ؟ تو خاتونِ جنتؑ نے عرض کی کہ آج تیسرے روز سے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے پہلے اطلاع کیوں نہ دی ؟ تو مخدومہ نے عرض کی کہ بابا جان نے فرمایا ہے کہ اپنے ابن عم (شوہر) سے کسی چیز کی فرمائش نہ کیا کرو ۔ اگر وہ خود کچھ لائیں تو احسان سمجھو ورنہ کسی شے کے لانے کی فرمائش نہ کرو" پس آپ باہر تشریف لائے اور کہیں سے ایک دینار قرض لیا ۔ بوقت شام واپس تشریف لا رہے تھے کہ رستہ میں مقداد بن اسود سے ملاقات ہوئی ۔ آپؑ نے اس سے بے وقت گھر سے نکلنے کا سبب دریافت فرمایا ۔ تو اس نے عرض کی ۔ یا امیر المومنینؑ بھوک کے مارے گھر سے نکلا ہوں ۔ آپ نے فرمایا ۔ کہ میری گھر سے نکلنے کی وجہ بھی یہی تھی ۔ اور ایک دینار قرض لایا ہوں ۔ لیکن تیری ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھتا ہوں ۔ لہذا یہ دینار تو لے لے ۔ پس دینار مقداد کو دے کر خالی ہاتھ واپس گھر کی طرف متوجہ ہوئے دیکھا کہ جناب رسالتمآبؐ تشریف فرما ہیں اور خاتون معظمہ مصروف عبادت ہیں اور درمیان میں ایک سرپوش سے ڈھکی ہوئی چیز موجود ہے ۔ بی بی پاک جب نماز سے فارغ ہوئیں اور سرپوش اتارا ۔ تو دیکھا ایک بڑا برتن ہے جو گوشت و روٹی سے پُر ہے اس مقام پر جناب امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا : ۔ یَا فَاطِمَۃُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا ۔ (اے فاطمہؑ آپ کو یہ چیز کہاں سے پہنچی ؟ تو جناب سیدہؑ نے عرض کی ۔ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۔ (یہ اللہ کی جانب سے ہے اور خدا جسے چاہے بے حساب رزق عنایت فرماتا ہے ۔)

نکاتِ علمیہ

(۱) لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی : ۔ (جملہ معترضہ) فرمانِ خدا ہے نہ کہ والدۂ مریم کا مقولہ ہے کیونکہ اگر اُن کا مقولہ ہوتا ۔ تو چونکہ لڑکے کی خواہشمند تھیں اور بجائے اس کے لڑکی کی ماں بن بیٹھیں تو مقام حسرت میں کہنا چاہیئے تھا ۔ لَیْسَ الْاُنْثٰی کَالذَّکَرِ ۔ یعنی یہ عطا شدہ لڑکی ، لڑکے کی جگہ پُر نہیں کر سکتی ۔ کیونکہ ہر وہ مقام جہاں ایک اعلیٰ چیز کے طالب کو ناقص چیز ملے تو اظہار میں ناقص کا نام لے کر کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی مانند نہیں ہو سکتی جس کا میں طالب تھا اور اگر یہ جملہ فرمانِ خدا قرار دیا جائے تو مقصد یہ ہوگا کہ والدۂ حضرت مریم چونکہ دل میں لڑکے کی متمنی تھیں اور

ان کو خیال بھی یہی تھا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا اور خداوند کریم کے نزدیک مقدر یہ تھا کہ ان کو حضرت مریم عطا کرکے اس کے شکم اطہر سے لڑکا بغیر باپ کے عطا کروں جو رسول و نبی ہو اور اولوالعزم پیغمبر ہو۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکا جس کو مادرِ مریم چاہتی تھی وہ اس کی لڑکی جیسا نہیں ہوسکتا تھا۔ جو ان کو بالفعل عطا ہوئی۔ کیونکہ وہ لڑکا یقیناً ان خصوصیات کا حامل نہ ہوتا۔ جو حضرت مریم میں اور ان کے فرزند حضرت عیسےٰ علیہ السلام میں تھیں اور جن مفسرین نے اس جملہ کو مادرِ مریم کا مقولہ قرار دیا ہے اُن کو تصحیح معنی کے لئے تکلفات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(۲) مادرِ مریم نے خدا سے دو دعائیں طلب کیں۔ پہلی دعا بچے کی مقبولیت کے لئے کہ میں نے اس کو اپنی ولایت مادری سے آزاد کرکے تیری عبادت گزاری اور خدمت بیت المقدس کے لئے نذر کی ہے پس تو اسے قبول فرما۔ اور دوسری دعا چونکہ ان کو بذریعہ پیشین گوئی یا الہام یا ذاتی اندازے کے یقین تھا کہ مجھے لڑکا عطا ہوگا تو جب لڑکی عطا ہوئی تو ان کا وہ نظریہ فوراً بدل گیا اور علم سابق کے ذریعے سمجھیں کہ وہ معہود لڑکا اس لڑکی کے بطن سے ہوگا۔ لہٰذا اس لڑکی کا نام مریم تجویز کرکے دعا مانگی کہ میرے اللہ اس بچی کو اور اس کی ذریت کو شیطان رجیم کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس خداوند کریم نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں پہلی دعا کے جواب میں فرمایا۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ۔ جو مریم کے اصطفا کی طرف اشارہ ہے اور دوسری دعا کے جواب میں فرمایا۔ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا۔ یعنی ان کی تربیت اور پرورش نہایت صاف و پاکیزہ طریق سے فرمائی۔ یہ شیطان رجیم سے حفاظت کا عہد ہے اور جو حضرت مریم کی طہارت کی طرف اشارہ ہے چنانچہ بعد میں إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ اسی امر کی تصریح ہے۔

(۳) اَلْمِحْرَابَ۔ مسجد یا گھر میں ایک مخصوص مقامِ عبادت کو کہتے تھے لیکن آج کل مسجد کی جانب قبلہ کی دیوار کے وسط میں جو جگہ پیش نماز کے لئے مخصوص طور پر بنائی جاتی ہے اسے محراب کہا جاتا ہے اس کی وجہ تسمیہ کے لئے چند قول ہیں۔

(۱) چونکہ شیطان اور خواہشاتِ نفسانیہ کے ساتھ یہ جگہ مقامِ حرب ہے اس لئے اس کو محراب کہتے ہیں؛

(۲) یہ حریب سے نکلا ہے جس کا معنی ہے لٹا ہُوا چونکہ انسان اس مقام پر دنیاوی مشاغل سے تہی دامن اور فارغ القلب ہوکر آتا ہے تو گویا وہ ان چیزوں سے لٹا ہوا ہوتا ہے۔ پس اس مقام کو محراب اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ گھر میں صدر مجلس کو محراب البیت کہا جاتا ہے اور بعد میں جب مساجد کی بنا ہوئی تو ان کے صدر مقام کو بھی محراب کا نام دیا گیا ہے ان کے علاوہ اور وجوہ بھی بیان کئے گئے ہیں۔

بہر حال اس مقام پر وہ مقام مخصوص مراد ہے جو حضرت مریم کی مخصوص عبادت گاہ تھا اور حضرت مریم تنہا اس میں عبادتِ خدا کیا کرتی تھیں۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً

وہیں (حضرت) زکریا نے اپنے رب سے دعا مانگی کہا ۔ اے پروردگار ! مجھے عطا فرما اپنی بارگاہ سے پاکیزہ اولاد ۔

طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ

تحقیق تو ہی دعا کے سننے والا ہے پس اُسے فرشتوں نے ندا دی درحالیکہ وہ کھڑے نماز

يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ

پڑھ رہے تھے محراب میں ۔ اے زکریا ۔ تحقیق اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے ۔ جو تصدیق کرنے والا ہوگا کلمۃ اللہ

مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿٣٩﴾

کی اور سید اور پاکباز اور نبی ہوگا صالحین میں سے ۔

حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ کی بشارت

جب حضرت زکریا نے جناب مریم کے پاس بے موسم کے میوہ جات ملاحظہ فرمائے تو جناب مریم کی عظمت و کرامت دیکھ کر ان کے دل میں اسی جیسی باکرامت اولاد کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ وہیں طیب اولاد کے لئے دعا مانگی جو منظور ہوئی اور خداوندکریم نے حضرت یحییٰ کو حضرت عیسےٰ کے ساتھ اکثر امور میں مشابہت عطا فرمادی چنانچہ قرآن مجید میں دونوں کے اوصاف سے اس حقیقت کا صاف پتہ چل رہا ہے اور یہ حضرت زکریا کی دعا کا اثر تھا اور حضرت یحییٰ کو مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ فرمایا ۔ حالانکہ دوسرے مقام پر کلمہ سے مراد حضرت مسیح ہیں تو اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسےٰ کے اتباع و اوصیاء میں سے تھے ۔

حَصُورًا ۔ عورتوں سے بچنے والا ۔ لیکن یہاں مراد ہے خواہشات و لذاتِ نفسانیہ سے پرہیز کرنے والا ۔

آيَتُكَ الخ ۔ بروایت عیاشی حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت زکریا کو فرشتے نے ولادت یحییٰ کی بشارت دی تو حضرت زکریا نے اطمینانِ قلب کے لئے نشانی طلب کی تاکہ یقین ہوجائے کہ وہ آواز وسوسہ نہیں تھا پس وحی ہوئی کہ تیری زبان تین دن بجز ذکر خدا کے عام کلام کرنے سے بند ہوگی ۔ پس اس نشانی سے حضرت زکریا مطمئن ہوگئے ۔

حضرت یحییٰ کی حضرت عیسےٰ سے مشابہت

حضرت زکریا کی دعا کی مقبولیت کا اثر تھا کہ حضرت یحییٰ کو خدا نے حضرت مریم اور حضرت عیسےٰ کے کمالات کا جامع بنا دیا ۔

(۱) حضرت یحییٰ کی ولادت بشارت کے بعد ہوئی جیسا کہ حضرت عیسےٰ کی ولادت بشارت کے بعد ہوئی تھی ۔

(۲) حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسےٰؑ دونوں کے نام جناب رب العزت کی طرف سے تجویز شدہ تھے اور دونوں کا معنی بھی ایک ہے۔
(۳) حضرت یحییٰ کے متعلق ہے۔ یَا یَحْیٰی خُذِ الْكِتَابَ اور حضرت عیسےٰ کے متعلق ہے۔ آتَانِيَ الْكِتَابَ۔
(۴) حضرت یحییٰ کے لئے فرمایا:۔ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا اور حضرت عیسےٰ کہہ رہے ہیں۔ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا۔
(۵) حضرت یحییٰ کے لئے ہے حَنَانًا مِنْ لَدُنَّا وَزَكَوٰةً وَكَانَ تَقِيًّا۔ اور حضرت عیسےٰ کے متعلق ہے:۔ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَمَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلوٰةِ وَالزَّكوٰةِ۔
(۶) حضرت یحییٰ کی شان ہے۔ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔
اور حضرت عیسےٰ کی بھی یہی شان ہے وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا۔
(۷) حضرت یحییٰ پر تین جگہ سلام ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔
اور حضرت عیسےٰ پر بھی تین سلام ہیں:۔ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا۔
(۸) حضرت یحییٰ کو سید کہا اور حضرت عیسےٰ کو وَجِيهًا عِنْدَهُ کا خطاب دیا۔
(۹) جس طرح حضرت یحییٰ کو حصور نبی اور صالحین میں سے کہا۔ اسی طرح حضرت عیسےٰ بھی انہی صفات سے متصف تھے۔
(۱۰) حضرت زکریاؑ کے پاس جس طرح فرشتہ بشارت لایا تھا حضرت مریمؑ کے پاس بھی فرشتہ آیا تھا۔
(۱۱) حضرت زکریاؑ نے اپنا بڑھاپا اور اپنی زوجہ کا عقیم ہونا پیش کیا تھا۔ اُدھر مریمؑ نے اپنا بغیر شوہر کے ہونا ظاہر کیا تھا۔ پس جس لہجہ میں حضرت زکریاؑ کو جواب دیا گیا تھا۔ اسی جیسا جواب حضرت مریم کو بھی دیا گیا۔
(۱۲) حضرت زکریاؑ کو کہا گیا:۔ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا۔
اور حضرت مریمؑ کو تعلیم دی گئی۔ إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا۔
(۱۳) بعض لوگوں نے عیسےٰ کا معنی يَعِيشُ کہا ہے پس یحییٰ اور عیسےٰ دونو لغوی معنی کے لحاظ سے بھی ایک جیسے ہیں۔

نُکتہ:۔ کلام وہ ملفوظات ہیں جو باہمی نسبت و ربط پر مشتمل ہو کر مخاطب تک مافی الضمیر کے پہنچانے کا ذریعہ ہوں۔ اور اُسے قول بھی کہا جاتا ہے لیکن عرفِ عام میں ہر وہ حرکت جو مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے اُسے بھی کلام و قول کہا جاتا ہے خواہ آواز کی قسم ہو یا اشارہ و رمز کے طریقہ سے ہو۔ آواز ایک ہو یا متعدد ہوں اور ہر وہ آواز جو پورا فائدہ دے سکنے والی ہو خواہ کسی منہ سے نہ نکلے اُسے کلام و قول کہنے میں تو کسی کو مجالِ توقف ہی نہیں۔ قرآن مجید نے وساوس شیطانی کو بھی کلام و قول شیطان سے متعدد مقامات پر تعبیر فرمایا ہے اگرچہ بعض مقامات پر اسے امر۔ وسوسہ۔ وحی اور وعدہ بھی کہا گیا ہے چنانچہ يَأْمُرُ يُوَسْوِسُ يُوحِي۔ اور يَعِدُ کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں۔ پس جملہ خطرات و وساوسِ شیطانی کو کلام و قولِ شیطان کہا جاتا ہے۔
اس کے مقابلہ میں خدا کی جانب سے انسان کے دل میں جو باتیں تائیدی طور پر پہنچتی ہیں۔ انہیں وعدہ۔ حکمت۔ نور۔ سکینہ

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ

عرض کی اے پروردگار! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ حالانکہ مجھے بڑھاپا پہنچ چکا ہے۔ اور میری عورت بانجھ ہے

قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝٤٠ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ؕ

کہا (فرشتے نے) کہ خدا اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے عرض کی اے رب مقرر کر میرے لئے کوئی نشانی۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ

فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو نہ بولے گا لوگوں سے تین دن تک مگر اشارے سے۔ اور یاد کر اپنے

رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ ۝٤١

رب کو بہت اور اس کی تسبیح کر صبح و شام

اور شرح صدر وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انہی خطابات روحانیہ کو کلام و قول ملائکہ بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ آیات قرآنیہ میں سیر کرنے کے بعد آسانی سے اس نتیجہ تک پہنچا جا سکتا ہے پس معلوم ہوا کہ ملائکہ اور شیاطین دل میں معانی و مطالب کے القاء کے طور پر انسان سے کلام کیا کرتے ہیں۔ کلام ملکی اور وسوسۂ شیطانی میں فرق یہ ہے کہ کلام ملکی میں شرحِ صدر۔ مغفرت و فضل خداوندی کا وعدہ ہوتا ہے اور اس میں کتاب وسنت کی پوری موافقت ہوا کرتی ہے لیکن بخلاف اس کے وسوسۂ شیطانی میں تنگ دلی بخل خواہش پرستی۔ وعدۂ فقر اور ارتکاب معصیت کی دعوت ہوتی ہے جس کا ماحصل خدا و رسولؐ کی صریح مخالفت ہوتی ہے۔

انبیاء کے لئے بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ملائکہ مجسم ہو کر اُن کے سامنے آئے اور ان سے ہمکلام ہوئے اور بعض اوقات شیطان بھی تجسم کے بعد اُن سے گویا ہوا۔ جس طرح کہ قرآن میں انبیاء کے قصص و واقعات میں تصریح سے مذکور ہے۔

حضرت زکریاؑ کو ملائکہ کا ندا دے کر فرزند کی بشارت دینا ظاہراً تجسم کی صورت میں نہیں تھا بلکہ القاء قلبی کے طریقہ پر تھا جسے وہ فوراً کلام ملکوتی سمجھتے ہوئے مطمئن ہو گئے اور مزید سرور اور شرح قلب کے لئے نشانی کے طالب ہوئے اور اسی کلام ملائکہ یا ان کے قول اور ندا کو دوسری آیات میں خداوند کریم نے اپنی طرف بھی منسوب فرمایا ہے اور حضرت زکریاؑ کے تین دن تک کلام نہ کرنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ تین دن متواتر آپ کی زبان سوائے ذکر خدا کے کسی اور طرف متحرک نہ ہوئی۔

شکم مادر میں کلام

حضرت یحییٰ سب سے پہلے حضرت عیسےٰ پر ایمان لائے یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے اور حضرت یحییٰ چھ ماہ عمر میں حضرت عیسےٰ سے بڑے تھے اور حضرت عیسےٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے شہید کر دیئے گئے تھے۔ تفسیر امام علیہ السلام سے تفسیر صافی میں منقول ہے کہ سوائے حضرت زکریاؑ کے حضرت مریمؑ کے پاس کوئی بھی نہیں جایا کرتا تھا اور آپ جس طرف جاتے تھے حضرت مریمؑ کے حجرہ کو قفل لگا کر جاتے تھے پس جب حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ

کا حمل ہوا۔ تو حضرت زکریاؑ نے محسوس فرمایا کہ لوگ اس معاملہ میں مجھے تہمت دیں گے چنانچہ اپنی زوجہ سے یہ ماجرا بیان کیا تو اس نے جواب دیا کہ آپ خوف نہ کریں اور مریمؑ کو میرے پاس لائیں تاکہ میں اس سے حقیقت دریافت کروں۔ پس حضرت زکریاؑ حضرت مریمؑ کو لائے تو چونکہ حضرت زکریا کی زوجہ مریم کی بڑی بہن تھی۔ لہذا تعظیم کے لئے نہ اٹھی تو حضرت یحییٰؑ نے بقدرت خدا شکم مادر میں آواز دی اے اماں :۔ آپ کے پاس جہان کی عورتوں کی سردار آئی ہے جو جہان کے مردوں کے سردار کی ماں ہے لہذا آپ کو اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہیئے پس زوجہ زکریاؑ تعظیم مریمؑ کے لئے اٹھیں۔

اہلبیت عصمت کے لئے بھی شکم مادر کے اندر کلام کرنا روایات سے ثابت ہے کہتے ہیں جناب رسالتمآبؐ جب جناب فاطمہ بنت اسد کے پاس تشریف لاتے تھے تو جناب فاطمہ تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ بعض بنی ہاشم نے بی بی کو اس تعظیمی قیام سے روکنا چاہا۔ تو شکم سے آواز بلند ہوئی کہ اماں :۔ یہ رسول و سید کائنات ہیں ان کی تعظیم کے لئے آپ کو اٹھنا چاہیئے دکتب معتبرہ سے یہ روایت اگرچہ مجھے نہیں مل سکی لیکن بیان کرنے والے اسی طرح بیان کرتے ہیں البتہ یہ فعل قدرت خدا سے بعید نہیں اور نیز اس کی نظیر بھی پہلے حضرت یحییٰؑ میں موجود ہے۔ لہذا استحجاب کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح شکم اطہر میں جناب بتول معظمہ خاتون جنت کا اپنی ماں کے لئے مونس تنہائی ہونا اور سید الشہداء روحی اور ارواح المومنین لہ الفدا کا شکم مادر میں اپنی والدہ ماجدہ سے ہمکلام ہونا بھی روایات میں موجود ہے جو خدا درخت میں کلام پیدا کر سکتا ہے۔ حیوانات سے کلام کروا سکتا ہے بلکہ جمادات سے بھی گویائی پیدا کر سکتا ہے چنانچہ جناب رسالتمآبؐ کے ہاتھوں پر سنگریزوں کا بولنا اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرنا عام کتب میں مذکور ہے پس کیا عجب ہے کہ وہ بچے کو شکم کے اندر طاقت گویائی دے دے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے تو بعد از پیدائش بھی بچہ بولنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایک خاص عرصہ اس کی تربیت ظاہری میں صرف نہ ہو جائے پس ہر خلاف عادت چیز کو محال عقلی کہنے والے تو حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں تکلم کرنے یا بچے کے حضرت یوسف کی پاکدامنی کی گواہی دینے کو بھی اوپری نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن قدرت خدا کو محیط جاننے والوں کے لئے جس طرح بعد از ولادت اور قبل از وقت بچے کا بولنا ممکنات میں سے ہے اسی طرح قبل از ولادت بھی ممکنات میں سے ہے البتہ عادتاً محال ہے لیکن بہت سے عادی محال بقدرت خدا واقع ہو جایا کرتے ہیں اور خدا ہر شے پر قادر ہے اور یہی چیز خاصان خدا کا دوسری عام مخلوقات سے طرۂ امتیاز ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ تحقیق اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک کیا

وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ

اور تجھے برگزیدہ فرمایا عالمین کی عورتوں پر اے مریمؑ قنوت کر اپنے رب کے لئے

وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے

انتخاب مریم

وَاِذْ قَالَتْ :- گذشتہ اِذْ قَالَتْ پر عطف ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ حضرت مریم محدّثہ تھیں کہ ان سے فرشتے کلام کرتے تھے اور پہلے اصطفا سے مراد قبول کر لینا اور دائرہ محبت میں لے لینا ہے اور دوسرے اصطفا سے مراد منتخب و برگزیدہ کرنا دوسروں کے مقابلہ میں ہے اسی لئے پہلا مطلق ہے اور دوسرا علےٰ کے ساتھ مستعمل ہے نیز ان کی طہارت سے مراد عصمت ہے اور بعضوں نے بتول ہونا مراد لیا ہے یعنی آلائش حیض سے پاک و صاف تھی تاکہ ہر وقت بیت المقدس میں رہ کر عبادت کر سکے اور بعید نہیں کہ دونوں معنی اس مقام پر مراد ہوں اور پہلا معنی زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ چونکہ حضرت عیسےٰ کی ولادت کا بعد میں تذکرہ ہے اور وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے پس حضرت مریمؑ کی عصمت کی پہلے شہادت دے دی تاکہ کسی کو اس کے متعلق شک و شبہ کی مجال نہ رہے اور بدگمانی کی طرف کوئی ذہن اقدام نہ کرے۔

سوال :- کیا حضرت مریمؑ کو پورے عالمین کی عورتوں پر برگزیدگی کا شرف حاصل ہوا ہے۔

جواب :- آیت مجیدہ کے ظاہری الفاظ تو اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں کیونکہ عالمین جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف و لام بھی داخل ہے اور قواعد کے لحاظ سے اس کا معنی استغراق ہوتا ہے۔ یعنی حضرت مریم کو تمام جہانوں کی عورتوں پر خدا نے سبقت دے دی۔ اور نیز استثناء کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو تمام جہانوں کی عورتوں پر ترجیح دی گئی لہذا یہ کہنا کہ اس کو صرف اپنے زمانہ کی عورتوں پر فوقیت عطا کی گئی آیت مجیدہ کا ظاہر اس مطلب کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔

سوال :- عقیدہ شیعہ کی رُو سے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا عالمین کی عورتوں کی سردار ہے چنانچہ جناب رسالتمآبؐ سے اس بارہ میں متعدد فرامین صادر ہوئے ہیں نیز کتب فریقین میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :- میری شہزادی فاطمہؑ جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جنّت صرف ایک عالم کی عورتوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالمین کی پاک و نیک عورتیں وہاں ہوں گی اور جناب فاطمہؑ بلا استثناء سب کی سردار ہے لیکن آیت مجیدہ میں حضرت مریم کو تمام جہانوں کی عورتوں میں سے برگزیدہ کہا گیا ہے اب ان ہر دو مقاموں پر غور کرنے کے بعد تعارض سامنے آجاتا ہے اور آیت اور حدیث میں تعارض کی صورت میں آیت ہی کو ترجیح دی جایا کرتی ہے۔

جواب :۔ آیت مجیدہ میں حضرت مریمؑ کو برگزیدگی کا تمغہ عطا کیا گیا ہے اور حدیث پاک میں جناب فاطمہؑ زہرا کو سیادت کا تاج دیا گیا ہے لیکن ہر دو مقام پر حصر نہیں ہے لہذا مریمؑ کا انتخاب جناب فاطمہؑ کے انتخاب کے منافی نہیں اور حضرت فاطمہؑ کی سیادت جناب مریمؑ کی سیادت سے متصادم نہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین بھی اس کرامت میں ان کے ساتھ شریک ہوں چنانچہ شیعہ و سنی ہر دو کی کتب میں اس کی تائید موجود ہے۔

(۱) عَنِ الدُّرِّ الْمَنْثُوْرِ عَنْ اَنَسٍ: اِنَّ رسول اللہ قال حسبك من نساء العالمين مريم بنت عمران وخديجة بنت خويلد وفاطمه بنت محمد وآسية امراة فرعون۔

(۱) دُر منثور۔ انس سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ تمام جہانوں کی عورتوں میں سے مریم بنت عمران خدیجہ بنت خویلد، جناب فاطمہ بنت محمدؐ اور آسیہ زوجہ فرعون فضیلت و شرف کے لئے کافی ہیں۔

(۲) وفيه عن ابن عباس۔ قال رسول اللهِ افضل نِساء العالمين خديجه وفاطمه و مريم وآسية امراة فرعون۔

(۲) ابن عباس سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا۔ کہ عالمین کی عورتوں میں سے افضل۔ خدیجہ، فاطمہ، مریم اور آسیہ زوجہ فرعون ہیں۔

(۳) وَفيه عن الحسن۔ قال رسول اللّٰهِ اِنَّ اللّٰه اصطفٰی علٰی نساء العٰلمين اربعًا آسية بنت مزاحم ومريم بنت عمران وخديجه بنت خويلد وفاطمه بنت محمّد صلى الله عليه وآله وسلم

(۳) حسن بصری سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ تمام جہانوں کی عورتوں میں سے خدا نے چار کو چن لیا۔ (۱) آسیہ بنت مزاحم (۲) مریم بنت عمران (۳) خدیجہ بنت خویلد (۴) فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۴) الخصال۔ عن ابن عباسؓ قال خطّ رسول الله اربع خطوطٍ ثم قال خير نساء اهل الجنه مريم بنت عمران و خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد وآسية بنت مزاحم امرأة عمران

(۴) خصال میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے چار خط کھینچے اور پھر فرمایا کہ جنت کی عورتوں میں سب سے بہترین۔ مریم دختر عمران۔ خدیجہ دختر خویلد۔ فاطمہ دختر محمد اور آسیہ دختر مزاحم زوجہ فرعون ہیں۔

(۵) وفيه عن ابى الحسن الاول عليه السّلام قال قال رسول اللهِ اِنَّ الله عزّ وجلّ اختار مِن النساء اربعًا مريم وآسيه و خديجه وفاطمه الخبر۔

(۵) امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے۔ کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ تحقیق اللہ سبحانہٗ نے عورتوں میں سے چار کو منتخب فرمایا۔ یعنی مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ الخبر۔

بہرکیف اس مضمون کی احادیث کتب فریقین میں حد تواتر تک پہنچی ہیں۔

(۲) جس طرح ایک سکول کی ایک کلاس میں مختلف مضامین کے لحاظ سے چند طلبہ نمبر اوّل پر فائز ہو جایا کرتے ہیں اگرچہ مجموعی طور پر ان کے مراتب میں کافی فرق ہوتا ہے مثلاً ایک لڑکا ایک مضمون میں فسٹ ہے دوسرا دوسرے میں، تیسرا تیسرے میں اور چوتھا چوتھے میں، تو کہا جائے گا کہ چاروں پورے سکول میں فسٹ ہیں لیکن مجموعی نمبروں کا تناسب ہوگا تو ان چاروں میں ایک فسٹ ہوگا دوسرا سیکنڈ وعلیٰ ہذا القیاس۔ بہرکیف یہ ضروری نہیں کہ جس طرح وہ اپنے ایک ایک مضمون میں امتیازی شان کے حامل ہیں مجموعی طور پر بھی وہ سب کے سب یکسانیت رکھتے ہوں بلکہ عام عادت کا تقاضا یہی ہے کہ ان میں تفاوت ہوگا اور ان کا یہ باہمی تفاوت ان کے پورے سکول یا جماعت میں فسٹ آنے کے منافی نہیں۔

پس اسی طرح درست ہے کہ پورے عالمین میں سے چند خواتین ممتاز ہوں۔ لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے اور مجموعی طور پر ان سب میں سے صرف ایک ہی ممتاز ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت مریم کس صفت میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ اور اس کی مصطفائی و برگزیدگی کا محور و مدار کونسی صفت ہے۔

تو اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے اور حضرت مریم کے متعلق آیاتِ الٰہیہ کو غور سے دیکھا جائے تو جناب مریم کا کوئی فضیلت کا پہلو ایسا نہیں جس کو قرآن مجید نے بیان نہ کیا ہو۔ چنانچہ حضرت مریم کی خصوصی صفات میں سے جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے یہ ہیں۔

(۱) حضرت مریم حیض اور اس قسم کی آلائشات نسوانی سے پاک و منزّہ تھیں۔

(۲) عفیفہ اور پاک دامن تھیں اور دونوں صفتوں کو طَهَّرَكِ کا لفظ ظاہر کر رہا ہے اور نیز اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا جملہ بھی حضرت مریم کی عفت پر نص ہے۔

(۳) کلمات اللہ کی تصدیق کرنے والی تھی۔

(۴) کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والی تھی چنانچہ فرماتا ہے۔ صَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ۔

(۵) قنوت کرنے والی تھی چنانچہ ارشاد ہے۔ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ۔

(۶) فرشتے ان سے کلام کرتے تھے پس محدّثہ تھی۔

اور ظاہر ہے کہ ان صفات کے لحاظ سے حضرت مریم کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں دوسری متعدد خواتین بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ ہاں مریم کی وصف و ثنا جو قرآن میں خصوصیت کے ساتھ اور متعدد مرتبہ نہایت اہمیت سے بیان ہوئی ہے وہ ہے حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے تولّد کا قصہ۔ چنانچہ ابھی بعد کی آیتوں میں بیان ہوگا۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ الخ ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (سورۂ انبیاء) اسی طرح ایک اور مقام پر ہے وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ الخ (سورۂ تحریم)

پس قرآن مجید میں حضرت مریم کی جملہ مذکورہ صفات میں سے صرف حضرت مسیح کی والدہ ہونا اور کسی مرد کے مَس کئے بغیر حضرت عیسٰےؑ کی ماں بننا ان کا ایک ایسا خصوصی نشان ہے کہ اس میں عالمین کی عورتوں میں سے اس کا کوئی بھی شریک نہیں پس وہ اس صفت اور شان میں امتیاز کلی کی حامل ہیں اور تمام جہانوں کی عورتوں میں سے وہ اس لحاظ سے برگزیدہ اور منتخب ہیں نہ کہ تمام باقی صفات کے اعتبار سے جیسا کہ ظاہر ہے پس جن روایات میں حضرت مریمؑ کو عالمین کی عورتوں میں سے ایک امتیازی حیثیت کی حامل کہا گیا ہے ان میں ان کی صرف اسی خصوصیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی طرح حضرت مریم کے علاوہ جناب خدیجہؑ اور جناب آسیہ بھی عالمین کی عورتوں میں سے دامنِ انتخابِ خداوندی کے اندر داخل ہیں اور یہ انتخاب ان کی نمایاں اور مخصوص بعض صفات کے تحت ہے جو ان کی عالمین میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ پس باقی تمام عورتوں پر تو اُن کی فضیلت ثابت ہو گئی لیکن کیا یہ چاروں پاک بیبیاں مساوی اور یکساں رتبہ پر فائز ہیں؟ حضرت مریمؑ کے متعلق قرآنی تصریح صرف اس کے اپنی مخصوص صفت کے لحاظ سے منتخب اور ممتاز ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور الفاظ آیت اور ترکیب جملہ قطعاً مریم میں اصطفاء کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتے اور فرمانِ نبویؐ میں چار بیبیوں کے انتخاب کا اعلان بھی مریم میں انتخاب کے حصر کے منافی ہے جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن حضرت مریم کے مجموعی صفات کے نتیجے کے اعلان سے ساکت ہے تو فرمانِ نبویؐ جناب فاطمہؑ کی عمومی سیادت کے اعلان کے متعلق یقیناً تعارض سے خالی ہے بلکہ بعض روایات میں تو حضرت مریمؑ کی سیادت کی حضرت فاطمہ کے مقابلہ میں صاف طور پر نفی موجود ہے جیسا کہ درمنثور سے منقول ہے۔

عن فاطمہ :- قال لی رسول اللّٰہؐ انتِ سیدۃ نساء اھل الجنّۃ لامریم البتول (یعنی جناب رسالتمآبؐ نے فاطمہؑ سے فرمایا۔ کہ جنت کی عورتوں کی صرف تو ہی سردار ہے نہ کہ مریمؑ بتول۔

احادیث آئمہ علیہم السلام میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ حضرت مریمؑ کا اصطفاء صرف عیسٰےؑ کی ولادت کے لئے تھا چنانچہ

(۱) عن تفسیر القمی قال علیہ السلام اصطفاھا مرتین اما الاولی فاصطفاھا ای اختارھا واما الثانیۃ فانھا حملت من غیر فحل فاصطفاھا بذالک علی نساء العالمین۔

تفسیر قمی سے منقول ہے کہ معصوم نے فرمایا۔ خداوندکریم نے مریم کو دو دفعہ چُنا۔ پہلی دفعہ تو (اپنی عبادت کے لئے) اُسے مختار بنایا اور دوسری دفعہ وہ چونکہ بغیر شوہر کے حاملہ ہوئیں پس اس کو تمام عالمین کی عورتوں پر اس خصوصیت کے لحاظ سے منتخب فرمایا۔

(۲) عن المجمع قال ابوجعفرؑ معنی الآیۃ اصطفٰک لذریۃ الانبیاء وطھرک من السفاح واصطفٰک لولادۃ عیسٰی من غیر فحل

(۲) امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ آیت کا معنی یہ ہے۔ کہ خدا نے تجھے ذریت انبیاء ہونے کے لئے برگزیدہ کیا۔ اور بدکاری سے پاک کیا اور بغیر باپ کے عیسٰےؑ کی پیدائش کے لئے تجھے انتخاب کیا۔

پس قرآن مجید میں تدبر کرنے اور احادیث میں نظر دوڑانے کے بعد یہ نتیجہ بخوبی سامنے آجاتا ہے کہ حضرت مریمؑ کا عالمین

کی عورتوں پر اصطفاء صرف اسی خصوصی صفت کی بناء پر ہے اور یہی وہ صفت ہے جس سے عالمین کی عورتیں محروم ہیں۔ لیکن جناب خاتونِ جنت کی سیادت کسی ایک وصف کے پیش نظر نہیں بلکہ علی الاطلاق ان کو سیدۃ نساء العالمین کا خطاب دیا گیا ہے پس وہ مریمؑ سے بھی افضل ہیں اور باقی عام عورتوں سے بھی ان کو سبقت حاصل ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہ چاروں عصمت مآب بیبیاں بعض اوصافِ مخصوصہ میں عالمی امتیاز رکھتی ہوں۔ لیکن جملہ صفاتِ حسنہ کے لحاظ سے ان میں باہمی طور پر تفاوتِ مراتب ہو۔ اور بعض بعض سے افضل ہوں چنانچہ مثالِ سابق سے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

اعتراض: اب رہا یہ سوال کہ حضرت مریمؑ کے اصطفاء کا اعلان خداوند کریم نے بذریعہ قرآن مجید کے فرمایا۔ اور خاتونِ جنت کی سیادت کا اعلان حدیث کے ذریعے ہوا۔ قرآن کی سند قطعی اور حدیث کی سند ظنی ہے کو قطعی کے مقابلہ میں ظنی کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔

جواب: سندِ حدیث بے شک ظنی ہوتی ہے لیکن تواتر کے بعد اُسے بھی قطعیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور حدیثِ مذکور کا کتب فریقین میں متواتر ہونا ثابت ہے اور اگر بالفرض تواتر ثابت نہ بھی ہو تب بھی اس سے تمسک پکڑنے میں خرابی تب لازم آتی کہ آیت اور حدیث میں تعارض ہوتا اور ہم گذشتہ بیان میں ثابت کر چکے ہیں کہ مفہوم آیت و حدیث میں قطعاً تعارض نہیں۔ کیونکہ اولاً تو آیت مجیدہ اصطفاء کا مریم میں حصر نہیں بتلاتی اور ثانیاً جس خصوصیت کا مریمؑ میں حصر ہے اس سے کسی حدیث کا تعارض نہیں بلکہ وہ وصف صرف مریم کی ہی ہے اور قرآن مجید کا ایک امر کے بیان سے سکوت اس کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بلکہ بہت سے شرعی امور ایسے ہیں جن سے قرآن خاموش ہے لیکن بذریعہ حدیث اُن پر ایمان فرض ہے پس من جملہ ایسے اُمور کے ایک یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے۔

(۳) حضرت مریمؑ کی متذکرہ صفات جناب زہراء سلام اللہ علیہا میں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ تفسیر عمدۃ البیان میں جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جناب فاطمہ عالم کی عورتوں کی سردار، میری پارۂ جگر، نورِ چشم اور میوۂ دل ہے جب وہ عبادتِ خدا کے لئے محراب میں کھڑی ہوتی ہے تو اس کے نور سے ملائکہ اس طرح فیض حاصل کرتے ہیں جس طرح اہل زمین آسمانی ستاروں کی روشنی سے استفادہ کرتے ہیں اور خدا فرشتوں سے خطاب فرماتا ہے کہ میری کنیز خاص فاطمہ کو دیکھو کہ میرے خوف سے محراب عبادت میں مشغول گریہ ہے اور اس کا بدن کانپتا ہے وہ تمام عورتوں کی سردار ہے اور میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں اس کو اور اس کے شیعوں کو آتشِ جہنم سے بے خوف کروں گا۔ ادھر اگر مریم کے لئے اِصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ کا خطاب ہے تو جناب فاطمہؑ کے لئے يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ کا ارشاد ہے اگر وہ بتول تھیں تو یہ بھی بتول تھیں۔ اگر ان سے ملائکہ کلام کرتے تھے تو ان کے ساتھ بھی ملائکہ کا کلام کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب فاطمہؑ کا لقب محدثہ اس واسطے ہے کہ ملائکہ ان سے باتیں کرتے تھے۔ اور جناب مریم کی طرح اُن سے بھی خطاب کر کے کہتے تھے۔ يَا فَاطِمَةُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ يَا فَاطِمَةُ اُقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ

یہ غیب کی خبروں سے ہے۔ کہ ہم وحی کرتے ہیں تیری طرف اور آپ نہ تھے ان کے پاس جب وہ اپنے

اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

قلم ڈال رہے تھے کہ کون کفالت کرے گا مریم کی۔ اور آپ نہ تھے اُن کے پاس جب وہ جھگڑ رہے تھے

ترجمہ:۔ اے فاطمہ تحقیق اللہ نے تجھے چُن لیا اور پاک کیا اور عالمین کی عورتوں پر تجھے برگزیدہ فرمایا۔ اے فاطمہ اپنے ربّ کے لئے قنوت اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ ایک شب جناب فاطمہ نے فرشتوں سے کہا:۔ کیا مریم عالمین کی عورتوں سے افضل تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھی اور تُو تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے۔

اقول:۔ یعنی مریم اُس ایک خصوصی صفت کے لحاظ سے تو عالمین کی عورتوں سے ممتاز ہے اور مجموعی صفاتِ حسنہ کے اعتبار سے فقط اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہے اور جناب فاطمہ زہراؑ مجموعی صفات کے اعتبار سے عالمین کی عورتوں کی سردار ہے حضرت مریمؑ صرف ایک حجّتِ خدا حضرت عیسٰےؑ کی ماں ہے اور جناب فاطمہ گیارہ اماموں کی اصل ہے جن کے آخری امام حضرت عیسٰےؑ کے بھی مقتدا ہوں گے اور حضرت مریمؑ کی وہ خصوصی صفت جو عالمین کی عورتوں کے مقابلہ میں اس کا امتیازی نشان ہے یعنی بغیر شوہر کے عیسٰےؑ کی ماں بننا غالباً اس ضرورت کے ماتحت ہے کہ مریم معصومہ ہے اور اس زمانہ میں اُن کا کفو مردوں میں سے کوئی موجود نہ تھا کیونکہ زکریاؑ ان کے بہنوئی تھے اور یحییٰ ان کے بھانجے تھے اور ان کے علاوہ مردوں میں سے کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا۔ جو مریمؑ کا کفو ہو سکتا لیکن جناب فاطمہؑ کا کفو حضرت علیؑ موجود تھا اور حضرت مریمؑ کی یہ صفت اگرچہ اُن کی امتیازی حیثیت کی حامل ہے لیکن عوام کی نظروں میں اسے عیب کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت مریمؑ کے لئے وہ اتہام و بدگمانی کا موجب بن گئی۔ لیکن جناب فاطمہؑ کی ساحت عصمت اور دامن عفت اس بدنما عیب سے پوری طرح محفوظ و مصُون تھا پس اُن کی ناکتخدائی نے واقعیت کے لحاظ سے اگرچہ ان کو ممتاز کیا لیکن ظاہری طور پر ان کی بدنامی اور شرمساری کی موجب ہوئی چنانچہ اپنی پاکدامنی و عفت کے اثبات میں اُسے اپنے نوزائیدہ فرزند حضرت عیسٰےؑ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس طرف جناب فاطمہؑ کی حضرت علیؑ سے شادی جس طرح واقعیت کے لحاظ سے ان کے علوِ شان کی موجب تھی اسی طرح ظاہری نگاہوں میں بھی اُن کی برتری وسیادت کے لئے غیر متزلزل علامت ہے پس جناب فاطمہؑ کو اس اعتبار سے بھی حضرت مریمؑ سے وہ فوقیت حاصل ہے جس سے کسی منصف مزاج کو انکار کی مجال نہیں۔

يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ۔ تفسیر قمی سے منقول ہے کہ جب حضرت مریمؑ کا تولد ہُوا تو آل عمران نے اس کی کفالت و تربیت میں نزاع کیا اور ہر ایک اس کی کفالت اپنے ذمہ لینا چاہتا تھا پس جب تمام نے اکٹھے ہو کر قرعہ اندازی کی تو قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کا نکلا۔ لہٰذا حضرت مریمؑ کی تربیت ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن تفسیر عیاشی سے مروی ہے کہ حضرت امام محمد باقر

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ

جب کہا۔ فرشتوں نے اے مریمؑ۔ تحقیق اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے کلمہ کی جس کا

اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿۴۵﴾

نام مسیح عیسےٰ بن مریم جو مقبول ہوگا دنیا و آخرت میں اور مقرب بندوں سے ہوگا۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۴۶﴾

اور کلام کرے گا لوگوں سے جھولے میں اور بڑا ہو کر اور نیک بندوں میں سے ہوگا۔

علیہ السلام نے فرمایا۔ جب حضرت مریمؑ کا والد فوت ہوگیا تب انہوں نے اس کی تربیت میں جھگڑا کیا اور قرعہ اندازی کی۔

تنبیہ:۔ حضرت مریم کی ولادت، تربیت، زکریاؑ کی کفالت اور اس کے بعد حضرت مریمؑ کی برگزیدگی، طہارت اور قنوت و رکوع وسجود کے بعد قرعہ اندازی کا ذکر کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ قرعہ اندازی ان سب باتوں کے بعد واقع ہوئی تھی چنانچہ بعضوں نے یہ احتمال کیا ہے کہ حضرت مریمؑ کے جوان ہونے اور اس کے اصطفاء وطہارت وغیرہ کے بعد جب حضرت زکریاؑ بڑھاپے کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال سے عاجز ہوگئے تب ان لوگوں نے مریمؑ کی تربیت میں جھگڑا کیا اور باہمی قرعہ اندازی کی۔ کیونکہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے بلکہ قرعہ اندازی شروع ہی میں کی گئی تھی۔ البتہ اس کا ذکر تربیت وکفالت وطہارت وغیرہ کے بعد کیا گیا۔ جس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ جمع قرآن میں ترتیب نزول کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور یا یہ کہ کلام مجید کی اعجازی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے قصہ کی بعض خصوصیات کو دہرایا گیا اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ اور اُن کے صحابہ اس قصہ کے موقعہ پر موجود نہ تھے اور نہ انہوں نے بنی اسرائیل کی کتب کا مطالعہ کیا تھا نہ ان کے ساتھ کوئی خاص آمد ورفت یا نشست وبرخاست تھی تاکہ اُن کی زبانی بعض واقعات ان کو معلوم ہوگئے ہوں بایں ہمہ اس قصہ کا مطابق واقع ہونا اور بنی اسرائیل کے علماء کا مان لینا قرآن اور حامل قرآن کی صداقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے اسی بناء پر قصہ کو مختصر الفاظ میں ذکر کرتے کے بعد فرمایا کہ آپ تو اس وقت موجود نہ تھے جب ان کی باہمی قرعہ اندازی ہو رہی تھی اور جب مریم کو بشارت دی جا رہی تھی پس یہ غیب کی خبریں ہیں جو بذریعہ وحی کے ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔ یہ اس طرح ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تمام ہو چکنے کے بعد ارشاد فرمایا:۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ۔ (سورۃ یوسف) یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کو وحی کرتے ہیں حالانکہ آپ اس وقت موجود نہیں تھے جب انہوں نے مکر وفریب کا یہ معاملہ آپس میں طے کیا تھا؟

بشارت عیسےٰ:۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ یہ بشارت وہی ہے جس کو سورۂ مریمؑ میں تبدیلئ الفاظ سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ فرماتا ہے۔ پس ہم نے اس کی یعنی مریمؑ کی طرف اپنا رُوح بھیجا۔ پس وہ بشکل بشر اس کے سامنے گیا تو وہ کہنے لگی۔

میں تجھ سے اللہ کی پناہ لیتی ہوں اگر تو خوف خدا رکھتا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ میں اللہ کا فرستادہ تجھے پاکیزہ بچے کی خوشخبری دینے آیا ہوں۔ پس یہاں ملائکہ کا لفظ ہے اور وہاں اس کی بجائے روح کا لفظ رکھا گیا ہے۔

ملائکہ سے مراد بعض کہتے ہیں جبرئیل ہے اور جمع کا صیغہ اس کی عظمت و سیادت کے لئے ہے بعض کہتے ہیں واقعاً جبرئیل کے ساتھ اور ملائکہ بھی تھے اور ملائکہ یا رُوح کا حضرت مریمؑ کے ساتھ کلام کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت مریمؑ محدثہ تھیں۔ اور کلام مجید کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا اُن کے ساتھ کلام کرنا آواز اور الفاظ کی قسم سے اور رو برو تھا نہ کہ خطورِ قلبی بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ۔ کلمہ جب اللہ کی طرف منسوب ہو۔ تو اس کا معنی ہے وہ چیز جس سے اللہ کی مراد ظاہر ہو جیسے کلمۃ الایجاد اور کلمۃ الوحی اور اس مقام پر اس کی کئی توجیہیں کی گئی ہیں۔

(۱) کلمہ سے مراد حضرت مسیحؑ ہیں کیونکہ ان سے پہلے انبیاء بنی اسرائیل بشارت کے طور پر یہ کلمہ کہہ چکے تھے کہ ایک نبی آئے گا جو بنی اسرائیل کو نجات دلانے والا ہوگا۔ پس حضرت مسیحؑ وہی کلمہ تھے جس طرح کہ حضرت موسیٰ کی آمد کی بشارت کے بعد ظہور موسیٰ کو خدا نے کلمہ کہا چنانچہ فرمایا :۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ (سورۂ اعراف)

(۲) کلمہ کا اطلاق چونکہ کلام پر بھی ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد ہے ارادۂ خداوندی کا مظہر۔ کیونکہ ملفوظی کلام سے اس کی ذات پاک و منزہ ہے پس جسطرح عالم وجود میں ہر موجود کی ہر ادا وجود خالق کی دلیل اور اس کی توحید کے اثبات کے لئے ناقابل تردید برہان ہے گویا ہر شے زبان بے زبانی سے اس کی تخلیق اور صنعت و حکمت کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے اس کا کلمہ و کلام ہے چونکہ بنی اسرائیل نے تورات میں تحریف کر کے اس کے مطالب و مضامین کو بدل ڈالا تھا اور حضرت عیسےٰ خدا کی جانب سے اصل مراد خداوندی کے ترجمان تھے چنانچہ اُن کا اپنا ارشاد ہے کہ میں بعض وہ چیزیں بیان کرنے کے لئے آیا ہوں جن میں تمہیں اختلاف ہے۔ پس اسی بناء پر اُن کو کلمہ کہا گیا۔

(۳) کلمہ سے مراد بشارت کا مفہوم ہے یعنی عیسٰی کا حمل اور اس کی ولادت وغیرہ کی پیشین گوئی۔ معنی یہ ہوگا۔ کہ خدا تجھے بشارت دیتا ہے کہ تجھے بغیر شوہر کے حمل ہوگا اور تجھ سے ایک بچہ پیدا ہوگا۔ جس کا نام مسیح عیسےٰ بن مریمؑ ہوگا۔

(۴) کلمہ سے مراد کلمۃ الایجاد ہے اور حضرت عیسےٰ خود کلمہ ایجاد خداوندی تھے یعنی یہ خود کلمہ کُن کے مصداق تھے۔ اگرچہ تمام افراد انسانی تکوینی طور پر کُن سے عالم وجود میں آئے ہیں لیکن باقی افراد انسان کی پیدائش چونکہ اسباب و علل ظاہریہ کے ماتحت ماں اور باپ دونو کے ذریعے سے ہوئی اور حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق اسباب عادیہ کی وساطت کے بغیر صرف کلمۂ تکوین سے ہوئی۔ گویا وجود عیسٰےؑ بعینہٖ کلمہ کُن کا مصداق تھا چنانچہ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ (سورۂ اعراف)

اور یہی توجیہ تمام توجیہات سے بہتر ہے اور پہلی ہر سہ توجیہات پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے مثلاً پہلی توجیہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اولاً تو سابق انبیاء کی طرف سے حضرت عیسےٰ کے متعلق پیشین گوئیاں قرآن مجید میں ثابت نہیں اور ثانیاً اگر ثابت ہوں بھی تاہم حضرت عیسےٰ کو اس بناء پر کلمہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بعد میں صاف طور پر ہے اسْمُهُ الْمَسِيحُ

اور اُن کی پیشین گوئی ظہور عیسےٰؑ ہے نہ کہ خود عیسےٰ یعنی اُن کا کلمہ تھا ظہور عیسےٰ کی پیشین گوئی اور خود عیسےٰؑ ان کا کلمہ نہ تھا۔ تاکہ کہا جائے کہ اس کا نام مسیح ہے الخ اور بعینہٖ تیسری توجیہہ پر بھی یہی ایراد وارد کیا جا سکتا ہے کہ کلمہ سے مراد بشارت ہو۔ تو اِسْمُهُ الْمَسِيحُ اس کی تائید نہیں کرتا۔ اور دوسری توجیہہ تصحیح معنی کے لئے خوب ہے لیکن کوئی دوسرا قرینہ اس کی تائید نہیں کرتا

اِسْمُهُ الْمَسِيحُ :۔ بروزن فعیل بمعنی مفعول یعنی مسح شدہ اور مسح کا معنی ہے پونچھنا۔ پس حضرت عیسےٰؑ کو مسیح کہنے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ان کو مسیح اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کے وجود اطہر پر یمن و برکت اور خیر و خوبی کا مسح کیا گیا۔

(۲) چونکہ ان کے وجود کو گناہوں کی آلائش سے پونچھ اور دھو دیا گیا اس لئے ان کو مسیح کا لقب دیا گیا۔

(۳) کہتے ہیں کہ انبیاء زیتون کے تیل سے مالش کرتے تھے اور حضرت عیسےٰؑ کو بھی وہی مالش کی گئی اسی وجہ سے ان کو مسیح کہا گیا۔

(۴) بوقت ولادت ان کو جبریل نے اپنے پروں سے مسح کیا تھا۔ تاکہ ان کے لئے باعث تعویز ہو۔

(۵) چونکہ وہ یتیموں کے سر پر دست شفقت پھیرتے تھے۔ بنا بریں ان کو مسیح کہا گیا۔ لیکن اس صورت میں مسیح بمعنی ماسح صیغہ اسم فاعل ہوگا۔

(۶) چونکہ نابینا کی آنکھ پر ہاتھ پھیر کر اس کو بینا کر دیتے تھے یا یہ کہ ہر صاحب آفت پر مسح کر کے ان کو تندرست کر دیتے تھے اس لئے ان کو مسیح کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی صیغہ اسم فاعل کا ہوگا۔

(۷) **مشیحا** کا معرب ہے کہتے ہیں بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ جب ان کے بادشاہ کا جشن تاجپوشی منعقد ہوا کرتا تھا۔ اور بادشاہ عنانِ حکومت کو سنبھالتا تھا تو کاہن لوگ کتاب مقدس سے اس کے جسم کو مسح کرتے تھے تاکہ اس کے نظام ملک کے لئے باعث برکت ہو۔ پس وہ اس کو مشیحا کہا کرتے تھے جس کا معنی بادشاہ۔ یا مبارک ہوتا تھا۔

عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ۔ اس کی اصل یشوع بتلائی گئی ہے اور اس کا معنی نجات اور چھٹکارا دلانے والا اور بعض احادیث میں اس کا معنی يَعِيشُ ہے اور حضرت یحیٰؑ کے نام سے مناسبت تو اسی معنی کے لحاظ سے ہوتی ہے اور باوجودیکہ بشارت کا خطاب حضرت مریمؑ سے ہے لیکن کہا جا رہا ہے کہ تیرا بچہ پیدا ہوگا جس کا نام عیسےٰ ابن مریمؑ ہوگا۔ حالانکہ اس مقام پر ابن مریم کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بات ہی مریم سے ہو رہی ہے۔ پس اس سے مقصد صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ حضرت عیسےٰ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے اسی بنا پر تو ہر دو عالمین کے لئے آیت قرار دیا گیا۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا۔ کہولت جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کے زمانہ کو کہا جاتا ہے۔ پس کہل وہ ہوگا جس کے بالوں میں سفیدی داخل ہو رہی ہو اور بعضوں نے اس کی حد چونتیس ۳۴ سال بیان کی ہے۔

سوال :۔ کہولت کے زمانہ میں ہر شخص بولا کرتا ہے البتہ گہوارے میں آرام کرنے والے بچے کا بولنا خلاف عادت ہے پس اس

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ

عرض کی اے میرے پروردگار کیسے (پیدا) ہوگا میرا بچہ۔ حالانکہ مجھے مس تک نہیں کیا کسی انسان نے کہا (فرشتے نے) اسی طرح

اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

اللہ پیدا کرتا ہے جسے چاہے جب وہ کسی امر کے ہونے کا فیصلہ کرے تو بجز اُسکے نہیں کہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾

اور اس کو علم دے گا کتاب اور حکمت و تورات اور انجیل کا

بشارت میں گہوارے میں کلام کرنے کے ساتھ کہولت میں کلام کرنے کی صفت کی کیا خصوصیت ہے؟

جواب:۔ حضرت مریم کی خوشنودی کا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ وہ آج ہی سے ذہن نشین کرلے کہ میرا بن باپ کے پیدا ہونے والا بچہ بچپنے میں مر نہ جائے گا۔ بلکہ طویل عمر پائے گا اور کہولت کا زمانہ بھی اس کو نصیب ہوگا۔

سوال:۔ نصرانیوں کی موجودہ انجیلوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسٰےؑ دنیا میں کل تینتیس ۳۳ برس رہے اور اس کے بعد اٹھا لئے گئے پس انہوں نے کہولت کے زمانہ میں کلام کیسے کیا؟ اور کلام اللہ کی تصدیق کیسے ہوئی؟

جواب:۔ انجیلوں پر تحریف کے وقوع کی وجہ سے اعتماد نہیں کیا جاسکتا؟ اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے حضرت عیسٰے دنیا میں تقریباً چونسٹھ سال رہے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ کہولت کے زمانہ میں کلام کرنے سے مراد ہے ان کا حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ کے زمانِ ظہور میں آسمان سے اتر کر کلام کرنا۔ (تفسیر میزان)

قَالَتْ رَبِّ:۔ فرزند کی بشارت کا خطاب اگرچہ فرشتوں سے یا رُوح سے سُنا تھا۔ لیکن مریمؑ کو علم تھا کہ یہ خطاب اللہ کی جانب سے ہی ہے اور باپ کے بغیر اولاد کا ہونا چونکہ ظاہری طور پر ایک نادر فی امر تھا اس لئے مقامِ استعجاب میں کلام کا رُخ پروردگار کی طرف کرتے ہوئے عرض گذار ہوئی۔ کہ میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا؟ حالانکہ میری تاحال شادی نہیں ہوئی اور نہ مجھے کسی انسان نے مَس کیا ہے؟ تو فوراً جواب ملا۔ کَذٰلِکِ۔ بچہ ایسے ہی پیدا ہوگا۔ یعنی مریمؑ کے ذہن میں اگر شادی کا احتمال ہو تو اس کلمہ سے رفع کر دیا۔ کہ خدا ایسے ہی بغیر شادی کے اور بغیر مرد کے ہی تجھے بچہ عطا کرے گا۔ اور چونکہ حضرت مریمؑ کے استعجاب سے ایک صورتِ انکاری کا شائبہ تھا اور علل و اسباب کی دنیا کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بغیر مرد کے عورت کا بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ پس اس انکار کا جواب اس طرح دیا۔ اَللّٰهُ يَخْلُقُ الخ۔ خدا جسے چاہے پیدا کرسکتا ہے اور اس کی قدرت اسباب کی محتاج نہیں بلکہ وہ جب حتمی ارادہ کسی شے کے کرنے کا فرما لیتا ہے تو وہ شی ہو جاتی ہے۔ نیز لفظ کُن ہماری تفہیم کے لئے ہے ورنہ خدا تخلیق میں کسی لفظ کا محتاج نہیں پس یہاں مراد یہ ہے کہ خدا کے ارادہ اور فعل میں ذرہ بھر بھی زمان کا فاصلہ

نہیں ہوتا بلکہ ادھر اس کا ارادہ ہوتا ہے اُدھر چیز ہو جاتی ہے جس طرح کہنے والا کُن کہے اور شئے ہو جائے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ ۔ کتاب اور حکمت پر جو لام داخل ہے، جنس کا ہے، کتاب سے مراد یہاں مطلق وحی اور حکمت سے مراد مطلق معرفت جو عمل و اعتقاد سے متعلق ہو پس تورات و انجیل کا عطف، عطف خاص بر عام ہے۔

التَّوْرَاةَ ۔ اس سے مراد وہ کتاب ہے جو حضرت موسےٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور یہودی خود معترف ہیں کہ بخت نصر کے بعد تورات کی سند محفوظ نہیں رہ سکی۔ لیکن بایں ہمہ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ یہودیوں کے پاس موجودہ تورات جو زمانِ رسالت میں تھی۔ اصلی تورات سے بالکل الگ نہیں۔ اگرچہ تحریف سے بھی خالی نہیں۔

وَالْإِنْجِيلَ ۔ اس کا معنی ہے بشارت۔ لفظ کا واحد ہونا بتلاتا ہے کہ حضرت عیسےٰ پر انجیل صرف ایک اُتری تھی اور زمانِ رسالت میں موجودہ چار انجیلیں جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں وہ بعد کی تصنیف شدہ ہیں۔

نبی اور رسول میں فرق

وَرَسُولًا الخ رسول اور نبی میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو صاحبِ کتاب و شریعت ہو اور نبی وہ ہے جو تبلیغ احکامِ خداوندی پر مامور ہو۔ خواہ صاحبِ کتاب ہو یا نہ ہو۔

بنا بریں عہدۂ رسالت کو نبوت سے خاص و عام مطلق کی نسبت ہے اور صاحبِ میزان نے یہ بیان کیا ہے کہ نبوت اور رسالت دو جدا جدا منصب ہیں نہ ان کا یکجا ہونا ضروری ہے اور نہ ان کا الگ الگ رہنا لازمی ہے یعنی ہو سکتا ہے۔ کہ ایک شخص نبی ہو اور رسول نہ ہو اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول ہو اور نبی نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی بھی ہو اور رسول بھی۔ پس ان دونوں کے درمیان نسبت عام وخاص من وجہ کی ہوگی۔

نبوت :۔ احکامِ الہیہ کی عمومی تبلیغ کا عہدہ ہے اور رسالت ایک خصوصی سفارت کا منصب ہے کہ اس کا رد کرنا ہلاکت کا موجب ہو اور قبول کر لینا نعمت و رحمت کا باعث ہو۔ یعنی نبی وہ انسان ہے جو لوگوں پر دینِ خدا کی ترجمانی کے لئے مبعوث ہو اور رسول وہ انسان ہے جو بعض ایسے خصوصی احکام کے لئے مبعوث ہو جن کی تردید عذابِ الٰہی کا پیغام اور قبولِ انعام خداوندی کا مژدہ ہو۔ اور قرآن مجید میں انبیاء کے قصص سے رسالت کا مفہوم یہی کچھ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ اور شعیب وغیرہ جس قدر رسول بن کر آئے اُن کے واقعات اس معنی کے شاہد ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

پس ضروری نہیں کہ جو شخص ایک قوم کی طرف رسولؑ ہو وہ اس قوم کا نبی بھی ہو۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک قوم کے لئے رسول بھی ہو۔ اور نبی بھی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی نبوت عامہ ہو یعنی بہت سی قوموں کے لئے ہو لیکن رسالت اس کی صرف ایک یا بعض اقوام کے لئے محدود ہو۔ جیسے کہ حضرت موسےٰ اور حضرت عیسےٰ علیہما السلام یہ دونو نبی نبوتِ عامہ کے عہدہ دار تھے لیکن رسالت ان کی صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی اور قرآن مجید میں اس معنی کی تائیدات کافی موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ فرعون کی طرف رسول تھے لیکن جادوگر ایمان لائے اور ان کا ایمان مقبول بھی ہوا۔ حالانکہ بنی اسرائیل

وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۙ

اور اسے رسول بنا کر بھیجے گا طرف بنی اسرائیل کے (کہ کہے گا) میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے

اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـئَةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ

میں بناتا ہوں تمہارے سامنے مٹی سے ایک پرندے کا ڈھانچہ پس اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے

طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡىِ الۡمَوۡتٰى

پرندہ ہو جائے گا اور تندرست کرتا ہوں نابینا اور مبروص کو زندہ کرتا ہوں مردوں کو

بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ‌ؕ

باذن خدا اور تمہیں خبر دے سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ ذخیرہ بناتے ہو اپنے گھروں میں

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۙ‏ ﴿۴۹﴾

تحقیق اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو

سے نہ تھے۔ اسی طرح حضرت عیسےٰ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے حالانکہ ان پر ایمان لانے والے بہت سے لوگ مثلاً حبشہ، نجران اور روم وغیرہ بنی اسرائیل سے نہ تھے اور قرآن مجید میں نصاریٰ کا جہاں بھی ذکر ہوا ہے خواہ مدح کی صورت میں یا مذمت کی صورت میں صرف بنی اسرائیل کے نصاریٰ کے لئے اس کا اختصاص نہیں بلکہ تمام دین نصاریٰ رکھنے والوں کو شامل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت موسےٰ اور حضرت عیسےٰ ہر دو کی رسالت اگرچہ محدود تھی۔ لیکن ان کی نبوت پوری دنیا کیلئے تھی۔

اَخۡلُقُ لَـكُمۡ - روایات آئمہ علیہم السلام میں ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے جو پرندہ بنا کر اس میں نفخ روح کیا تھا۔ وہ چمگادڑ تھا۔ جیسا کہ بحار الانوار میں صادقین علیہما السلام سے منقول ہے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے احیاء موتیٰ اور خلق طیر چونکہ ایسے معجزے تھے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کے گمراہ ہونے کا ڈر تھا اس لئے ان کے ذکر کے بعد فوراً بِاِذۡنِ اللّٰهِ کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ لوگ حضرت عیسےٰ کو خدا مان کر مشرک نہ ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ یہ کام صرف اللہ ہی کر سکتا ہے یا کروا سکتا ہے

وَاُنَبِّئُكُمۡ ۔ بروایت تفسیر قمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت عیسےٰ بنی اسرائیل کو فرماتے تھے: میں اللہ کا رسول ہوں۔ مٹی سے پرندے کا بوتہ بنا کر اس میں پھونکتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا ہے اور نابینا و مبروص کو شفایاب بھی کر سکتا ہوں تو اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ یہ سب کچھ ہمیں تو جادو معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی ایسی چیز دکھائیے جس سے ہم مان جائیں کہ آپ سچے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ اگر میں تمہیں یہ بتلا دوں کہ تم نے کیا کھایا اور کیا بچا کر گھر میں

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ

اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو میرے سامنے ہے تورات سے اور تاکہ حلال کروں تمہارے لئے بعض چیزیں

الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾

جو تم پر حرام کردی گئی ہیں اور لایا ہوں میں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

تحقیق اللہ میرا اور تمہارا رب ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ یہ سیدھا راستہ ہے

ذخیرہ کیا تو پھر میری صداقت مان لوگے؟ کہنے لگے "جی ہاں" تو تب آپ فرماتے تھے کہ تو نے فلاں فلاں چیز کھائی ہے فلاں چیز پی ہے اور فلاں چیز جمع کی ہے پس بعض لوگ تسلیم کرتے ہوئے ایمان لاتے تھے لیکن بعض پھر بھی راہِ کفر اختیار کر لیتے تھے۔

وَاُحْيِ الْمَوْتٰى۔ حضرت عیسٰےؑ کے اصحاب نے آپ سے مردہ کے زندہ کرنے کی درخواست کی تو آپ حضرت سام بن نوح کی قبر پر تشریف لائے اور فرمایا:۔ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ پس قبر شگافتہ ہوئی اور پھر وہی کلمہ فرمایا تو مردہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر سہ بارہ فرمایا تو سام بن نوح باہر آگئے۔ آپ نے فرمایا کہ رہنا چاہتے ہو یا واپس جانا چاہتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا۔ اے رُوح اللہ میں واپس جانا چاہتا ہوں کیونکہ موت کی سوزش اور تکلیف اس وقت تک میرے اندر موجود ہے۔

ایک شخص سے حضرت عیسٰےؑ کی بڑی محبت تھی اور آپ اکثر اس کے ہاں جایا کرتے تھے ایک مرتبہ آپ کافی عرصہ کے بعد جب اس کو ملنے گئے تو اس کی ماں نے آپ کا سلام کیا۔ آپ نے اپنے دوست کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ مر چکا ہے آپ نے فرمایا کہ تو اُسے زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو اُس نے جواب دیا۔ ہاں۔ آپ نے کل کا وعدہ کیا اور چلے گئے۔ دوسرے روز اس کی ماں کو ساتھ لے کر اس کی قبر پر پہنچے اور دعا مانگی۔ پس وہ زندہ ہوا اور ماں بیٹا رو رو کر ایک دوسرے کے گلے ملے۔ پس حضرت عیسٰےؑ نے اس سے پوچھا:۔ کہ کیا تو اپنی ماں کے پاس دنیا میں زندہ رہنا چاہتا ہے؟ اُس نے عرض کی۔ جی ہاں! پس آپ نے اسے اپنی ماں کے حوالہ کیا اور وہ بیس برس زندہ رہا۔ اس نے شادی بھی کی۔ اور اولاد بھی ہوئی۔ (البرہان)

وَمُصَدِّقًا:۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عیسٰےؑ تورات کے مصدّق تھے لیکن وہ تورات جو دراصل حضرت موسٰےؑ پر نازل ہوئی تھی نہ کہ یہ تورات جس کو تحریف کے ظالم ہاتھوں نے اپنے اصلی مقام سے ہٹا دیا اور نیز اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ حضرت عیسٰے علیہ السّلام تورات کے غیر محرّف ہونے کی تصدیق فرمانے والے تھے جس طرح کہ قرآن مجید تورات و انجیل ہر دو کا مصدق ہے لیکن تورات و انجیل اصلی کا نہ:۔ کہ موجودہ تورات و انجیل کے غیر محرف ہونے کا مصدق ہے۔

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ:۔ یہودیوں کی سرکشیوں کی وجہ سے جو چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ انہی کی تحلیل کے متعلق ارشاد ہے اس کلام سے

فَلَمَّا اَحَسَّ عِيسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ

پس جب محسوس کیا (حضرت) عیسٰے نے اُن سے کفر۔ فرمایا میرے انصار کون ہوں گے طرف اللہ کے ؟ تو حواریوں

الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

نے جواب دیا۔ کہ ہم اللہ کے انصار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہوں کہ ہم مسلمان ہیں

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمائی اور اطاعت قبول کی رسول کی پس ہمیں درج فرما

مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع

شہادت دینے والوں کے ساتھ اور انہوں نے تدبیر کی اور خدا نے بھی تدبیر کی اور خدا اچھی تدبیر کرنے والا ہے

صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰے تورات کے احکام کے امضا کرنے والے تھے صرف بعض احکام شاقہ کے ناسخ تھے پس مقصد یہ ہُوا۔ کہ میں تورات کے اوامر و نواہی کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ البتہ بعض وہ احکام جن کی حرمت تم پر لازم کر دی گئی تھی۔ ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ حلیّت کا حکم لایا ہوں

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ :- چونکہ اس سے پہلے احیاء موتیٰ اور خلق طیر وغیرہ کا ذکر تھا۔ مبادا لوگ ان باتوں کو دیکھ کر خُدا نہ کہہ دیں لہذا حضرت عیسٰے نے اپنے مذکورہ ادعا کے بعد اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی عبادت کا حکم دے دیا۔ اور اسی کو صراطِ مستقیم سے تعبیر فرما دیا۔ گویا حضرت عیسٰےؑ کو بذریعہ وحی علم تھا کہ لوگ ایسا کہیں گے لہذا پہلے سے ہی ان کے عذر کو ختم کر دیا اور حجت تمام کر دی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت عیسٰے علیہما السلام کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ تھا اور انجیل میں صرف پند و نصائح تھے اور حضرت موسٰی علیہ السلام کی شریعت میں جو باتیں شاق تھیں اس میں ان کی تخفیف تھی اس کے علاوہ انجیل میں قصاص، حدود، اور میراث وغیرہ کے احکام نہیں تھے (بلکہ یہ احکام وہی تھے جو تورات میں مندرج تھے۔)

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ الخ - چونکہ جب حضرت مریمؑ کو فرزند کی بشارت دی گئی تو اس میں حضرت عیسٰے علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات کا ذکر کر دیا گیا۔ لہذا یہاں تتمہ کے طور پر حضرت عیسٰے کے قصہ میں سے آخری جملہ کو ذکر فرما دیا تاکہ اختصار بھی رہے اور افادیت میں بھی کمی اور تشنگی باقی نہ ہو۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْ :- جب کوئی قائد کسی تحریک کو جاری کرتا ہے اور اس کے پرچار میں شب و روز کی محنت و کاوش کو عمل

میں لاتا ہے تو اسے اپنی تحریک کو جاری اور باقی رکھنے کے لئے ایک خصوصی گروہ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جن کے دل میں درد ہو اور جن پر اعتماد ہو کہ یہ لوگ اس کو آگے چلائیں گے چنانچہ دعوتِ اسلام میں بیعت عقبہ اور بیعت شجرہ اسی دینی تحریک کی ہمہ گیری کے لئے ایک منظم جماعت کی تشکیل کا پروگرام تھا۔ پس اسی قاعدہ کے ماتحت جب حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے اپنا تبلیغی پروگرام شروع کیا، معجزات دکھائے اور شب و روز اپنی انتھک کوششوں سے لوگوں کو کسی حد تک اپنی تحریک سے مانوس کر لیا اور دیکھا کہ بہت سے لوگ کچھ اعلانیہ اور کچھ خفیہ طور پر میری ان تبلیغی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور میری ایذاء رسانی پر تلے ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اپنے اس ناپاک ارادہ میں کامیاب ہو جائیں تو ایسا نہ ہو کہ میرے بعد ترویج دین کا سلسلہ بالکل ختم ہو جائے۔ لہٰذا انہوں نے ایک منظم جماعت کی تشکیل کا پروگرام مرتب فرمایا۔ اور منافق لوگوں کے اعمال و کردار سے بدنیتی اور کفر پر آمادگی کو بھانپ کر اپنے خصوصی انصار اور مخلص جان نثار علیحدہ معلوم کرنے کے لئے فرمایا:- مَنْ اَنْصَارِیْ یعنی کوئی ہے میرا ہمدرد جو میرے اس دین کی ترویج میں خلوص سے آگے بڑھنے والا ہو، تب حواریوں کی جماعت نے آپ کی آواز پر صدائے لبیک بلند کی۔

اَلْحَوَارِیُّوْنَ:- اصل اس کی حور ہے جس کا معنی سفیدی ہے لیکن اس کا استعمال کسی انسان کے خواص پر ہوتا ہے اور قرآن میں صرف حضرت عیسےٰ کے خواص پر اس لفظ کا استعمال ہے

وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ:- ان کے مکر و تدبیر سے مراد ہے۔ ایذاء رسانی کے درپے ہونا اور اللہ کے مکر و تدبیر سے مراد ہے حضرت عیسےٰ کو بچالینا۔ اور آسمان پر اٹھالینا اور یہ واضح رہے کہ نصاریٰ نجران کے مقابلہ میں حضرت عیسےٰ کے قصہ کی جس حد تک ضرورت تھی اتنا ہی بیان فرمایا۔ اسی لئے پورا قصہ نہیں دہرایا گیا۔

امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے حواریین کی وجہ تسمیہ دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ کہ لوگوں کے نزدیک تو ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ دھوبی تھے اور کپڑوں سے میل اتارتے تھے اس لئے ان کو حواری کہا جاتا ہے کیونکہ خُبز حوار سے مشتق ہے یعنی خالص سفید روٹی۔ اور ہمارے نزدیک ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ خود بھی گناہوں کی میل کچیل سے پاک تھے اور لوگوں کو بھی بذریعہ وعظ و نصیحت گناہوں کی میل سے بچاتے تھے۔

کتاب توحید میں آپ سے مروی ہے کہ ان کی تعداد بارہ تھی اور ان سب سے افضل و اعلم لوقا تھا۔

حیاتِ مسیح علیہ السلام

اِذْ قَالَ اللّٰہُ:- مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح موعود بننے کی شوق میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی موت کا اعلان کیا۔ جس طرح کہ حضرت عیسےٰ کے متعلق یہودیوں نے افواہ عام پھیلائی تھی کہ انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ قادیانی لوگ اپنے عقائد کے دعویٰ کو سچا ثابت کرنے کے لئے عام مسلمانوں کو قرآن کی ان آیات سے دھوکا میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن میں حضرت عیسےٰ کے متعلق توفی کی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اور ان کا معنی موت بیان کر کے مسیح موعود کا خطاب میرزائے قادیانی پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور عوام بیچارے اکثر ان کے پلندے میں آ کر دین سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ

جب فرمایا اللہ نے اے عیسےٰ تحقیق میں تجھے پورا لینے والا اور اپنی جانب اٹھانے والا اور تجھے نجات دینے والا ہوں

الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ

ان لوگوں سے جو کافر ہیں اور کرنیوالا ہوں تیرے تابعداروں کو بلند ان سے جو کافر ہیں قیامت تک

الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۵۵﴾

پھر میری جانب تم سب کی بازگشت ہوگی پس میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔

خداوند کریم نے اس آیت مجیدہ میں جہاں یہودیوں کے غلط پروپیگنڈے کی غیر مبہم الفاظ میں تردید کرتے ہوئے اُن کے مُنہ میں لگام دی ہے اسی طرح بعد میں اگر مسیحیت کا لباس اوڑھنے کے شیدائیوں کا بھی حیات مسیح کا اعلان فرما کر ناطقہ بند کر دیا ہے

بروایت اکمال حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت عیسےٰؑ کو خدا نے نور علم حکمت اور انبیائے سابقین کے علوم کے علاوہ انجیل بھی عطا فرما کر بیت المقدس میں بنی اسرائیل کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ آپ وہاں تینتیس برس مقیم رہے اور اس کے بعد یہودیوں نے اس کے ساتھ مکر کیا۔ اور خدا نے ان کو محفوظ کرتے ہوئے اپنی طرف اٹھا لیا (روایت میں تینتیس برس صرف تبلیغی عمر ہے نہ کہ کل عمر لہذا کہولت میں ان کے کلام کرنے سے متعارض نہیں۔)

بروایت تفسیر قمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت عیسےٰ نے اپنے بارہ حواریین کو اسی شام اپنے پاس طلب کیا۔ جس رات کو وہ اٹھائے جانے والے تھے پس وہ آئے اور آپ نے ان کو ایک کمرہ میں داخل کیا اور آپ زاویہ گھر میں جو تالاب تھا اس میں غوطہ لگا کر باہر نکلے اور بالوں کو پانی سے جھاڑتے ہوئے اُن کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے بذریعہ وحی اطلاع ہوئی ہے کہ خدا مجھے اپنی جانب اٹھانیوالا ہے اور یہودیوں کے شر سے مجھے نجات دینے والا ہے پس تم میں سے کون ہے جو یہ قربانی کرے کہ اس کو میری شبیہہ بنایا جائے تا کہ اس کو میری جگہ قتل اور پھانسی کی سزا دی جائے پس وہ میرے درجہ میں میرا شریک ہوگا۔ پس ایک جوان نے لبیک کہی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک آدمی قبل از صبح کافر ہو جائے گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔ دو فرقے افتراء پرداز جہنمی ہوں گے اور ایک فرقہ جو شمعون (وصی عیسےٰؑ) کا تابع ہوگا۔ جنتی ہوگا۔ اس کے بعد حضرت عیسےٰؑ ان کے دیکھتے ہی کمرہ کے ایک گوشہ سے بلند ہو کر ان کی نظروں سے چھپ گئے۔

اسی شب یہودی حضرت عیسےٰ کی تلاش میں آپہنچے اور انہوں نے دو آدمیوں کو پکڑ لیا۔ ایک وہ جوان جو اپنے آپ کو موت کے لئے پیش کر چکا تھا۔ پس اس کو قتل کر کے سُولی پر لٹکا دیا اور دوسرا کافر ہو گیا جس کے متعلق حضرت عیسےٰؑ نے صبح سے قبل کافر ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت عیسےٰؑ کی شبیہ اُس شخص پر ڈالی گئی جو یہودیوں کو حضرت عیسےٰ

فَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

پس وہ لوگ جو کافر ہیں تو ان کو عذاب دوں گا سخت دنیا اور آخرت میں

وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْھِمْ

اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال نیک کئے پس پورا دے گا

اُجُوْرَھُمْ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِکَ نَتْلُوْہُ عَلَیْکَ مِنَ الْاٰیٰتِ

ان کو اجر ان کا اور اللہ نہیں دوست رکھتا ظالموں کو یہ ہم تلاوت کرتے ہیں تیرے اوپر کتاب

وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ ﴿۵۸﴾

اور ذکرِ حکیم

کے گرفتار کرنے کے لئے لایا تھا۔

امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت عیسےٰ کو زمین سے زندہ اٹھایا گیا اور آسمان و زمین کے درمیان ان کی قبض رُوح (توفی) کی گئی پھر آسمان پر لے جانے کے بعد اُن کی رُوح واپس لوٹا دی گئی چنانچہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کا یہی مطلب ہے

موت اور وفات میں فرق سب سے پہلے وفات اور موت یا تَوَفِّیْ اور اِمَاتَہ کے معنی میں فرق سمجھنا ضروری ہے اور اس مسئلہ کا حل بھی اسی پر ہی موقوف ہے۔

تَوَفِّیْ۔ کا مادہ اشتقاق وفی وفاءٌ ہے اور اس کا معنی ہے پُورا دینا۔ مثلاً کہا جاتا ہے فلاں نے فلاں سے وفا کی یعنی اس کو اپنا حق پورا دے دیا یا اس کا حق پُورا ادا کر دیا اور تَوَفِّیْ کا معنی ہے پورا لے لینا۔ جیسا کہ اس کی مطاوعت کا تقاضا ہے جس طرح کہا جائے۔ وَفَاہُ فَتَوَفّٰی۔ یعنی اس نے اس کو پورا حق دے دیا۔ پس اُس نے پُورا لے لیا۔

اِمَاتَہ موت سے اور اِحْیَاء حیات سے ہے اور موت و حیات میں تقابل ہے پس موت کا معنی ہے۔ عدم الحیات (زندگی کا سلب ہونا) قرآن مجید میں تَوَفِّیْ اور موت ہر دو لفظیں استعمال کی گئی ہیں لیکن اُن کے محل استعمال میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معانی الگ الگ ہیں اور تَوَفِّیْ کا معنی موت سے عام ہے کیونکہ اس کا معنی ہے پورا لے لینا اور موت میں بھی چونکہ نفس انسانی کو خدا اس کے بدن سے پُوری طرح نکال لیتا ہے۔ اس لئے موت پر بھی تَوَفِّیْ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جس طرح انہی مناسبات و خصوصیات کی بناء پر ارتحال اور قضا کی لفظیں بھی موت کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔ حالانکہ معنی کے لحاظ سے اس سے عام ہیں اور ہماری زبان میں بھی یہ استعمال بعینہٖ موجود ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔ فلاں

کی موت آگئی، قضا آگئی، اجل آگئی۔ پوری ہوگئی، ختم ہوگئی، لیکن ان استعمالات سے ہرگز یہ دھوکا نہیں کھایا جاسکتا۔ کہ قضاء اجل پوری، رحلت اور ختم وغیرہ کی لفظیں جہاں بھی استعمال ہوں گی ان سے مراد موت لی جائے گی۔ اب قرآن مجید میں تَوَفِّی کے استعمالات ملاحظہ فرمائیے:۔

تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (سورۃ انعام) ہمارے فرستادہ (ملائکہ) اس کو پورا لے لیتے ہیں یعنی اس کی روح کو قبضہ میں کر لیتے ہیں اور ملائکہ کے روح کو قبضہ میں لینے سے چونکہ قوائے جسم سے حیات رخصت ہو جاتی ہے۔ بنا بریں اسے موت کی جگہ پر استعمال کیا گیا:۔ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سورۃ سجدہ) تمہیں پوری طرح لے لیتا ہے یعنی تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے وہ موت کا فرشتہ جو تمہارے اوپر وکیل ہے تَوَفِّی کو موت سے کنایہ کیا گیا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى (سورۃ زمر) اللہ پوری طرح لے لیتا ہے (محفوظ کر لیتا ہے) نفسوں کو جن کی موت آچکی ہے اور جن کو موت نہیں آئی (نیند میں) پس اپنے پاس روک لیتا ہے اُن کو جن کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اور دوسروں کو چھوڑ دیتا ہے اس آیت میں صاف ظاہر ہے کہ تَوَفِّی موت سے عام ہے یعنی بوقت نیند تمام نفسوں کی وفات ہو جاتی ہے یعنی تمام نفسوں کو قبض کر لیا جاتا ہے اور محفوظ کر لیا جاتا ہے پس جن کی موت آچکی ہو اُن کو روک لیا جاتا ہے اور جن کی اجل باقی ہو ان کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تَوَفِّی کو قرآن مجید میں جس مقام پر موت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے وہاں اسی پورا لینے اور محفوظ کرنے کے معنی کو ملحوظ رکھ کر کنایہ موت سے کیا گیا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ اس جگہ موت کا معنی بالکل فنا اور باطل ہو جانا نہیں ہے بلکہ اللہ اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے اور جب چاہے اُسے واپس بھی بھیج سکتا ہے۔ بہر کیف جہاں بھی قرآن میں توفّی کا معنی موت لیا گیا ہے وہ صرف کنایہ ہے کیونکہ موت میں بھی نفس کو پورا لے لیا جاتا ہے اور توفّی کا معنی بھی یہی ہے ورنہ درحقیقت توفّی کا مفہوم موت سے عام ہے۔

پس اس مقام پر ترجمہ آیت یہ ہے کہ ارشادِ قدرت ہوا:۔ اے عیسےٰ میں تجھے پورا لینے والا اور محفوظ کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور تجھے کافر لوگوں سے پاک و منزہ کرنے والا ہوں۔ یعنی نجات دینے والا ہوں اور یہودیوں کے ادعاءِ قتل کو دوسرے مقام پر اس طرح رد فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ ترجمہ:۔ ان کا کہنا کہ ہم نے مسیح عیسےٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا۔ حالانکہ نہ انہوں نے اس کو قتل کیا ہے۔ نہ سولی چڑھایا ہے لیکن ان کو شبہ دیا گیا اور وہ لوگ جو اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں ان کو اشتباہ ہے ان کے پاس کوئی علمی خبر نہیں سوائے اطاعت ظن کے اور یقیناً انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کو خدا نے اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور اللہ عزیز و حکیم ہے اور کوئی اہل کتاب نہیں جو اس کی موت سے قبل اس پر ایمان نہ لائے اور وہ بروزِ قیامت ان پر گواہ ہوگا (سورۃ نساء)

پس قرآن مجید واضح اور غیر مبہم الفاظ میں حیاتِ حضرت مسیح کا اعلان کر رہا ہے اور جو لوگ اُن کی موت کا ڈھنڈورا

پیٹتے ہیں وہ صرف اپنے مسیح موعود ہونے کے دعوے کی تصدیق کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں اور عوام جہلاء کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قرآن مجید کے بعض الفاظ کو اپنے استشہاد میں لاتے ہیں۔ خداوند کریم جملہ مومنین کو ان کی تسویلات باطلہ و تاویلات عاطلہ کی گرفت سے محفوظ و مصون فرمادے۔

موت مسیح ثابت کرنے کے لئے یہ لوگ کشمیر میں ایک مفروضہ قبر پیش کر کے جہلا کو اس دھوکا میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی حضرت عیسےٰ کی قبر ہے جو یہودیوں کے ڈر سے یہاں بھاگ آئے تھے اور پھر اسی جگہ دفن ہوئے حالانکہ یہ صرف فرضی افسانہ اور من گھڑت ترشی نزشائی ہوئی بے بنیاد اور بے سروپا داستان ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں اور مدعی مسیحیت کے دعویٰ کی تکذیب کے لئے یہی کافی ہے کہ دنیا بھر کے اہل کتاب اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان لانا تو درکنار اس کو جانتے تک نہ تھے کہ یہ کس باغ کی مُولی ہے۔ ہاں بعض شاذ و نادر افراد سے اس کے راہ و رسم اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ کے استغراقی مفہوم کی خانہ پُری نہیں کر سکتے پس معلوم ہوا کہ وہ مسیح جس کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب اس پر ایمان لائیں گے وہ ابھی زندہ موجود ہیں اور وہ حضرت مہدی علیہ السلام کی معیت میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور ان کی تشریف آوری کے بعد آیت مذکورہ کی عملی تصدیق ہوگی اور خدا کا وعدہ سچا ثابت ہو کر رہے گا۔

وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ :- خداوند کریم نے حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ میں تیرے تابعداروں کو کافروں پر فوقیت دوں گا قیامت تک کے لئے۔ اور تابعدارانِ حضرت عیسےٰ جناب رسالتمآبؐ کی اطاعت کا حکم دے گئے تھے پس مطلب یہ ہوا کہ قبل از بعثت کے اطاعت گذار عیسائی اور بعد بعثت کے اطاعت گذار مسلمان کافر لوگوں پر قیامت تک فوقیت رکھنے والے ہوں گے اور فوقیت سے مراد نہ ملکی و سیاسی فوقیت بلکہ روحانی و علمی بلندی ہے۔ لیکن یہ توجیہ دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

اوّلاً تو خداوند کریم یہودیوں کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں فرما رہا ہے کہ تجھے محفوظ کر کے اپنی طرف اٹھاؤں گا اور تیرے اطاعت گذاروں کو غلبہ عطا کروں گا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عیسےٰ کو بالفعل یہودیوں سے مغلوب ہونے کی وجہ سے جو کوفت و تکلیف تھی اس کے بدلہ میں خدا ان کے اطاعت گزاروں کے غلبہ کی خوشخبری سے اُن کی تالیف خاطر فرما رہا ہے تاکہ ان کا رنج خوشی سے اور غم سرور سے متبدل ہو جائے تو حضرت عیسےٰ کی مغلوبیت جس نوع کی ہوگی یہ غلبہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔ جس کی بشارت دی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسےٰ کی مغلوبیت روحانی و علمی قسم کی نہ تھی بلکہ اس حیثیت سے تو وہ یقیناً غالب تھے تو یقیناً ان کی مغلوبیت یہی ظاہری قسم کی تھی جو قوت و طاقت کے فقدان کا نتیجہ ہوا کرتی ہے لہٰذا ان کی تالیف قلبی و تسکین خاطر کے طور پر ان کے اطاعت گذاروں کے روحانی و علمی تفوق کی خوشخبری سُنانا بے محل اور بے معنی ہے۔

ثانیاً:- روحانی و علمی غلبہ یعنی دلیل و برہان کا تفوق ایک ایسی بلندی ہے جو ناقابلِ زوال ہے۔ پس تاقیامت کی قید لگانا

خلاف بلاغت ہے۔ پس بنابریں زیادہ موزوں و مناسب یہی ہے کہ اس فوقیت سے مراد سطوتِ ظاہری و سلطنت ملکی ہو۔
لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کے اطاعت گذار قبل از بعثت تو عیسائی لوگ تھے لیکن بعد از بعثت ان کے اطاعت گذاروں سے مراد مسلمان ہیں اور مسلمانوں کو بہ نسبت کفار کے تفوق ملکی کب حاصل ہے؟ بلکہ دیکھتے ہیں تو کفار کو بدرجہا تفوق و غلبہ حاصل ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے مراد یہودی ہیں اور اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ سے مراد نصاریٰ ہیں اور اگرچہ موجودہ نصاریٰ لوگ حضرت عیسےٰ کے صحیح اطاعت گذار نہیں ہیں لیکن چونکہ ان کے گذشتہ آباء جو بعثت سے پہلے تھے، حضرت عیسےٰ کی شریعت پر صحیح طور پر گامزن تھے اور یہ لوگ ان لوگوں کی اطاعت پر راضی ہیں بلکہ فخر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کو بھی اس خطاب میں متبعین عیسےٰ سے شمار کر لیا گیا جس طرح قوم یہود کو اپنے آباء کے افعال شنیعہ پر راضی ہونے کی وجہ سے مورد طعن و تشنیع قرار دیا گیا۔ پس آیت مجیدہ میں خوشخبری ہے حضرت عیسےٰؑ کو کہ ان کے تابعدار جو اپنے تئیں عیسائی کہلوانے والے ہوں گے ان کافر لوگوں پر تسلط و اقتدار کے مالک ہوں گے اور ان کا اقتدار تا قیامت رہے گا اور قوم یہود پر مغلوبیت کا عذاب دائمی رہے گا اور سب سے انسب یہی ہے کہ اس سے مراد زمانِ ظہور حضرت قائم لیا جائے کیونکہ ان کی معیّت میں حضرت عیسےٰ بھی دوبارہ اٹھیں گے پس ان کے اطاعت گذاروں کا بول بالا ہوگا اور پوری دنیا پر وہ اقتدار کے مالک ہوں گے واللہ اعلم۔
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ :- کتاب سے مراد مطلق وحی اور ذکر سے مراد قرآن اور حکیم بمعنی محکم اس کی صفت ہے۔ پس کتاب کے بعد ذکر حکیم تخصیص بعد تعمیم ہے۔

نصاریٰ نجران کے قول کی استدلالی تردید

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى صفحہ ۲۴۵ :- اس کے شانِ نزول کے متعلق وارد ہے کہ وفد نجران کے دو معتمد آدمی جو ان کے پادری تھے ایک کا نام سیّد اور دوسرے کا نام عاقب تھا۔ وہ حضرت رسالتمآبؐ کے پاس آئے اور حضرت عیسےٰ کے متعلق بحث کا آغاز ہوا تو اُن دونوں نے احتجاج کے طور پر یہ بات کہی کہ ہر انسان کے لئے باپ ضروری ہوا کرتا ہے آپ عیسےٰؑ کے متعلق بتائیں کیونکہ ان کا باپ تو ہے نہیں (گویا وہ حضرت عیسےٰؑ کی الوہیت ثابت کرنا چاہتے تھے پس یہ آیت اُتری۔
اس بیان سے حضرت عیسےٰ کی الوہیّت کی نفی پر دو دلیلیں مستفاد ہوتی ہیں۔
(۱) حضرت عیسےٰ کو خدا نے خلق فرمایا ہے اور جو مخلوق ہو خواہ باپ کے بغیر ہی پیدا ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔
(۲) حضرت عیسےٰؑ کی شانِ خلقت حضرت آدم کی شان سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ یہ صرف باپ کے بغیر پیدا ہوئے اور حضرت آدم بغیر ماں باپ دونوں کے پیدا ہوئے تھے اگر باپ کے بغیر پیدا ہو جانا الوہیت کا موجب ہے تو اس بارہ میں حضرت آدمؑ کو فوقیت حاصل ہے پس اس کو بدرجہ اولیٰ خدا کہنا چاہیئے حالانکہ نصرانی اس کی خدائی کے قائل نہیں تو پس انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عیسےٰ کے متعلق بھی اس غلط رویہ کو ترک کر دیں۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ

تحقیق عیسٰے کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اس کو بھی پیدا کیا مٹی سے پھر فرمایا اس کو ہو جا

قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾

پس وہ ہو گیا حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک کرنے والوں سے نہ بنیں

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ

پس اگر جھگڑیں وہ اس بارے میں بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آ چکا ہے تو فرما دیجئے آؤ بلا لیں ہم اپنے

أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ۚ ثُمَّ

بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو ۔ ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفسوں کو اور تم اپنے نفسوں کو پھر

نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾

دعا مانگیں اور مقرر کریں اللہ کی لعنت جھوٹوں پر

كُنْ فَيَكُوْنُ :۔ ظاہر بیان کے لحاظ سے درست تو اس طرح ہوتا کہ کہا جاتا كُنْ فَكَانَ ۔ لیکن ظاہرًا اس کو حکایت حالِ ماضی قرار دیکر يَكُوْنُ استعمال کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ جب بھی کسی شئے کی ایجاد کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو اس کے ارشادِ كُنْ سے شئے فَيَكُوْنُ کی منزل تک پہنچ جاتی ہے پس حضرت آدم کو پیدا کرنے کے لئے بھی اُس نے ارشاد كُنْ کیا اور وہ فَيَكُوْنُ کی منزل تک پہنچ گیا۔

حضرت آدم کی مثال دے کر حضرت عیسٰے کی بغیر باپ کی پیدائش کے متعلق نصرانیوں کے شبہ کا حل کرنا مطلوب ہے کہ خالق حکیم کسی شئے کی تخلیق میں اسباب و علل اور مواد کا محتاج نہیں اور نہ مرورِ زمانہ اور تخلل وقت کا حاجت مند ہے جس طرح وہ آدم کو تدریجی طریق سے مستثنٰے قرار دے کر فوریت تکوینیہ سے خلق فرما سکتا ہے ور[illegible]ت عیسٰے کو بھی اس طرح پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا ہے پس عیسٰے اس کا بندہ ہے خدا نہیں۔

تفسیر آیت مباہلہ

جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۔حضرت عیسٰے کی الوہیت کی نفی کے لئے گذشتہ آیت بیان خداوندی ہونے کے علاوہ ایک ناقابل تردید برہان ساطع اور دلیل قاطع بھی تھی اسی لئے اس کو دوسری آیت میں علم سے تعبیر فرمایا ہے یعنی اگر وہ آیت نہ بھی ہوتی تب بھی اس کی برہانیت یقین و اطمینان کے لئے بذاتِ خود کافی تھی پس مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فرمایا اور مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّا نہیں فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ

تحقیق یہ (جو سابق میں عیسٰے کے متعلق ذکر ہوا) بیان حق ہے اور کوئی بھی معبود نہیں سوائے خدا کے اور تحقیق اللہ ہی غالب

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۲ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۳ ع

حکمت والا ہے پس اگر وہ رو گردانی کریں تو خدا فسادیوں کو جاننے والا ہے

فَقُلْ تَعَالَوْا۔ گویا حق کے اثبات کے لئے دو طریقے تھے۔ ایک دلیل و برہان کا اور دوسرا استجابت دعا کا چونکہ پہلا طریقہ استعمال کرنے کے بعد جب معلوم ہوا کہ وہ اپنے ضد پر اڑے ہوئے ہیں لہٰذا دوسرے طریقہ کی ان کو دعوت دی گئی اور وہ یہ کہ آپس میں مباہلہ کرلیں یعنی ایک دوسرے کے لئے ہلاکت کی اللہ سے دعا مانگیں پس جو جھوٹا ہوگا۔ ہلاک و برباد ہوگا۔ مباہلہ کا معنی ہے ایک دوسرے پر لعنت کرنا۔

تَعَالَوْا نَدْعُ۔ اصل مباہلہ میں طرفین سے ایک ایک آدمی کافی تھا لیکن اپنے دعویٰ پر انتہائی اطمینان و وثوق ثابت کرنے کے لئے ابناء۔ نساء۔ اور انفس کو دعائے ہلاکت میں شریک کیا گیا۔ کیونکہ انسان بعض اوقات اپنے ضد پر اڑ کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کی پرواہ نہیں کیا کرتا۔ لیکن بال بچوں اور اعزاء و اقرباء کو کسی صورت میں معرضِ ہلاکت میں ڈالنا پسند نہیں کرتا جیسا کہ فطری محبت کا تقاضا ہے اس آیت میں غور کرنے سے چند چیزیں بخوبی سمجھ میں آتی ہیں۔

(۱) آیت کا لب و لہجہ بتلاتا ہے کہ ابناء۔ نساء اور انفس سے مراد وہ نفوس ہیں جو اصل دعویٰ میں مدعی کے ساتھ شریک ہوں۔ صرف طرفین سے کثرت کی خاطر مزید بھرتی کر کے رطب و یابس کو جمع کر کے لانا مقصود نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ نصاریٰ کی طرف سے جو زن و مرد اس میں شرکت کرتے وہ صرف وہی ہو سکتے تھے جو بدل و جان حضرت عیسٰے کی الوہیت کے مدعی تھے تاکہ اس بارہ میں اپنی جانوں پر کھیل جانا آسان سمجھتے، ہاں کچے یقین اور مذبذب مزاج لوگوں کا مباہلہ میں قدم رکھنا قطعاً معقول نہیں تھا اور اس طرف سے جو زن و مرد نصاریٰ کے مقابلہ میں جائے وہ وہی ہونا چاہیئے جن کو حضرت عیسٰے کے عبد اور مخلوق خدا ہونے کا یقین کامل ہو اور رسالتمآبؐ کے ساتھ دعوے مذکورہ میں شریک ہو اور دعوت اسلام میں بھی ان کے ساتھ حصہ دار ہو ورنہ بزور شمشیر کلمۂ اسلام کو منہ پر جاری کرنے والوں کے ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ :۔

(۲) اطمینانِ قلب اور سکونِ خاطر کے بغیر مخلصانہ طور پر جھوٹے کے لئے ہلاکت کی دعا مانگنا نہایت مشکل ہے۔ ورنہ یہ خیال پیدا ہوگا کہ شاید میں خود جھوٹا ہوں تو پس کیسے دعا میں خلوص رہے گا۔ خلوص تب ہی ہو سکتا ہے جب اپنی طرف سے سو فیصدی یقین ہو نیز آیت کی ابتداء میں ہے کہ اگر وہ لوگ اس علمی گفتگو اور عقلی دلیل کو تسلیم نہ کریں تو مباہلہ کا طریق اختیار کرلو۔ یعنی مباہلہ میں ساتھ جانے والے افراد کا دلیل و برہان کی ناکامی کے بعد ساتھ لے جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح دلیل دعوے کو منوانے کے لئے تھی۔ یہ بھی اُسی دعوے کو منوانے کے لئے میدان میں اترے ہیں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ صرف وہی ہستیاں ہی ساتھ

جا سکتی تھیں جو دعوتِ اسلام میں اور دعویٰ عبدیت عیسےٰؑ میں جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ برابر کے شریک تھے چنانچہ آیت کے اختتام میں کَاذِبِیْنَ جمع کا صیغہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ رسولؐ کے ہمراہ جانے والے صَادِقِیْنَ تھے اگر دعوت نصاریٰ کے علمبردار اور مدعی صرف آپ ہی ہوتے اور ساتھ جانے والے افراد کی حیثیت گواہ کی سی ہوتی تو کَاذِبِیْنَ جمع نہ لایا گیا ہوتا کیونکہ نصاریٰ کی نگاہوں میں اگر معاذ اللہ کَاذِبِیْنَ تھے تو سب کے سب جانیوالے تھے اور خدا کے علم میں اگر صَادِقِیْنَ تھے تو بھی سب جانے والے تھے تو معلوم ہوا کہ نصاریٰ کی نظروں میں بھی یہ سب کے سب دعوت دہندہ اور مدعی عبدیت عیسےٰ تھے اور عند اللہ بھی یہ سارے جناب رسالتمآبؐ کے شریک کار تھے۔

(۲) اَبْنَآءَ۔ نِسَآءَ اور اَنْفُسَ یہ تینوں صیغے جمع ہیں اور مضاف بھی اور ظاہر ہے کہ جمع مضاف سے استغراق مستفاد ہوا کرتا ہے گویا معنی یہ ہوا کہ اپنے تمام بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کو لاؤ۔ لیکن چونکہ لانا صرف انہی کو تھا جو دعوتِ مذکورہ اور دعویٰ عبدیت عیسےٰ میں شریکِ رسول تھے تو مقصد یہ ہوا کہ تمام وہ بیٹے وہ عورتیں اور وہ نفس جو اس مدعا میں بحیثیت مدعی کے ہیں بلائے جائیں پس نظرِ انتخابِ رسالت میں اس معیار کے لحاظ سے بیٹوں میں سے سوائے حسنینؑ کے کوئی بچہ اس قابل نہ تھا اور عورتوں میں سے سوائے مخدومۂ کائنات خاتونِ جنت کے اور کوئی نہ تھی اور مردوں میں سے سوائے علیؑ کے اور کوئی نہ تھا۔

سوال:۔ رسولِ کریم کے دیگر جلیل القدر اور اکابر صحابہ جو اس وقت موجود تھے اسی طرح زوجاتِ محترمات بھی سب کے سب مذکورہ دعویٰ اور دعوت میں شریکِ رسولؐ تھے اور ان کو پورا پورا اطمینان حاصل تھا اور میدانِ مباہلہ میں جانے کے اہل تھے لیکن چونکہ وہاں صرف بطور نمونہ کے مختصر افراد کو لے جانا تھا۔ اس لئے جناب رسالتمآبؐ نے صرف حسنینؑ اور فاطمہؑ اور حضرت علیؑ کے لے جانے پر اکتفا کرلی۔

جواب:۔ ابناء، نساء والنفس کی اضافت جو مفید استغراق ہے نمونہ کے طور پر چند افراد کو ہمراہ لے جانے کے خلاف ہے اور اگر بالفعل استغراق نہ مانا جائے تب بھی جمع ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور نمونہ کے لئے بھی لے جانا تھا تو کم از کم اتنے افراد کا انتخاب ہر صنف سے ضروری تھا کہ اقل جمع تو صادق آسکتی پس اس صورت میں ابناء کے لئے تین اور نساء کے لئے بھی تین البتہ النفس کے لئے صرف ایک اور بڑھانا پڑتا کیونکہ آپ خود بنفسِ نفیس مل کر تین ہو جاتے پس اس طرح نہ ہونا صاف بتلاتا ہے کہ اس میدان میں سوائے ان ہستیوں کے جانے کا کوئی دوسرا اہل نہیں تھا؟

(۳) نصاریٰ نجران کی تفہیم کے لئے جب قرآن کی پیش کردہ دلیل و برہان کارگر نہ ہوئی تو میدانِ مباہلہ کی تشکیل دیتے ہوئے عترت طاہرہ کو پیغمبر کا ساتھ لے جا کر حق و باطل کے درمیان امتیازی نشان قائم کرنا تا قیامت امتِ اسلامیہ کے لئے دعوتِ فکر ہے کہ جس طرح نصرانیوں کے مقابلہ میں یہ لوگ رسولؐ کے شریکِ کار ہیں اور صرف قرآنی ادلہ پر اکتفا نہیں کی جا سکتی اسی طرح تا قیامت اہل اسلام کے لئے بھی ان کی قیادت ضروری ہے اور صرف کتاب اللہ سے تمسک پکڑ کر ان کو نظر انداز

کرنا یقیناً نادرست ہے۔

(۴) چونکہ قرآن مجید میں جہاں نساء کو ابناء کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد بیٹیاں ہیں۔ لہذا بعید نہیں کہ نساء سے مراد یہاں بیٹیاں ہوں۔ پس اس کی مصداق صرف خاتونِ جنت ہی ہوگی اور اگر نساء کے معنی میں تعمیم کی جائے۔ تو عورت کی تین اہم حیثیات میں سے خاتونِ جنت ہر طرح مصداق آیت ہے کیونکہ دعوت مباہلہ میں چار جانے والے مردوں میں سے دو کی ماں ہے اور ایک کی زوجہ ہے اور ایک کی دختر ہے کیونکہ نساء کا لفظ امرأۃ کی جمع ہے۔ خلافِ قیاس۔ اور اس کا معنی ہے عورت اور عورت کے لئے رشتہ کے اہم پہلو صرف یہی تین ہیں کہ زندگی میں قدم رکھتے ہی پہلے پہل بیٹی ہوتی ہے پھر زوجہ بنتی ہے اور پھر ماں بن جاتی ہے۔

(۵) ابناء جمع ہے ابن کی۔ اور آیت مجیدہ میں ابناء کو ہی مباہلہ میں شریک قرار دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا۔ کہ اصطلاح قرآن میں لڑکی کی اولاد کو بھی ابن کہنا مبنی بر حقیقت ہے پس حسنین شریفین جناب رسالتمآبؐ کے بفرمانِ قرآن فرزند ثابت ہوئے۔

(۶) انفس جمع ہے نفس کی، قرآنی الفاظ بتلاتے ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ کو اس میدان اور اس دعوت میں ان مردوں کو شریک کرنے کا حکم تھا۔ جن کی رسولؐ کے ساتھ یگانگت اور یک جہتی اس طرح ہو جس طرح جسم سے نفس کی نسبت ہوا کرتی ہے اور وہ شخص ہی ساتھ جانے کا اہل ہو سکتا تھا جو رسولؐ کے لئے بمنزلہ نفس کے ہو۔ پس اس آیت کی رُو سے علیؑ کا نفسِ رسولؐ ہونا ثابت ہوا اور جمع کے صیغہ سے خطاب کے باوجود صرف حضرت علیؑ کا انتخاب اس امر کی دلیل ہے کہ صحابۂ رسول میں سے جانثاری اور وفاشعاری کے لحاظ سے دوسرا کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا جس کو جناب رسالتمآبؐ اپنے نفس کی حیثیت سے مباہلہ میں لے جاتے پس یہی آیت حضرت علیؑ کی جملہ صحابہ بلکہ باقی تمام انبیاء سے بھی افضل ہونے کی نص صریح ہے کیونکہ نفس اور شے کا حکم ایک ہوا کرتا ہے تو جن لوگوں پر رسولؐ کی فضیلت ثابت ہوگی۔ انہی پر رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کی فضیلت بھی ثابت ہوگی اور اسی سے حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے اور جناب رسالتمآبؐ کا فرمانا۔ یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ جِسْمُکَ جِسْمِیْ ۔ دَمُکَ دَمِیْ رُوْحُکَ رُوْحِیْ لفظ قرآن اَنْفُسَنَا کی تفسیر ہے۔

(۷) آیتِ مجیدہ میں پہلے ابناءنا کا ذکر تھا۔ چنانچہ جناب رسالتمآبؐ نے بھی عمل کی صورت میں ان کو پہلے رکھا پس حضرت حسن کو انگلی سے اور حسینؑ کو گود میں اٹھالیا اور اس کے بعد آیت میں نساءنا کا ذکر تھا تو حضورؐ نے مقامِ عمل میں اپنے پیچھے خاتونِ جنت کو رکھا اور آیت میں آخر پر اَنْفُسَنَا کی لفظ تھی لہذا مقامِ عمل میں سب سے پیچھے حضرت علیؑ تھے اگرچہ اس ترتیب کے عمل میں لانے کا امر نہیں تھا۔ تاہم جناب رسالتمآبؐ نے ظاہری مفہوم سے واقعی مصداق کی ترتیب کو اپنے عمل سے اسطرح منطبق کر کے دکھایا کہ کبھی کوئی فرد آیت کے مصادیق کی تعیین و تطبیق میں ٹھوکر نہ کھانے پائے۔

(۸) جناب خاتونِ جنت کو درمیان میں رکھنے سے مقامِ عمل میں مخدومۂ کائنات کے پردہ کی اہمیت کو بھی واضح کرنے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے تاکہ اگر سامنے نصاریٰ نظر اٹھا کر اِدھر دیکھیں تو ان کے آگے رسالت کی نوری دیوار حائل ہو جائے

اور پیچھے سے مسلمان جاتے ہوئے دیکھیں تو اُن کے سامنے امامت کا پردہ آجائے اور عصمت مآب بی بی پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ سکے۔ حتیٰ کہ قدموں کے نشان بھی رسالت و امامت کے نقوشِ پا کے درمیان مستور ہو کر رہ جائیں۔

(۹) میدانِ مباہلہ میں اس طرف سے پانچوں بزرگواروں کا جانا اور مقابلہ میں نصاریٰ کا جزیہ منظور کرتے ہوئے مباہلہ سے ہٹ جانا اس امر کا کاشف ہے کہ پانچ ہستیوں کی صداقت کو وہ اُن کی پُر اطمینان روش اور ہمہ تن سکون پیش قدمی سے بھانپ گئے تھے اور مباہلہ کے بعد انہیں یقین تھا کہ اگر ایسا ہُوا تو موردِ عذاب ہو جائیں گے۔ پس انہوں نے جزیہ منظور کرنے کے عمل سے ان پانچوں کی صداقت کا اعتراف کر لیا اور قرآن کی آیت نے اس پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی۔

(۱۰) اس پورے واقعہ اور قرآنی فرمان میں تدبر کرنے سے انسان بخوبی و بآسانی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں آنے والے جھوٹے اور مستحقِ لعنت تھے اور قصہ کا تعلق اگرچہ صرف ایک واقعہ سے تھا۔ لیکن قرآن کا پورے اہتمام کے ساتھ ان کی صداقت اور ان کے مدِّمقابل کے جھوٹ کا اعلان کرنا اس امر کا کاشف ہے کہ اُن کی صداقت صرف اسی جزوی واقعہ میں منحصر نہیں تھی اور ان کا دعوتِ اسلام اور دعوائے عبدیت عیسےٰ میں جنابِ رسالتمآبؐ کے ساتھ شریک کار ہونا بھی اسی کا شاہد ہے ورنہ اگر اُن میں صداقت کا وجود صرف اسی دن کے لئے ہوتا تو یقیناً ان کا انتخاب اس قسم کے اہم مقابلہ کے لئے ناموزوں ہوتا۔ پس معلوم ہُوا کہ یہ واقعہ صرف ان کی صداقت کے اعلان کا بہانہ تھا۔ ورنہ تمام صحابۂ رسالتمآبؐ میں سے کوئی آدمی ایسا موجود نہ تھا جو اس فضیلت میں ان کے ہم پلّہ ہو سکتا اور اگر ایسا ہوتا تو آپ اس انتخاب میں یقیناً اس کو نظر انداز نہ فرماتے اس لئے کہ آیت کے الفاظ ابناء، نساء اور انفس کے جمع اور استغراق کے وسیع الذیل الفاظ زیادہ سے زیادہ قابلِ انتخاب افراد کو اپنے دامن میں جگہ دینے کو تیار تھے اور جنابِ رسالتمآبؐ کی منظرِ انتخاب میں بھی بُخل نہ تھا بلکہ وہ خلقِ عظیم کا مالک رسولؐ کشادہ رُوئی سے ساتھ ملانے کو تیار ہو جاتا۔ بشرطیکہ کوئی اِدھر آنے کی صلاحیت رکھ پاتا۔ پس ثابت ہُوا کہ اس معیار پر پُورے اترنے والے صرف یہی تھے جن کو لے جایا گیا تو اسی واقعہ میں اُن کا انتخاب اور چھانٹ اور ان کے مقابل والوں کو جھوٹے کی سند کا ملنا تاقیامت ایک دستورالعمل ہے کہ جب بھی یہ لوگ کسی میدان میں پہنچیں اور حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو جاوے تو معیار یہی ہے کہ جس طرف یہ لوگ ہوں گے صداقت اور حق اسی جانب ہوگا اور ان کی مقابل جماعت کاذب و باطل پرست ہوگی۔

(۱۱) چونکہ حسنین شریفینؑ باوجود کم سنی کے مباہلہ کے پروگرام میں شامل اور خداوند کریم کی جانب سے مدعو تھے۔ لہٰذا یہ آیت اُن کے کمالِ عقل پر نصِ قطعی ہے کیونکہ ایسے پروگراموں میں ناقص العقل کی شرکت یقیناً ناموزوں ہے اور جنابِ بتولِ معظمہ کی شمولیت اور ان کا مدعو ہونا بھی ان کے کمالِ عقل کی برہانِ قطعی ہے یعنی جس طرح بچپنہ حسنینؑ کے کمالِ عقل سے مانع نہیں اسی طرح نسوانیت جنابِ زہراؑ کے کمال میں مخل نہیں اور یہی اس خانوادۂ عصمت کا اُمت کے عام مردوں اور عورتوں سے امتیازی نشان ہے

واقعہ مباہلہ کے متعلق روایات

بنا بر مشہور ۲۴ ذوالحجہ سنہ ۱۰ھ کو بعد از فتح مکّہ یہ واقعہ پیش آیا کیونکہ آپ نے اطراف میں دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے چنانچہ ایک خط نصاریٰ نجران کو بھی

لکھا پس تحقیق کے لئے ان کا وفد مدینہ میں آیا اور انہوں نے پہلے مناظرہ کیا اور بعد میں مباہلہ کا فیصلہ ہوا۔

(۱) بروایت تفسیر قمی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نصاریٰ نجران کا وفد جب جناب رسالتمآب کے پاس پہنچا تو ان کے سردار تین شخص تھے۔ اہتم، عاقب اور سید۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے ناقوس بجائے اور پھر نماز ادا کی۔ صحابہ کرام کو مسجد رسولؐ میں ان کا یہ فعل ناگوار گزرا اور بارگاہ رسالت میں دبی زبان سے عرض بھی کی۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ رہنے دیجئے۔ جب وہ فارغ ہو چکے تو آپ کے قریب آکر کہنے لگے۔ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فرمایا۔ اللہ کی توحید اور اپنی رسالت کی طرف اور یہ کہ حضرت عیسٰے عبد خدا اور مخلوق خدا تھے، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ اگر یہ صحیح ہے تو فرمائیے ان کا باپ کون تھا؟ پس وحی نازل ہوئی کہ ان سے سوال کیجئے۔ تمہارا آدم کے متعلق کیا خیال ہے کیا وہ عبد خدا تھا۔ کھاتا پیتا تھا اور نکاح وغیرہ کا محتاج تھا؟ تو آپ نے ان سے یہی سوالات کئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا۔ کہ بتائیے:۔ اس کا باپ کون تھا۔ پس وہ شرمسار ہو کر لاجواب ہو گئے۔ چنانچہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ سے لے کر آیت مباہلہ کے آخر تک یہ آیتیں اتریں۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ مباہلہ کر لو۔ اگر میں سچا ہوں گا تو تم پر خدا کی لعنت اور عذاب نازل ہوگا اور اگر تم سچے ہوگے تو مجھ پر خدا کی لعنت نازل ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ واقعی یہ منصفانہ فیصلہ ہے اور مباہلہ کا وعدہ کر کے چلے گئے تو ان کے رؤسا سید۔ عاقب اور اہتم نے کہا کہ اگر وہ مباہلہ کرنے کے لئے اپنی قوم کو لائے۔ تو ہم مباہلہ کریں گے کیونکہ وہ نبی نہ ہوگا اور اگر وہ اپنی خاص اہلبیت کو ہمراہ لاکر مباہلہ کرے گا تو ہم مباہلہ نہ کریں گے کیونکہ اس کا اپنی اہلبیت کو ساتھ لانا اس کی صداقت کی دلیل ہے جب صبح ہوئی تو آپ نے حضرت امیرالمومنین اور جناب فاطمہ اور حسنؑ اور حسینؑ علیہم السلام کو ساتھ لیا۔ نصاریٰ نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو ان کو جواب دیا گیا کہ ایک اس کا چچازاد وصی اور داماد علی بن ابی طالب ہے اور ایک اس کی شہزادی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہے اور دو بیٹے حسنؑ اور حسینؑ علیہما السلام ہیں پس پیش کر بارگاہ رسالت میں عرض گزار ہوئے۔ یا رسول اللہ! ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں۔ ہمیں مباہلہ سے معافی دیجئے پس آپؐ نے جزیہ پر ان سے صلح کر لی اور وہ چلے گئے۔

(۲) عیون الاخبار سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہارون نے دریافت کیا تھا کہ تم کیسے ذریت پیغمبر کہلاتے ہو حالانکہ ہمارے پیغمبر کی نسل نہیں ہے کیونکہ نسل بیٹوں سے ہوا کرتی ہے نہ کہ بیٹیوں سے اور تم بیٹی کی اولاد ہو؟ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے قرابت اور قبر رسولؐ اور صاحب قبر کا واسطہ دے کر اس سوال کے جواب سے معافی چاہتا ہوں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ مجھے جہانتک خبر پہنچی ہے آپ اولاد علیؑ میں سردار اور ان کے امام وقت ہیں لہذا میرے ساتھ اس مسئلہ میں دلیل و برہان سے بات فرمائیے اور میں جو کچھ آپ سے دریافت کر رہا ہوں۔ اس کی ہرگز معافی نہ دوں گا۔ جب تک آپ قرآن مجید سے اپنے دعویٰ کا ثبوت نہ دیں اور اے اولاد علیؑ! تمہارا تو یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا کوئی حرف نہیں جس کی تاویل تمہارے پاس نہ ہو اور تم اس کے احتجاج میں پیش کرتے ہو۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ

شیئ ہو اور دیگر تمام علماء کے قیاسیات اور خیالات سے تم استغنا ظاہر کرتے ہو؟
آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا۔ اچھا مجھے اجازت دیجئے۔ تاکہ کچھ کہوں۔ ہارون نے کہا اجازت ہے بیان کیجئے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے پڑھا۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے :۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ الخ

اور اس کی ذریت سے داؤد، سلیمانؑ اور ایوبؑ یوسفؑ موسیٰؑ اور ہارونؑ ہیں۔ اور ہم احسان کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ (بھی ان کی ذریت سے تھے) الخ

پس میں نے دریافت کیا بتائیے :۔ حضرت عیسےٰ کے باپ کون تھے :۔ ہارون نے جواب دیا۔ کہ عیسےٰؑ کا باپ نہیں تھا۔ پس میں نے کہا۔ کہ خدا نے حضرت عیسےٰؑ کو ماں کی وجہ سے ذریت انبیاء میں داخل فرمایا اور اسی طرح ہمیں بھی ماں کے ذریعے سے ذریت پیغمبر قرار دیا۔

پھر میں نے کہا۔ کچھ اور بھی کہوں؟ اس نے کہا کہ ہاں! پس میں نے آیت مباہلہ تلاوت کی اور کہا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جناب رسالتمآبؐ نے نصاریٰ کے مباہلہ کے دن علی ابن ابی طالبؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ کسی اور کو بھی دعوت دی ہو اور آیت میں اَبْنَاءَنَا سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ نِسَاءَنَا سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں اور اَنْفُسَنَا سے مراد جناب علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔

(۴) امام علی رضا علیہ السلام سے مامون نے جو سوالات کئے تھے من جملہ اُن کے ایک یہ بھی تھا۔ کہ مامون نے دریافت کیا۔ کہ آپ کے جد پاک حضرت امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب کی خلافت پر دلیل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: آیت اَنْفُسَنَا :۔ مامون نے کہا۔ ٹھیک ہے بشرطیکہ نِسَاءَنَا کا لفظ نہ ہو، آپ نے فرمایا۔ ہاں اگر اَبْنَاءَنَا نہ ہو۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں :۔ ما الدليل على خلافة جدك على بن ابى طالب؟ قال آية انفسنا قال لولا نساءنا قال لولا ابناءنا۔

اس کی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب مامون نے حضرت علی کی خلافت کی دلیل طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ اَنْفُسَنَا کی آیت یعنی آیت مباہلہ۔ کیونکہ اس آیت میں علی کو نفس رسول کہا گیا ہے اور علیؑ کا نفس رسولؐ ہونا استحقاق خلافت کے لئے کافی ہے کیونکہ جن پر رسولؐ کو افضلیت حاصل ہے ان پر نفس رسولؐ کو بھی افضلیت حاصل ہوگی اور شیئ اور نفس شیئ کا حکم ایک ہی ہوا کرتا ہے اس پر مامون نے اعتراض کیا کہ لَوْلَا نِسَاءَنَا یعنی اَنْفُسَنَا سے حضرت علیؑ کا نفس رسولؐ

ہونا ثابت نہیں۔ کیونکہ یہاں انفس سے مراد مطلق مرد ہیں اور حضرت علیؑ ان میں ایک فرد ہے اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں خدا نے نِسَاءَنَا کو ذکر فرمایا ہے اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انفس سے مراد مرد ہیں۔ ہاں اگر نِسَاءَنَا کی لفظ نہ ہوتی تو علی کا نفس رسولؐ ہونا اس آیت سے سمجھا جاسکتا تھا۔ آپ نے اس کی تردید میں فرمایا لَوْلَا اَبْنَاءَ نَا یعنی اگر نِسَاءَنَا کے قرینہ سے اَنْفُسَنَا کا معنی مطلق مرد ہو تو اَبْنَاءَنَا کیوں ذکر کیا گیا یہ بھی تو مردوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ نِسَاءَنَا کے مقابلہ میں اگر اَبْنَاءَنَا کا ذکر نہ ہوتا تو نِسَاءَنَا سے مراد عورتیں اور ان کے مقابلہ میں انفس سے مراد مرد لئے جاسکتے تھے لیکن جب ان کا مقابلہ اَبْنَاء سے ہو تو باصطلاح قرآن نِسَاءَ سے مراد لڑکیاں ہو جایا کرتی ہیں لہٰذا انفس اپنے معنی حقیقی پر رہتے ہوئے حضرت علیؑ کے فضیلت مذکورہ کے اثبات کا موجب ہو جائے گا۔

اور ممکن ہے کہ مراد یہ ہو۔ کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے چونکہ اَنْفُسَنَا سے حضرت علیؑ کا نفسِ رسولؐ ہونا ثابت کر کے ان کا استحقاقِ خلافت بیان فرمایا۔ تو مامون نے اعتراض کیا کہ حضرت علیؑ کو نفسِ رسولؐ کہنے میں ایک خرابی لازم آتی ہے اور وہ یہ کہ خاتونِ جنت حضرت علیؑ کی زوجہ ہے اور رسول کی دختر ہے پس علیؑ نفسِ رسولؐ کیسے ہو سکتے تھے جبکہ وہ رسولؐ کی شہزادی کے شوہر ہیں تو آپ نے اس کے اس شبہ کا جواب اس طرح دیا کہ حسنین شریفینؑ کو جب خدا نے رسولؐ کے بیٹے قرار دیا تو علی نفسِ رسولؐ ثابت ہوئے کیوں کہ علیؑ کے بیٹوں کو خدا رسولؐ کے بیٹے فرما رہا ہے۔ گویا معنوی طور پر حضرت علیؑ کا نفسِ رسولؐ ہونا ظاہری رشتہ سے مانع نہیں ہو سکتا۔

(۴) اہلسنت کی تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے جب قوم نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو نصاریٰ نے کہا۔ کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے جب علیحدہ مجلسِ مشاورت قائم ہوئی تو انہوں نے مل جل کر عاقب سے کہا۔ جو اُن کا صاحبِ رائے تھا۔ عبدالسیح (یہ اس کا لقب ہے) تیرا کیا مشورہ ہے؟ اُس نے جواب دیا۔ اے نصرانیو! خدا کی قسم تمہیں معلوم تو ہے ہی کہ حضرت محمد مصطفےٰ نبی مرسل ہے اور اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا ہے اور خدا کی قسم کبھی کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ کی جرأت نہیں کی مگر یہ کہ اس کا پوری طرح ستیاناس ہو گیا۔ ان کے چھوٹے بڑے سب فنا ہو گئے اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ ہاں اگر تم اپنے مذہب کے خیر خواہ ہو اور اسی دین پر رہنے کے متمنی ہو تو چپ چاپ واپس جانے میں اپنی خیر سمجھو؟

پس جب صبح ہوئی تو جناب رسالتمآبؐ نے حسینؑ کو گود میں لیا اور حسنؑ کا ہاتھ پکڑا اور جناب فاطمہ ان کے پیچھے روانہ ہوئیں اور حضرت علیؑ جناب فاطمہؑ کے پیچھے تھے اور آپ ان کو فرما رہے تھے کہ دیکھنا جب میں دعا مانگوں تو تم سب آمین کہنا۔ نجران کے اسقف (پادری) نے نصاریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں۔ اگر وہ اللہ سے سوال کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا۔ پس ان لوگوں سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور قیامت تک زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا۔ پس انہوں نے یہ بات مانتے ہوئے بارگاہ رسالت میں عرض کی کہ ہماری

راستے یہ ہے کہ ہم مباہلہ چھوڑ دیں ۔ آپ اپنے دین پر رہیں اور ہم اپنے دین پر رہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم مباہلہ سے انکار کرتے ہو، تو پھر تمہیں اسلام قبول کرنا چاہیئے ۔ پس مسلمانوں کے ساتھ تم نفع اور نقصان میں شریک ہو جاؤ گے تو انہوں نے اس بات سے انکار کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ پھر جہاد کی دعوت دیتا ہوں ۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے ساتھ لڑنے کی جرأت نہیں کرتے ۔ البتہ ہم آپ سے مصالحت کے خواہشمند ہیں جس کی شرائط یہ ہوں گی (۱) آپ ہمیں نہ چھیڑیں گے (۲) ہمیں خوفزدہ بھی نہ کیا جائے گا بلکہ پُرامن زندگی گزارنے کی سہولت ہمیں دی جائے گی ۔ (۳) ہمیں اپنے دین کے چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے گا ۔ (۴) ہم ہر سال ۲ ہزار لباس ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار رجب میں اور تیس ۳۰ زرہ لوہے کی ادا کرتے رہیں گے ۔ پس آپ نے منظور فرما لیا اور فرمایا کہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تحقیق موت اہل نجران پر اپنے پر کھول چکی تھی اور اگر وہ مباہلہ کرتے تو بندر اور سؤر کی شکل میں مسخ ہو جاتے اور پوری وادی اُن کے لئے آگ سے بھڑک اٹھتی اور خدا نجران اور اہل نجران کو تباہ کر دیتا یہاں تک کہ درختوں پر پرندے بھی زندہ نہ رہ سکتے اور ایک سال کے اندر اندر تمام روئے زمین کے نصرانی لقمۂ اجل ہو جاتے ۔

نوٹ :- اس روایت میں جزیہ کی شرائط میں ہے کہ دو ہزار لباس سالانہ ادا کریں گے ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہِ رجب میں ۔ لیکن یہاں صفر سے مراد ماہ محرم ہے کیونکہ عرب لوگ ماہ محرم کو صفر اوّل اور ماہ صفر کو صفر ثانی کہا کرتے تھے جب اسلام نے صفر اوّل کے مہینے کو بھی حرمت والے مہینوں میں شمار کر دیا تو اس کا نام شہر اللہ المحرم پڑ گیا اور آہستہ آہستہ شہر اللہ کا لفظ بھی کٹ گیا اور صرف محرم مشہور ہو گیا ۔

(۵) تفسیر درمنثور سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے اہل نجران کو دعوت نامہ لکھا کہ میں تم لوگوں کو اللہ کی عبادت اور اُسی کی ولایت کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اگر انکار کرو گے تو تمہیں جزیہ ادا کرنا پڑے گا ۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ جہاد کریں گے جب خط وہاں پہنچا اور وہاں کے اسقف نے خط پڑھا تو بہت گھبرایا اور خوفزدہ ہُوا اور اہل نجران کے ایک شخص شرجیل ابن وداعہ کو بلا بھیجا اور اس کو یہ خط پڑھنے کے لئے دیا جب وہ خط پڑھ چکا تو اسقف نے اُس سے اس بارہ میں مشورہ طلب کیا ۔ شرجیل نے جواب دیا کہ تجھے معلوم ہے کہ خداوند کریم نے ابراہیمؑ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ذرّیت اسمٰعیل میں نبوّت کو قرار دوں گا تو ممکن ہے یہ وہی شخص ہو ۔ بہرکیف مجھے نبوّت کے معاملہ میں دخل اندازی کی مجال نہیں البتہ کوئی دنیا داری کا مشورہ ہوتا تو اپنی رائے ظاہر کر سکتا اور تجھے کوئی صحیح منظریہ قائم کر کے مطلع کرتا ۔ اس کے بعد اسقف نے اہل نجران کے ہر ہر شخص کو یہ خط پڑھوا کر اُن سے فرداً فرداً رائے طلب کی اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو شرجیل نے دیا تھا ۔ اس کے بعد تمام کی رائے اس بات پر جم گئی ۔ کہ شرجیل بن وداعہ اور عبداللہ بن شرجیل اور جبار بن فیض کو معلومات حاصل کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا جائے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے ۔

پس یہ وفد مدینہ پہنچا ۔ حضرت عیسےٰ کے متعلق بات چیت ہوئی جب انہوں نے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا سوال کیا

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ

فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ طرف ایسی بات کے جو یکساں طور پر (قابل قبول ہے) ہمارے اور تمہارے درمیان یہ کہ کسی کی عبادت

اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا

نہ کریں سوائے خدا کے اور نہ شریک کریں اس کے ساتھ کوئی چیز اور نہ پکڑے ہمارا بعض بعض کو اپنا رب

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

بغیر اللہ کے　　پس اگر نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو۔ کہ ہم مسلمان ہیں

تو آپ نے فرمایا کہ میں کل جواب دوں گا چنانچہ اسی رات کو یہی آیات اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی سے لے کر آخر تک نازل ہوئیں بالآخر جب مباہلہ تک نوبت پہنچی اور صبح کو جناب رسالتمآبؐ مع ساتھیوں کے میدانِ مباہلہ میں پہنچے تو شرجیل نے ساتھیوں سے کہا کہ ان سے مباہلہ ہماری ہلاکت کا موجب ہوگا چونکہ اس کو اپنے ساتھیوں نے اپنی طرف سے کلی اختیار دے دیا تھا پس شرحبیل نے جزیہ دینا منظور کر کے آپؐ سے مصالحت کر لی۔

بہرکیف نصاریٰ کے وفد کے ناموں میں اختلاف ہے لیکن تمام مفسرین کو اس بات پر پورا اتفاق ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے ہمراہ سوائے علی و بتول و حسنین علیہم السلام کے اور کوئی نہ تھا اور اس روایت کو شیعہ سُنّی مفسرین نے متفقہ طور پر لکھا ہے اور ابن طاؤس فرماتے ہیں کہ میں نے روایت مباہلہ کو اکاون صحابہ و تابعین سے نقل کیا ہے کہ مصداق آیت حضرت علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ اور جو لوگ اس قسم کی متواترات سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے پاس سوائے عناد و حسد و بغض و کینہ کے اور کچھ نہیں اور خدا خود ہی ان سے حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

رکوع ۱۵

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ :- اس آیت میں یہود و نصاریٰ ہر دو کو دعوتِ اسلام دی گئی ہے پہلے پہل ان کو کلمۂ توحید لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے اقرار کی دعوت دی گئی اور اس کے بعد صرف زبانی اقرار کو ناکافی قرار دیتے ہوئے ان کو عملی طور پر شرک سے منع کیا گیا۔ کیونکہ یہودی عزیر کو اور نصرانی مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر شرک کے مرتکب تھے۔ اعتقاد اور عبادت کی اصلاح کے بعد دوسرے معاملات میں ان کو اپنے احبار (ملاؤں) کی ربوبیت سے باز رہنے کی دعوت دی۔ مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری کہ اپنے احبار و رہبان کو انہوں نے اپنا رب مان لیا ہے تو عدی بن حاتم نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا جس چیز کو وہ لوگ تمہارے اوپر حلال و حرام کر دیتے تھے

يَآأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ

اے اہلِ کتاب تم کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اُتری تورات

وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ

وانجیل مگر اُس کے بعد کیا تم نہیں سوچتے دیکھئے تم نے ایسی بات میں جھگڑا کیا ہے

فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ

جس کا تمہیں علم تھا پھر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو علم ہی نہیں؟

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور خُدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

کیا تم اس کی اطاعت نہیں کرتے تھے؟ اس نے کہا۔ بے شک ایسا ہی تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ ان کی ربوبیت سے یہی تو مراد ہے۔ ربط:۔ خداوند کریم نے اہل کتاب کو دعوتِ اسلام منوانے کیلئے کیا خوب طریقہ استعمال فرمایا۔ پہلے پہل تو حضرت مریمؑ کی ولادت کا قصہ۔ پھر حضرت عیسٰےؑ کی پیدائش کا واقعہ اس انداز سے پیش کیا کہ منصف مزاج خود بخود اس کی الوہیت کے قول سے دست بردار ہو جائیں کیونکہ ولادت کے یہ ادوار و اطوار شانِ الوہیت کے سراسر منافی ہیں لیکن اگر اُن کو تسلی نہ ہو تو پھر استدلالی طور پر حضرت عیسٰےؑ کی الوہیت کی تردید فرمائی اور حضرت آدمؑ کی خلقت سے تشبیہ دے کر اُن کے جملہ اعتراضات کا قلع قمع فرمایا۔

بعد ازاں انتہائی کند ذہن طبقہ کی تسلی و اطمینان کے لئے مباہلہ کی دعوت دی جب ان تمام باتوں سے ان کے منصف مزاج گروہ کی ذہنی خلش کسی حد تک دُور ہو گئی تو ان کو ضد اور ہٹ دھرمی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے نہایت پیار و محبت کے لہجہ میں اُن کے سامنے ایک قابلِ قبول اور قرینِ عقل دستور العمل پیش فرمایا کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیئے اور غیر اللہ کو اس کے ساتھ قطعاً شریک نہیں ماننا چاہیئے اور اس بارہ میں ملا اور پادری لوگوں کی دجل فریبی سے بچتے ہوئے ان کی اندھی تقلید سے گریز کر کے صرف اللہ کی ربوبیت کو دل میں بٹھا لینا چاہیئے بعض مورخین نے ذکر کیا ہے کہ سنہ ۶ھ میں جنابِ رسالتمآبؐ نے قیصر، کسریٰ اور نجاشی کو بذریعہ وفود اسی مضمون کے دعوت نامے ارسال فرمائے تھے (میزان)

یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ۔ کہتے ہیں کہ یہودیوں اور نصرانیوں نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مناظرہ کیا۔ ہر ایک گروہ ان کو اپنی طرف کھینچتا تھا پس دونوں فیصلہ کے لئے جنابِ رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی کیونکہ موجودہ یہودیت اور نصرانیت تورات وانجیل کے تابع تھیں اور حضرت ابراہیمؑ حضرت موسٰیؑ سے ایک ہزار سال اور حضرت عیسٰےؑ سے دو ہزار سال پہلے تھے پس

اس صورت میں ابراہیمؑ کو یہودیت یا نصرانیت میں داخل ماننا بے عقلی و بے وقوفی ہی ہے اور در منثور میں ابن عباس سے مروی ہے کہ نصاریٰ نجران اور احبارِ یہود کے درمیان اسی موضوع پر بارگاہِ رسالت میں بحث ہوئی۔ تو آپ نے یہی جواب دے کر ان کو ساکت کیا۔

هٰاَنۡتُمۡ - اس آیت مجیدہ کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) تم نے ایسی چیز میں جھگڑا کیا ہے جس کے متعلق کچھ نہ کچھ تمہیں علم ہے اور وہ ہے ان کی نبوت و رسالت کا علم، اب اس کے متعلق ایسی بحث کا آپس میں تم کیوں آغاز کرتے ہو جس سے تم قطعاً بے خبر ہو اور وہ ہے اس کی یہودیت یا نصرانیت کا فیصلہ۔

(۲) تا حال تم نے ایسی بات میں نزاع کیا جس کا کسی حد تک تمہیں علم تھا اور وہ ہے حضرت عیسےٰ کا معاملہ۔ اب تمہیں ایسی بات میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے جس کا تمہیں قطعاً علم ہی نہیں اور وہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی یہودیت یا نصرانیت۔

(۳) اے گروہ یہود و نصاریٰ تم نے آپس میں پہلے تو اس بات میں مناظرہ کیا جس کا تم کو علم تھا اور وہ تھا یہودیوں کی طرف سے نصرانیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسےٰ کی ابن اللہ ہونے کی نفی اور نصرانیوں کی طرف سے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسےٰ کی نبوت و بعثت کا اثبات۔ پس اب تم ایسی بات میں ایک دوسرے کے دست و گریباں کیوں ہو رہے ہو جس کے علم سے دونوں گروہ عاری ہو اور وہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی یہودیت یا نصرانیت کا ثبوت۔

(۴) اے گروہ یہود و نصاریٰ پہلے تو تم ہمارے ساتھ ایسی چیز میں ازراہِ عناد جھگڑتے تھے جس کا تمہیں علم تھا اور وہ ہے جناب رسالتمآبؐ کی تورات و انجیل میں بیان شدہ صفات و علائم۔ اب تم ایسی بات میں جھگڑنے لگے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔ حالانکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مفسرین نے اپنے اپنے ذوق کے ماتحت بعض اقوال کو ترجیح دی ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ

نہ حضرت ابراہیمؑ یہودی اور نہ نصرانی تھے بلکہ وہ تو سچے مسلمان تھے اور نہ وہ

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ

مشرک تھے تحقیق قریب ترین لوگوں میں سے ابراہیم کے ساتھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ ولی ہے ایمان والوں کا چاہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ تمہیں گمراہ کر دیں۔

لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَهْلَ

حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے نفسوں کو اور سمجھتے نہیں اے اہل

الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ

کتاب تم کیوں کفر کرتے ہو آیات خدا کا حالانکہ تم گواہ ہو؟ اے اہل کتاب

لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع

کیوں ملاوٹ کرتے ہو حق کی ساتھ باطل کے اور حق کو چھپاتے ہو جانتے ہوئے؟

مَاكَانَ اِبْرٰهِيْمُ ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ سے ایک ہزار برس اور حضرت عیسٰیؑ سے دو ہزار برس پہلے گذر جانے کی وجہ سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت یا نصرانیت کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا تو انہیں مسلمان کیونکر کہا جا سکتا ہے جبکہ وہ جناب رسالتمآبؐ سے تقریباً اڑھائی ہزار برس پہلے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دین اسلام جو ایک فطری اور اللہ کا پسندیدہ دین ہے حضرت ابراہیمؑ اُسی دین پر تھے۔ تورات اپنے وقتی مصالح کے لحاظ سے اُسی دین کے کمال کا کورس تھی اور انجیل بھی اپنے زمانہ کے مقتضیات کے پیشِ نظر اُسی فطری دین کے کمال کا پروگرام لے کر آئی پس یہ دونو دین اُسی اصلِ دینِ اسلام کے کمال کے شعبے تھے اور شریعتِ قرآنیہ بھی اُسی اصل دین اسلام کے کمال و عروج کا نصاب ہے لہذا حضرت ابراہیمؑ کو مسلمان کہنا اسی اصل کے لحاظ سے ہے نہ کہ فرعی اعتبار سے کیونکہ فرع کو اصل سے منسوب کیا جاتا ہے اور اصل کو فرع سے منسوب نہیں کیا جاتا اور بعض فرعی احکام کا نسخ اس کی تصدیق کے منافی نہیں ہوتا کیونکہ منسوخ احکام اپنے وقت میں بجا تھے اور ناسخ احکام اپنے وقت میں موزوں ہیں پس دونوں اپنے اپنے وقت میں درست اور واجب العمل ہیں۔ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۔ کہتے ہیں کہ جس طرح

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ

کہا گروہ اہل کتاب نے ایمان لاؤ اس پر جو نازل ہوئی اُن لوگوں پر جو ایمان لائے دن کے پہلے حصہ میں اور

النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ

کفر کر دو آخری حصہ میں تاکہ وہ پھر جائیں اور نہ مانو مگر اس کی جو تمہارے دین کی اتباع کرتا ہو

دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ

فرما دیجئے تحقیق ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے کہ دیا جائے کسی کو مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا یا یہ کہ

یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

وہ حجت قائم کریں تم پر اللہ کے ہاں فرما دیجئے تحقیق فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور خدا وسعت دہ

عَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۴﴾

علم والا ہے مخصوص فرماتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے

یہودی اور نصرانی حضرت ابراہیمؑ کو اپنی اپنی طرف منسوب کرتے تھے اسی طرح مشرکینِ عرب بھی دعویٰ کرتے تھے کہ دینِ حنیف اور ملتِ ابراہیمؑ پر ہم ہیں چنانچہ اہل کتاب ان کو حنفا یعنی ملت حنیفیہ پر چلنے والے کہتے تھے اور حنیفیت وثنیہ مراد لیتے تھے تو خداوند کریم نے جہاں حضرت ابراہیمؑ کی یہودیت اور نصرانیت کی تردید فرمائی ساتھ ساتھ مشرکین عرب کے قول کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حنیف تھے یعنی تمام ادیانِ باطلہ اور مللِ فاسدہ سے کنارہ کش اور صراطِ حق پر گامزن تھے لیکن وہ شرک کرنے والے نہیں تھے۔ بلکہ پکے مسلمان تھے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا :- تفسیر صافی میں کافی و عیاشی سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اس سے مراد ائمہ اور ان کی اطاعت کرنے والے ہیں نیز آپ نے عمر بن یزید سے فرمایا کہ خدا کی قسم تم لوگ آلِ محمدؐ سے ہو وہ کہتا ہے میں نے عرض کی قربان جاؤں کیا ہم نفس آلِ محمدؐ سے ہیں؟ تو آپ نے تین بار فرمایا ہاں۔ اللہ کی قسم! تم لوگ آلِ محمدؐ سے ہی ہو پس آپ نے مجھے دیکھا اور میں نے اُن کی طرف نگاہ کی تو فرمانے لگے اے عمر! اللہ فرماتا ہے اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ الخ

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا انبیاء کے قریب ترین وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جو اُن کی شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہوں پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ جناب رسالتمآبؐ کا دوست اور قریبی وہی شخص ہے جو اللہ کا فرمانبردار ہو خواہ رشتہ میں آپ سے کتنا ہی دور ہو اور اُن کا دشمن وہ شخص ہے جو اللہ کا نافرمان ہو خواہ اس کو رشتہ میں آپ سے کتنا ہی قرب حاصل ہو۔

رکوع ۱۶

قَالَتْ طَّآئِفَةٌ :- یہ تجویز ان کی چالاکی اور فریب کاری تھی جس کا خدا نے پردہ چاک کر دیا ان کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان یہ سمجھیں گے کہ آخر کوئی نقص اور عیب اس دین میں ضرور ہے کہ یہودی لوگ ایمان لا کر پھر دوبارہ کافر ہو گئے

لہٰذا وہ دینِ اسلام سے شک و شبہ کی بناء پر برگشتہ ہو جائیں گے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْا :۔ اس آیت کے کئی معانی کئے گئے ہیں

(۱) یہ کلام یہود ہے اور قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۔ درمیان میں جملہ معترضہ خطابِ خداوندی ہے اور اَنْ يُّؤْتٰى تتمہ کلام یہود ہے معنی یہ ہوگا۔ اے گروہ یہود تم کسی کے متعلق یہ بات ہرگز نہ مانو کہ اس کو تمہاری طرح علم و حکمت، کتاب اور حجت وغیرہ عطا ہوئی سوائے اس کے جو تمہارے اس دینِ یہودیت کا پیرو ہو کہتے ہیں خیبر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں کو یہ بات کہی تھی تاکہ مبادا وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔

(۲) صرف پہلا حصہ کلام یہود ہے اور قُلْ اِنَّ الْهُدٰى کے بعد آخر تک خطابِ الٰہی ہے اور اَنْ يُّؤْتٰى دراصل اَنْ لَّا يُؤْتٰى تھا یا کہ یہ اَنْ کا مضاف لفظ كَرَاهَةَ محذوف قرار دیا جائے پس معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں نے اپنے عوام کو یہودیت پر ڈٹے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ تم کسی کی بات پر یقین و باور نہ کرو۔ سوائے اس کے جو تمہارے دین پر ہو تو خدا ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ اے مومنین :۔ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی جانب سے ہو اور یہ کہ کسی کو نہیں عطا ہوئیں وہ نعمتیں جو تمہیں عطا ہوئیں یا یہ کہ ناپسند فرماتا ہے اللہ کہ کسی کو عطا کرے وہ نعمتیں جو اس نے تم کو عطا فرمائیں اور اللہ کے نزدیک بروزِ محشر بھی تمہیں حجت سے کوئی مغلوب نہ کر سکے گا کیونکہ تمہارا دین حق ہے۔

(۳) اوّل سے آخر تک سب خطابِ خداوندی ہے اور معنی یہ ہے کہ اے گروہ مسلمان تم کسی کی بات پر باور نہ کرو۔ سوائے اس کے جو تمہارے دین اسلام پر عمل کرنے والا ہو۔ کیونکہ دین صرف دین خدا ہی ہے اور کسی کے متعلق یہ یقین نہ کرو کہ اسے تم جیسی نعمات عطا ہوئیں۔ یا وہ تمہیں قیامت کے دن اپنی حجت سے مغلوب کرے گا اس لئے کہ یہ دین دینِ حق ہے اس پر کسی کو حجت کے اعتبار سے غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۴) صاحبِ تفسیر میزان نے ذکر کیا ہے کہ اہلبیت عصمت سے اس سے پہلے آیت کے متعلق منقول ہے کہ وہ یہودیوں کا اس وقت کا مقولہ ہے جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا یعنی جناب رسالتمآبؐ نمازِ صبح بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے تھے جو یہود کا قبلہ تھا پھر تحویل قبلہ کے حکم سے نمازِ ظہر خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی تو یہودیوں کی ایک جماعت نے کہا کہ جو حکم مسلمانوں پر دن کے پہلے حصہ میں اترا تھا۔ اس پر ایمان لاؤ یعنی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم مان لو اور جو حکم دن کے آخر حصہ میں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا ہے اس کا انکار و کفر کرو اور چونکہ تورات کی بشارت ایک یہ بھی تھی کہ نبی آخر الزمان دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا۔ پس انہوں نے ایک دوسرے کو یہ کہنا شروع کر دیا۔ کہ یہ راز کی بات کسی کے سامنے نہ کہو اور کسی پر وثوق و باور نہ کرو سوائے اپنے ہم مذہب و ہم خیال لوگوں کے مبادا اُن کے قبلہ کا حکم پختہ ہو جائے اور مسلمانوں کو ہماری طرف سے اپنے قبلہ کی صحت کا اطمینان ہو جائے پس ہماری صاحبِ قبلہ ہونے کی خصوصیت ختم ہو کر رہ جائے گی اور علاوہ بریں وہ میدانِ قیامت میں بھی ہمارے اُوپر احتجاج کرنے کے قابل ہو جائیں گے پس خداوند کریم نے اس زعمِ فاسد کی تردید فرمائی کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی جانب سے ہو اور فضل اُسی کے ہاتھ

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ

اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اُس کو دیناروں کی تھیلی کا امین بنایا جائے تو وہ واپس ادا کر دیں گے اور بعض اُن سے

اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ

ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن کو ایک دینار بطور امانت دیا جائے تو نہ ادا کریں گے مگر درصورتیکہ اُن پر کھڑے رہو یہ اس لئے

بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر نہیں ہے ان پڑھ لوگوں کے بارہ میں کوئی گناہ اور بولتے ہیں اللہ پر جھوٹ

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

جان بوجھ کر ہاں جو شخص اس کے عہد کی وفا کرے اور ڈرے تو خدا ڈرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

میں ہے وہ جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔ خواہ تم ایمان لاؤ۔ یا کفر کرو اور خواہ تم اس امر کا اظہار کر دیا اس کو چھپانے کی کوشش کرو اور انہوں نے اسی معنی کو ترجیح دیتے ہوئے اقوالِ گذشتہ کو سیاقِ آیت سے بعید قرار دیکر رد کر دیا ہے اور صاحب تفسیر صافی نے فرمایا ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے اس کے حل کے متعلق کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچ سکی۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ :۔ عبداللہ بن سلام کو ایک شخص نے دو ہزار دینار بطور امانت دیئے تھے اور اُس نے نہایت خوش اسلوبی سے واپس کر دیئے تھے لہٰذا اس کی مدح ہے اور فنحاص بن عازورار کو ایک شخص نے صرف ایک دینار بطور امانت دیا تھا لیکن اُس نے خیانت کر کے ادا نہ کیا لہٰذا اس کی مذمت ہے بعض مفسرین نے امانت ادا کرنے والوں سے مراد نصاریٰ اور خیانت کرنے والوں سے مراد یہودی لئے ہیں۔ بہرکیف تنزیل کا تعلق اگرچہ بعض موارد سے مختص ہو لیکن تاویل کے اعتبار سے ہر وہ شخص اس کا مصداق ہو سکتا ہے جو ان صفات کا حامل ہو۔

اَلْاُمِّيّٖنَ ۔ یہاں ان پڑھ لوگوں سے اُن کی مراد وہ لوگ ہیں جو اُن کے دین یعنی یہودیت پر نہیں تھے اور اُن کا خیال یہ تھا کہ خدا کے نزدیک ان لوگوں کے حق میں خیانت کرنا ہم پر مباح اور حلال ہے اور بروزِ محشر ہم سے اُن کے مال کی کوئی باز پرس نہ ہوگی اور یہ خدا پر اُن کا دیدہ و دانستہ بہتان ہے کیونکہ تورات میں صاف طور پر اس فعل بد کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے۔

مَنْ اَوْفٰى ۔ سیاقِ آیت کی رُو سے یہاں وفائے عہد سے مراد ادائے امانت ہے جناب رسالتمآبؐ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ امانت کا ادا کرنا واجب ہے خواہ نیک کی ہو یا بد کی ہو اور آپ نے فرمایا کہ جس شخص میں تین عادتیں پائی جائیں وہ منافق ہے خواہ نمازی، روزہ دار اور اپنے آپ کو مومن کہلانے والا ہو (۱) جھوٹا (۲) خلافِ وعدہ کرنے والا (۳) امانت کی خیانت کرنے والا۔ نیز فرمایا کہ جو شخص امانت کو ادا کرے گا۔ بروزِ محشر خدا اس کو حورعین عطا فرمائے گا۔

رَبَّانِيِّينَ ، رَبَّانِيٌّ کی جمع ہے اور رَبَّانی رب کی طرف منسوب ہے لیکن ربّ کی طرف نسبت دیتے ہوئے اس میں الف ونون کا اضافہ کیا گیا ہے جس طرح لحیہ کی طرف نسبت دیتے ہوئے لحیانی کہہ دیتے ہیں اور اس سے مقصود صرف مبالغہ ہوا کرتا ہے بنا بریں لحیانی کا معنی ہوا کرتا ہے بڑی ڈاڑھی والا ۔ اور یہاں معنی ہو گا رب کے ساتھ خصوصی نسبت رکھنے والا ۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ :۔ اس سے پہلی آیت کی نسبت اگرچہ قوم نصاریٰ سے زیادہ ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف اپنے دعویٰ کو منسوب کرتے تھے لیکن اس کے مفہوم کا حصر صرف اُن ہی میں نہیں تھا ۔ بلکہ تمام انبیاء کی شان یہی ہے اور اسی اعتبار سے دوسری آیت میں باقی انبیاء سے اپنے آپ کو منسوب کرنے والوں کے غلط عقائد کی بھی اُسی لہجہ میں نفی فرمادی کہ جس طرح کسی نبی سے یہ ناممکن ہے کہ اپنے لئے خدائی دعویٰ کرے اسی طرح کسی نبی سے یہ بھی ممکن نہیں کہ لوگوں کو ملائکہ اور انبیاء کی ربوبیت کا درس دے پس اس میں صابی ۔ عرب جاہلی اور یہود کے اقوال کی تردید ہو گئی کہ صابی باوجود اہل کتاب کہلوانے کے ملائکہ کی عبادت کرتے تھے اور اسی کو اپنے دین کا جزو سمجھتے تھے اور عرب جاہلی اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف نسبت دیتے ہوئے حنفاء کہلاتے تھے اور باوجود اس کے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہود حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ کہتے تھے ۔

أَيَأْمُرُكُمْ :۔ ان عقائد فاسدہ کی نسبت انبیاء سے دینے کا استبعاد بیان فرمایا ہے کہ تمام انبیاء تو دینِ اسلام کی طرف بلانے والے تھے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تم کو اسلام کی دعوت دیں اور تم اسلام قبول بھی کر لو اور پھر وہ تمہیں اس قسم کے کفریہ عقائد کی تعلیم دیں بلکہ یہ صرف تم لوگوں کی بہتان تراشیاں اور افتراء پردازیاں ہیں اُن کا دامنِ عصمت اس قسم کی گندہ خیالیوں سے بالکل صاف اور مبرا ہے اور اس جگہ اسلام سے مراد دینِ فطرت ہے جس کی تبلیغ کے لئے جملہ انبیاء تشریف لائے اگرچہ جزوی فروعی اختلافات شریعتوں میں تھے لیکن وہ دینِ اسلام کے کلی عقائد سے منافات نہیں رکھتے تھے پس مقصد یہ ہے کہ کسی نبی کی شریعت میں بھی ان خرافات کی کوئی گنجائش نہیں ۔

تنبیہ :۔ یہ فرمائشات صرف ان لوگوں تک محدود نہیں جو گذر چکے ہیں بلکہ قیامت تک کے لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہیں جس طرح گذشتہ کسی نبی کو رب کہنے والے اس کی زد میں آتے ہیں اسی طرح تاقیامت کسی مخلوق کو رب کہنے والے اسی کے تحت میں آئیں گے اسی بناء پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ۔ کہ میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک وہ جو میرے فضائل پر پردہ ڈالتے ہوئے مجھے اپنے عہدہ سے گرائیں گے اور دوسرے وہ جو مجھے میرے مرتبہ سے بڑھائیں گے یعنی جو میری ربوبیت کے قائل ہوں گے جس طرح کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں اسی قسم کے دو گروہ گمراہ ہو گئے ۔ ایک یہودی جنہوں نے ان کی نبوت کا انکار کیا اور دوسرے نصاریٰ جنہوں نے ان کو خدا مان لیا پس جسطرح حضرت عیسےٰ نبی تھے اور مخلوق خدا تھے اسی طرح حضرت علیؑ بھی عبداللہ اور ولی اللہ ہیں اور یہی عقیدہ باعثِ نجات و فلاحِ ابدی ہے اور جو لوگ ان کی خدائی کے قائل ہیں وہ مذہب حق امامیہ کے اُصول کے مطابق کافر اور مشرک ہیں ۔ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے سب کچھ اُن کے حوالہ کر دیا اور اب بےکار و بےاختیار ہے وہ بھی کافر و مشرک ہیں اور اس کو تفسیر کی پہلی جلد یعنی مقدمہ میں زیادہ واضح کیا گیا ہے ۔

کتاب اور اہل کتاب

بعض روایات میں اگرچہ مجوسیوں کو بھی اہل کتاب کہا گیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سی کتاب کی طرف منسوب ہیں اور قرآن مجید بھی اُن کے ذکر سے خاموش ہے قرآن میں جہاں کہیں اہل کتاب کا تذکرہ ہے اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہی ہیں۔

یہودیوں کے پاس جو کتب مقدسہ موجود ہیں جن کو وہ کتب سماویہ کی منزلت دیتے ہیں ان کی تعداد پینتیس ۳۵ بتائی گئی ہے۔

(۱) تورات جو حضرت موسےٰ پر نازل ہوئی یہ پانچ سفروں پر مشتمل ہے (۲) کتاب یوشع (۳) کتاب قضاۃ بنی اسرائیل (۴) کتاب راعوت (۵) سفر اوّل صموئیل (۶) سفر ثانی صموئیل (۷) سفر اوّل من اسفار الملوک (۸) سفر ثانی من اسفار الملوک (۹) سفر اوّل من اسفار الایام (۱۰) سفر ثانی من اسفار الایام (۱۱) سفر اوّل عزرا (۱۲) سفر ثانی عزرا (۱۳) سفر استیر (۱۴) کتاب ایوب (۱۵) زبور داؤد (۱۶) کتاب الامثال (۱۷) کتاب الجامعہ (۱۸) کتاب تسبیح التسابیح (یہ تینوں کتابیں حضرت سلیمان کی طرف منسوب ہیں) (۱۹) کتاب نبوت اشعیا۔ (۲۰) کتاب نبوت ارمیا (۲۱) مراثی ارمیا (۲۲) کتاب حزقیال (۲۳) کتاب نبوت دانیال (۲۴) کتاب نبوت ہوشع (۲۵) کتاب نبوت یوبیل (۲۶) کتاب نبوت عاموص (۲۷) کتاب نبوت عوبدیا (۲۸) کتاب نبوت یونان (۲۹) کتاب نبوت میخا (۳۰) کتاب نبوت ناحوم (۳۱) کتاب نبوت حیقوق (۳۲) کتاب نبوت صفونیا (۳۳) کتاب نبوت حجی (۳۴) کتاب نبوت زکریا (۳۵) کتاب نبوت ملاخیا۔ لیکن قرآن میں ان مذکورہ کتب میں سے صرف تورات اور زبور کا صراحت سے ذکر موجود ہے

نصاریٰ کے پاس کتب مقدسہ میں سے چھ کتابیں اور اکیس رسالے موجود ہیں جن کو صحف سماویہ سمجھا جاتا ہے۔

(۱) انجیل متی (۲) انجیل مرقس (۳) انجیل لوقا (۴) انجیل یوحنا (۵) کتاب اعمال الرسل (۶) رویائے یوحنا اور پولس کے چودہ رسالے۔ پطرس کے دو رسالے۔ یوحنا کے تین رسالے۔ رسالۂ یعقوب اور رسالۂ یہودا۔ لیکن قرآن مجید میں صرف اسی قدر ہے کہ حضرت عیسےٰ پر ایک کتاب نازل کی گئی جس کا نام انجیل تھا اور وہ صرف ایک انجیل تھی نہ کہ زیادہ (میزان)

تورات اور یہودیت

حضرت موسےٰ کے بعد حضرت یوشع یہودیوں کے مذہبی پیشوا تھے اور ان کے بعد یہود کی قیادت قاضیوں کے ہاتھ میں ایک عرصہ تک رہی اور پھر بادشاہت نے اس کی جگہ لے لی چنانچہ ان کا پہلا بادشاہ طالوت تھا جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان، یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے اور حضرت سلیمان کے بعد ان میں اختلاف شدید پیدا ہو گیا جس سے ان میں کمزوری روز افزوں پیدا ہوتی گئی۔ اور تقریباً تیس تک ان میں بادشاہ ہوئے۔ جب بخت نصر (بخت نصر کی وجہ تسمیہ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے کتیا کے دودھ سے پرورش پائی تھی جس کا نام بخت تھا اور اس کتیا کے مالک کا نام نصر تھا پس اس بنا پر اس کا نام بھی بخت نصر مشہور ہو گیا اور بعض روایات میں سورنی کے دودھ سے اس کا پرورش پانا بھی ملتا ہے۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ بخت کا معنی بیٹا اور نصر اس بت کا نام تھا جس کا یہ پجاری تھا اس وجہ سے اس کا نام بخت نصر یعنی نصر کا بیٹا مشہور ہو گیا) بابل کا بادشاہ ہوا تو اس نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا اور یہودیوں پر اس کی حکومت کا سکہ جم گیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں

اس کی اطاعت سے سرکشی کی تو اس نے لشکرِ جرار بھیج کر ان کو بری طرح ذلیل کیا اُن کے خزانے لوٹ لئے مسجدِ اقصیٰ کو خراب کیا اور ان کے قریباً دس ہزار سربرآوردہ افراد کو اسیر کر لیا اور اُن پر اُن ہی میں سے ایک شخص صدقیا کو بادشاہ مقرر کیا جس سے اپنی اطاعت کا عہد لے لیا لیکن دس سال کے عرصہ میں فرعونِ مصر سے سازباز کر کے اس نے پھر بخت نصر کی ماتحتی سے بغاوت کا اعلان کیا جس کے نتیجہ میں اُس نے دوبارہ اُن پر فوج کشی کی اور تقریباً ڈیڑھ سال تک ان کا محاصرہ جاری رکھا اور آخر کار فتح کر لیا۔ اور اس دفعہ اُس نے اُن کو پوری طرح تباہ و برباد کر ڈالا۔ بروایت چھ لاکھ کی فوجِ سیاہ کے ساتھ یہ حملہ آور ہوا تھا (سفینہ) اس واقعہ میں بخت نصر نے یہودیوں کی تمام عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں کو ختم کر ڈالا تھا اور اس کے پچاس سال بعد تک یہودیوں کے پاس نہ کوئی کتاب تھی نہ کوئی دوسری مذہبی نشانی باقی رہی تھی۔ آخر حکومت نے پلٹا کھایا۔ بنی اسرائیل بابل کے قید خانہ سے آزاد ہوئے ان میں سے ایک شخص عزرا جو بادشاہِ وقت کا مقرب ہو گیا تھا اس کو بنی اسرائیل کا امیر مقرر کیا گیا۔ اور اس کو تورات کے لکھنے اور عبادت گاہوں کی از سرِ نو تعمیر کی اجازت دی گئی پس یہ لوگ واپس بیت المقدس کی طرف پلٹے اور عزرا نے پرانی کتابوں کی تلاش کر کے تورات کو از سرِ نو لکھا اور یہودیوں کی پاس اب تک وہی تورات موجود ہے یہ واقعہ صاف بتلاتا ہے کہ تورات موجودہ کی سند حضرت موسیٰ سے متصل نہیں ہے اور نیز کتابِ تورات کا جامع عزرا نامی شخص بھی ایک غیر معلوم آدمی ہے لہذا نسخہ تورات کی پوزیشن کافی مخدوش ہے اور اس کے بعد اس پر تحریف در تحریف کا استبدادی دَور تو اس کو اپنی اصلی صورت سے کہیں کا کہیں دُور لے گیا۔ تاہم قرآن مجید کے اقتباسات سے اس قدر پتہ ضرور چلتا ہے کہ دورِ نبوت کی موجودہ تورات میں بعض احکام اپنی اصل پر باقی بھی تھے جن کی طرف رجوع کرنے کا بعض اوقات ان کو حکم دیا جاتا تھا۔

(ملخص از میزان)

نصرانیّت اور انجیل

موجودہ چار انجیلیں جو اس وقت قوم نصاریٰ کے پاس ہیں اور انہی پر ان کی تبلیغ کا انحصار ہے۔ پہلی انجیل متی کی ہے جو ۳۹ء میں یا بقولے ۶۰ء و ۵۰ء کے درمیان لکھی گئی کہتے ہیں کہ اس کی اصل عبرانی زبان میں تھی جس کا ترجمہ یونانی و دیگر زبانوں میں کیا گیا۔ نسخہ اصل کا کسی کو پتہ نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ ترجمہ کس نے کیا تھا؟

دوسری انجیل مرقس کی ہے یہ خود حواریین میں سے نہ تھا بلکہ یہ پطرس کا شاگرد تھا اور اسی کے حکم سے اُس نے ۶۱ء میں یہ کتاب لکھی۔ تیسری انجیل لوقا کی ہے نہ یہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰؑ کا صحابی تھا بلکہ دینِ عیسائی اُس نے پولس سے سیکھا تھا۔ پولس پہلے ایک متعصب قسم کا یہودی تھا۔ کہتے ہیں یہ مرضِ صرع میں مبتلا ہوا تو عالمِ بے ہوشی میں حضرت مسیح نے اس کو عیسائیت کی مخالفت پر ملامت کی پس وہ مسیح پر ایمان لایا اور پھر تبلیغ پر بھی مسیح کی طرف سے مامور ہوا اور موجودہ عیسائیت کا پرچار اسی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ نجاتِ اُخروی میں صرف عیسےٰ پر ایمان لانا کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ مردار اور سور وغیرہ اسی نے حلال کئے اور ختنہ سے اسی نے روکا۔ پس لوقا نصرانیت میں اسی پولس کا شاگرد تھا۔ اور

اس نے انجیل مرقس کی انجیل کے بعد لکھی جبکہ بطرس اور پولس مر چکے تھے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اور یہ یوحنا حضرت عیسیٰ کا محبوب ترین حواری زبدی صیاد کا بیٹا تھا کہتے ہیں کہ ایشیا و دیگر اطراف کے تمام پادری ۹۶ء میں یوحنا کے پاس جمع ہوئے اور اس سے ایک نئی انجیل کے لکھنے کی انہوں نے خواہش کی اور کہا کہ اس نئی انجیل میں ایسی چیزوں کا اضافہ ضروری ہے جس سے پہلی انجیلیں خالی ہیں چنانچہ اس نے ان کے امتثال امر میں ایک نئی انجیل کی تصنیف کی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ یوحنا کی تصنیف نہیں بلکہ یہ مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب العلم نے لکھی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اور اسکو مقبول عام کرنے کیلئے اسے یوحنا کی طرف منسوب کیا گیا تھا

بہرکیف یہ چار انجیلوں کی تصنیفی حقیقت ہے ان کا مرجع، متی، مرقس، لوقا، یوحنا، بطرس اور لوبس ہیں اور ان سب سے قدیم ترجس کو ان سب کا مرجع قرار دیا جا سکتا ہے وہ انجیل متی کی ہے لیکن وہ بھی ایک ترجمہ ہے جس کی اصل مفقود ہے پس یہ بنیاد ہے شرق و غرب میں پھیلے ہوئے مذہب عیسائیت کی نیز یہ تو اصلی چار انجیلوں کی حقیقت ہے لیکن نہ معلوم تحریف کے زبردست ہاتھوں نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اور بایں ہمہ قرآن صرف ایک انجیل کے متعلق تصدیق کرتا ہے اور اس قدر قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں موجودہ انجیل بعض بعض جگہ احکام حقہ پر بھی مشتمل ہے جیسا کہ ان کو تصدیق رسالت کے لئے اپنی کتاب کی طرف رجوع کرنے کے حکم سے ظاہر ہوتا ہے (ملخص از میزان)

میثاق انبیاء

مجمع البیان میں منقول ہے حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک تمام نبیوں سے عہد لیا گیا کہ جب جناب محمد مصطفےٰ مبعوث ہوں گے تو اگر تم زندہ ہو تو اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا اور یہی عہد تمام نبیوں نے اپنی امتوں سے بھی لیا تھا اور تفسیر صافی میں قمی و عیاشی سے منقول ہے کہ حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ تمام انبیاء ایک دفعہ پھر رجعت کریں گے اور امیر المومنینؑ کی نصرت میں داخل ہوں گے۔

لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ سے مراد یہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ پر ایمان لائیں گے اور لَتَنْصُرُنَّهٗ سے مراد ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کی نصرت کریں گے اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی ایک طویل روایت منقول ہے جس کا ماحصل یہی ہے۔

نیز آیت کا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ تمام نبیوں سے عہد لیا گیا تھا کہ جو کچھ تمہیں کتاب و حکمت دی جائے پھر تمہارے پاس کوئی نبی تمہارے پاس والی چیز کی تصدیق کرنے والا ہو کر آئے تو اس کی نصرت کرنا اور اس پر ایمان لانا گویا تمام انبیاء سے باہمی ایمان و نصرت کا عہد و پیمان لیا گیا تھا اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ تمام انبیاء کی امتوں سے اپنے اپنے نبی پر ایمان لانے اور نصرت کرنے کا عہد لیا گیا یعنی نبیین کا مضاف امم لفظ محذوف ہے اور معنوی طور پر مراد ہے۔

آیت کا تحت اللفظ جو ترجمہ موجود ہے وہ اس بنا پر ہے کہ مَا کو شرطیہ بمعنی مہما قرار دیا گیا ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ کو اس

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَ

اور جب لیا خدا نے عہد نبیوں سے کہ البتہ جب دوں تم کو کتاب وحکمت سے کچھ پھر آئے تمہارے

كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ

پاس رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس کی جو تمہارے پاس ہو ضرور ایمان لانا اس پر اور اس کی مدد کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا

وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ

اور قبول کیا۔ اس بات پر میرا عہد؟ سب نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا۔ گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨١﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٨٢﴾

گواہوں سے ہوں پھر جو پھرے گا اس کے بعد۔ پس وہ فاسق ہوں گے

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا

کیا دین خدا کے سوا کچھ اور چاہتے ہیں حالانکہ اس کی اطاعت قبول کرلی ہر آسمان و زمین کی چیز نے خوشی سے اور ناخوشی سے

کی جزا قرار دیا گیا ہے ورنہ اگر مَا کو موصولہ مانا جائے اور لَتُؤْمِنُنَّ کو جواب قسم بنایا جائے تو یہی دوسرا معنی صحیح ہوگا لیکن ترکیب اوّل اور معنی تحت اللفظی زیادہ مناسب ہے اور اس باب کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ۔ کہتے ہیں جب یہود و نصاریٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کیا اور جناب رسالتمآبؐ نے فیصلہ فرمایا کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ وہ نصرانی تھے تو دونوں گروہ ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں آپ کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے تب یہ آیت اُتری۔

آیت مجیدہ کی تاویل حضرت قائم آل محمد علیہ السلام کے زمانہ سے کی گئی ہے کہ اس وقت زمین خدا پوری طرح اسلام والوں سے آباد ہوگی اور کفر کا نام ونشان تک نہ ہوگا۔

چنانچہ تفسیر صافی میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے اور عیاشی سے اسی مطلب کی روایت بھی نقل کی گئی ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ: تفسیر درمنثور سے منقول ہے کہ بروز محشر سب اعمال پیش ہوں گے تو اسلام بھی پیش ہوگا پس خدا اسی کو فرمائے گا کہ میرا مواخذہ اور جزا صرف تجھ ہی سے وابستہ ہے یعنی پہلے اسلام دیکھا جائے گا اور پھر اعمال کی باری آئے گی۔ اگر اسلام سے دشمنی ہوگی تو باقی اعمال کی تو کوئی قیمت ہی نہ ہوگی اور آیت مجیدہ کا بھی یہی مطلب ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ۔ اس کے معنی کی کئی وجوہ ہیں (۱) کس طرح خدا ایسے لوگوں سے ہدایت یافتہ لوگوں کا سا سلوک کرے

وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ

اور اسی کی طرف بازگشت ہے فرما دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر اتری اور جو کچھ اتری

عَلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ

ابراہیمؑ پر اسماعیل اسحق یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو کچھ عطا ہوئی

مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَالنَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ

موسےٰ و عیسےٰؑ اور تمام نبیوں کو اپنے پروردگار سے (سب پر ہم ایمان لائے) اور کوئی فرق نہیں کرتے درمیان کسی کے

وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ

ان میں سے (ایمان میں) اور ہم اسی کے اطاعت گزار ہیں اور جو شخص چاہے اسلام کے سوا کوئی اور دین تو ہرگز وہ اس سے

وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾ كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ

قبول نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا کیسے ہدایت کرے اللہ اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا بعد ایمان لانے

اِيۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى

کے اور انہیں معلوم ہے کہ رسول برحق ہے اور آچکیں اُن کے پاس واضح دلیلیں اور اللہ نہیں ہدایت فرماتا

جو اسلام کے بعد کفر پر چلے گا (۲) یہ اس طرح ہے جیسے کہا جائے کہ میں تجھے کونسا راستہ بتاؤں حالانکہ راستہ تو وہی تھا جس کو تو چھوڑ چکا ہے (۳) ایسے لوگوں کو خدا کیسے جنت کے راستہ پر گامزن کرے گا جنہوں نے اسلام کے بعد پھر کفر کا ارتکاب کیا (مجمع) اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا :- کہتے ہیں یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے گذشتہ نبیوں پر ایمان لانے کے بعد حضرت عیسےٰؑ کی نبوت و کتاب کا انکار کیا اور کافر ہو گئے اور پھر جناب رسالتمآبؐ کی نبوت کا کفر کر کے زیادتیٔ کفر کے مرتکب ہوئے ان کی توبہ قابل قبول نہ ہوگی بشرطیکہ وہ موت کے ڈر سے توبہ کر رہے ہوں ورنہ اگر اپنی زندگی میں بصحت حواس اپنے سابقہ کرتوتوں سے پشیمان ہو کر اپنے دل میں ایمان کو جگہ دیں اور اللہ سے معافی طلب کرلیں تو یقیناً ان کی توبہ مقبول ہو گی جس طرح کہ گذشتہ آیت کا مضمون اس امر کا شاہد موجود ہے۔ اور اگلی آیت بھی صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ دائمی عذاب صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو بحالتِ کفر مر جائیں لہذا قبل از آثارِ مرگ توبہ کرنیوالا یقیناً ناجی ہوگا اور آیت کا نزول اگرچہ معین اشخاص سے مختص ہو لیکن تاویل کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری ہے تو جس طرح گذشتہ انبیاء پر ایمان رکھنے والے اگر موجودہ وقت کے نبی کا کفر کریں تو اس کے

الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ

قوم ظالمین کو ایسے لوگوں کی جزا یہ ہے کہ تحقیق ان پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں اور

النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ

تمام لوگوں کی (لعنت) ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے کہ نہ تخفیف ہوگی اُن سے عذاب کی اور نہ وہ مہلت دیئے

یُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

جائیں گے مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اس کے بعد اور اپنی اصلاح کرلیں تو تحقیق اللہ غفور

رَّحِیْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ

رحیم ہے تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوگئے بعد ایمان لانے کے پھر زیادہ ہوئے کفر میں ہرگز نہ قبول ہوگی ان کی توبہ

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ

اور وہی ہیں پکے گمراہ تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوئے اور مرگئے حالت کفر میں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی

مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۹۱﴾

سے زمین کی پُری کے برابر سونا اگرچہ وہ اس کا فدیہ دے دے ایسے لوگوں کے لئے عذاب دردناک ہے اور نہ ہوگا ان کا کوئی مددگار

مصداق میں داخل ہیں اسی طرح نبی پر ایمان لانے کے بعد اگر اس کے برحق وصی کی پیروی سے منہ موڑیں تو وہ بھی یقیناً اسی آیت کے مصداق میں داخل ہوں گے کیونکہ آیاتِ قرآنیہ کے مضامین صرف ایک زمانہ تک کے لئے محدود نہیں ہیں۔

پس جس طرح قرآن قیامت تک زندہ ہے اس کی ہر ہر آیت قیامت تک زندہ ہے اور اس کے مصداق بھی قیامت تک کے لئے موجود ہونے چاہئیں۔ پس اس زمانہ میں حضرت حجّت والی العصر عجّ علیہ السلام کے منکرین بھی اس آیت کے مصداق ہیں۔ از راہِ تاویل جس طرح کہ وہ لوگ از راہِ تنزیل اس کے مصداق تھے۔

یہ جلد یہاں ختم ہوئی اور چوتھی جلد چوتھے پارہ سے شروع ہوگی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵ محرم ۱۳۸۲ھ مطابق ۹ جون ۱۹۶۲ء بروز منگل

دوسرا ایڈیشن ماہ اپریل ۱۹۶۷ء

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ ساغر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ وفا زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم